بکھری یادیں
جمال النساء

بکھری یادیں

بکھری یادیں

(یادداشت)

جمال النساء

ادارہ فکروفن 16-2-268/2، جدید ملک پیٹ، حیدرآباد-36

نام کتاب : بکھری یادیں
تصنیف : جمال النساء
سنہ اشاعت : ۲۰۰۸
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۲۰۰ روپے (Rs.200)
کمپیوٹر کتابت : الاکرم گرافکس، سعید آباد، حیدرآباد
طباعت : عائشہ آفسیٹ پرنٹرس
روبرو فائر اسٹیشن، متصل مسجد رضیہ، جدید ملک پیٹ، حیدرآباد۔۳۶
فون 9391110835, 9346338145

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جزوی اعانت سے شائع ہوئی ہے

ملنے کا پتہ

- ☆ بمکان مصنفہ، رتناولا اپارٹمنٹس 10-5-21/3 مانصاحب ٹینک، حیدرآباد
- ☆ ادارہ شعر و حکمت، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد،
- ☆ سب رس کتاب گھر ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد
- ☆ ادارہ فکر و فن 16-2-268/2، جدید ملک پیٹ، حیدرآباد۔36

انتساب

لختِ جگر

جاوید اقبال مرحوم

کے نام

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم

کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

اس تحریر کے بارے میں

ایک دور ایسا آیا کہ راتوں کی نیند غائب۔ پرانی یادوں اور باتوں کی جیسے ایک فلم ہر وقت نظروں کے سامنے۔ خالی بیٹھے بیٹھے سوچا، ان یادوں کو قلمبند کردوں تو شائد۔ کچھ وقت ہی کٹے اور دماغ کو سکون ملے۔ یوں اختر کے جانے تک کی ساری یادیں نہ جانے کیسے لکھ ڈالیں۔! بد مسودہ پڑا ہوا تھا۔ جاوید بھی چلا گیا۔ میں بہت بیمار ہوگئی۔ خیال تھا کہ اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ مگر، سخت جان جو ٹھہری ذکیہ، ایمن، کی تیمارداری اور ڈاکٹر سرور خاں کے علاج سے پھر۔ ٹھیک!

بیماری کے دوران خیال آیا۔ جائیداد جھگڑے کی چیز۔ ہو سکے تو بیچ کر بچوں کو ان کا حصہ دے ہی دیا جائے۔ ایمن نے یہ کام بھی کردیا۔ گھر بیچ کر دونوں بیٹوں اور بیٹی کے نام برابر برابر گھروں کی شکل میں تقسیم کردیا۔

اب میں ساٹھ ستر برس ایک بڑے گھر میں رہنے کے بعد ایک فلیٹ میں رہ رہی ہوں۔

جاوید کی بیوی کو بھی وظیفہ مل رہا ہے اور وہ بھی دوسرے بیٹے کے فلیٹ میں۔ ایمن اور ذکیہ کا اصرار کہ اختر کے بعد سے اب تک کے حالات بھی لکھوں۔ آخر کیا؟ بس یہی کہ جانے والوں کے نام؟

وہ بھی جیسے تیسے لکھ ڈالے۔ اب اسے چھپوانے کی سوچ رہے ہیں۔ اگر یہ "یادداشت" چھپ گئی اور اتفاقاً کسی نے پڑھنے کے بعد تضیع اوقات پر افسوس کرتے ہوئے مجھے اپنے وقت کی بربادی کا ذمہ دار گردانا۔ تو۔ یہ۔ انہی دونوں مندرجہ بالا افراد کی ذمہ دار۔

اور کیا لکھوں؟ دل شکستہ۔ مگر۔!

جمال

بکھری یادیں

بکھری یادیں، کچھ سنی سنائی، کچھ آنکھوں دیکھی، والد صاحب اکثر حسرت کے حوالے سے کہا کرتے تھے

ہے تعلق ہم کو آخر خاک نیشاپور سے،

میرے چھوٹے چچا سید اکرام الحسن کا کہنا تھا کہ ایران میں حکومت کی افراتفری کے زمانے میں جب نیشاپور بھی زد میں آیا اور جان بچا کر لوگ وہاں سے بھاگنے لگے تو اُن ہی میں کوئی ایک بڑے عالم بزرگ سید محمود بھی تھے۔ جو اپنی بیوی اور لڑکے منتخب کے ہمراہ ہندوستان پہنچے اور یہاں لکھنؤ سے قریب اناؤ ضلع کے ایک قصبہ موہان میں سکونت اختیار کی۔ درس وتدریس اور کھیتی باڑی کو ذریعہ معاش بنایا اور پھر یہیں موہان کے کسی گھرانے کی ایک لڑکی سے دوسری شادی بھی کی۔ آگے چل کر اسی خاندان کے ایک شاہ وجیہ نامی بزرگ بہت مشہور ہوئے جن کا تعلق راست سید محمود نیشا پوری کے خاندان سے تھا۔

میں ان کا ذکر سنتی تھی اور کچھ عرصہ قبل تک ہر سال موہان میں بڑی دھوم دھام سے ان کا عرس منایا جاتا تھا۔ جس میں بلا تفریق مذہب وملت سینکڑوں لوگ شریک ہوتے تھے۔ میرے دادا سید سلطان حسن، عمادالحسن کے فرزند تھے۔

دادا سلطان حسن کی عمر غدر کے وقت ڈیڑھ برس کی تھی۔ اور اس ہنگامے میں ان کی دایہ انھیں لے کر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ گڑبڑ ختم ہونے پر اس نے بہ حفاظت بچہ کو اس کے ماں باپ تک پہنچا دیا۔

دادا میاں کے بڑے بھائی کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے کا نام رؤف الحسن تھا جن سے سنا ہے، میرے والد کی بڑی بہن بیاہی گی تھیں۔ مگر ان دونوں کا جوانی میں انتقال ہوگیا اور ہم نے ان کو کبھی دیکھا نہیں۔ البتہ رؤف الحسن کے دوسرے تین بھائی اور دو بہنیں سب دکن آ گئے تھے۔

دادی اماں کی چھوٹی بہن کے دو لڑکوں، علیم الحسن اور سلیم الحسن کا ہمارا بہت ساتھ رہا خاص طور پر سلیم الحسن کا جن سے میری پھوپی کی لڑکی سعیدہ بیگم بیاہی گئی تھیں۔ جن کو میں آپا، کہتی تھی۔ اب تو موہان میں ہمارے کنبہ کا شاید کوئی بھی فرد نہیں رہا ، نہ وہاں سے ہمارا کوئی رابطہ باقی ہے۔ لیکن ایک زمانہ میں کہتے ہیں وہ بڑی آباد بستی تھی۔ مولوی گھرانہ، بارہ دری، امام باڑہ، سنا ہے یہاں کے لوگ موہان کو 'خِطۂ یونان' کہتے تھے۔ یہاں بڑے بڑے عالم فاضل لوگ اُبھرے۔ خاص طور سے علم طب میں، ان میں سے بہتوں نے شہرت پائی اور تاریخ میں اپنا نام ثبت کر گیے۔

اپنی ایک کتاب میں 'شرر' نے لکھنؤ کے ایک حکیم کا ذکر کیا ہے یہ دراصل موہان ہی کے تھے۔ میرے والد کہتے تھے یہاں حیدرآباد میں محبوب علی پاشاہ نے انھیں حیدرآباد بلوایا تھا وہ آئے بھی مگر نہ جانے کیوں واپس چلے گئے۔ بعد میں البتہ ان کے لڑکے وقار الحسن نوکری کی تلاش میں حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ وہ اکثر میرے والد سے ملنے آجایا کرتے تھے اور میری دادی کے بڑے بھائی محمد ادریس بھی سنا بہت اچھے طبیب تھے اور بھوپال سرکار میں ملازم تھے۔ اپنے دونوں لڑکوں محمد شعیب اور محمد نعیم کو بھی انھوں نے علم طب ہی کی تعلیم دی تھی۔ محمد شعیب کی میری پھوپی حمیدہ بیگم سے شادی ہوئی اور اس کے بعد وہ حیدرآباد میں رہنے لگے۔ سرکاری نوکری کرتے رہے۔ طب کا پیشہ نہیں اپنایا البتہ دوسرے بھائی محمد نعیم نے طب کا ہی پیشہ اپنایا اور موہان ہی میں رہے۔ میرے دادا کے چھوٹے بھائی بھی حکمت کرتے تھے۔ کہتے ہیں ان کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی

اوران کا دستور یہ تھا کہ غریبوں کو جو نسخہ لکھ کر دیتے وہ چند پیسوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا مگر امیروں کا جو نسخہ لکھتے وہ بہت قیمتی ہوتا۔

وہ زندگی بھر موہان ہی میں رہے۔بس کبھی کبھار لکھنؤ چلے جایا کرتے تھے۔ان کے پاس دور دور سے مریض آتے تھے۔ میرے والد ان کو مرزا چچا کہتے تھے۔حسرت موہانی کے والد وہاں دو چھوٹے گاؤں کے مالک تھے جو حسرت کو ورثہ میں ملے اپنی بہنوں کو زندگی بھر پابندی سے ان کے حصہ کی رقم بھیجتے رہے۔ باہر سے آنے والے جو موہان میں آ بسے تھے اپنے کو اصل سادات میں سمجھتے تھے اور آپس ہی میں شادی بیاہ کا رواج تھا۔خاندان سے باہر شادی کو بہت برا سمجھا جاتا تھا اس طرح ایک ہی فرد سے کئی رشتے ہوتے۔ مثلاً ایک ہی شخصیت چچا بھی ہوتا، پھوپا بھی، چچی بھی اور دادی بھی، غالباً اس بنا پر ہی اکثر دونوں رشتوں کو ملا لیا جاتا تھا۔ جیسے میری پھوپی زاد بہن میرے منجھلے چچا کو، ماموں پھوپا اور ان کی بیوی کو پھوپی ممانی کہتی تھیں۔ اور یہ تو ہے کہ اس وقت خاندان میں بڑی یکجہتی تھی۔شیعہ سنی تفریق بہت کم تھی عرصہ تک آپس میں شادی بیاہ ہوتے رہے، الگ الگ گھرانے بن گئے تھے مگر ان میں رہنے والے سب بہر حال ایک ہی خاندان کے افراد تھے، میرے دادا کا تعلق، مولوی گھرانے سے تھا اور دادی کبریٰ بیگم کا امام باڑے سے۔ امام باڑے کے بھوت مشہور تھے۔مگر اپنی دادی میں مجھے کبھی بھوتوں کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ البتہ پھوپا جوان کے بڑے بھائی کے لڑکے تھے محمد شعیب اور دادی کی لڑکی حمیدہ بیگم جوان سے بیاہی گئی تھیں ان کے سر پر اکثر بھوت سوار رہتا تھا۔ خاص طور سے رمضان میں۔ دادی تو ہماری، بڑی نیک محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ بیحد منتظم اور ہمدرد، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک۔ بڑی بارُعب شخصیت تھی ان کی، مجھے وہ بہت پسند تھیں۔قرآن تو خیر بچپن میں ہی ہر ایک کو پڑھا دیا جاتا مگر اردو اور فارسی بھی زیادہ تر کی اچھی تھی۔ کہتے ہیں ہماری چچی اماں کی والدہ عربی فارسی کی ماہر تھیں اور خود چچی اماں بھی اردو فارسی جانتی تھیں۔

دادی اماں کی بڑی بہن جو 'باجی' مشہور تھیں۔ سنا وہ بھی بہت پڑھی لکھی تھیں۔ میری پھوپھی حمیدہ بیگم کو بھی خود ان کے والد نے فارسی اور اردو پڑھائی تھی۔ ان کا خط بھی بہت اچھا تھا۔ ایک بہت ضخیم فارسی کتاب، ''صولت فاروقی''، انھوں نے نقل کی تھی۔ کیا کسی خوش نویس کا خط اتنا روشن ہوگا، دست کاری سیکھنے کا تو انھیں ایسا شوق تھا کہ جہاں کہیں پتا چلتا کسی کو کوئی ہنر آتا ہے۔ فوراً وہ اس کے پاس پہنچ جاتیں اور اس سے ہنر سیکھتیں۔ نظام آباد مشن ہاسپٹل میں لیڈی ڈاکٹروں کو کروشیا نٹنگ کرتے دیکھا تو ان سے خواہش کی کہ ان کو بھی یہ ہنر سکھا دیں۔ بہت سی دست کاریاں اس طرح سیکھیں۔ موزے بننا، کارچوب، سینڈھی کے پتوں سے پنکھے، دسترخوان وغیرہ بنانا۔ جالی کے کمر بند بننا یہ سب کام انھیں آتے تھے۔ حتیٰ کہ شطرنجی بننے کے فن میں بھی انھوں نے مہارت حاصل کی۔ پتا چلا کہ کوئی بیوہ خاتون شطرنجیاں بن کر اپنا گزارا کرتی ہیں تو خود ان کے گھر جا کر ان سے یہ فن سیکھا۔ اور گھر میں لاکر بہت سی شطرنجیاں اور جانمازیں بنیں۔

بارہ تیرہ برس تک ہماران کا ساتھ رہا تھا تو میری والدہ نے بھی ان کے ساتھ کروشیا، نٹنگ کارچوب وغیرہ کے کام سیکھے اور بعد میں میں نے بھی ان سے اور کچھ امی سے یہ چیزیں سیکھیں۔ اپنی اکلوتی لڑکی سعیدہ بیگم کو بھی انھوں نے اردو فارسی کی اچھی تعلیم دی۔ میری پھوپھی زاد بہن کو بھی مطالعہ کا بہت شوق تھا وہ تو مضامین بھی لکھتیں تھیں جو 'س' کے نام سے تہذیب نسواں میں چھپے تھے خطوں میں برمحل شعر کے استعمال کا تو ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ دوسری بڑی بات یہ کہ میری دادی تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ چناں چہ جب ہمارے دادا نے تلاشِ روزگار میں حیدرآباد کا ارادہ کیا تو میری دادی نے اپنے بڑے لڑکے اکبر حسن کو جو اس وقت صرف نو سال کے تھے باپ کے ساتھ بھجوا دیا تھا تاکہ شہر میں ان کی اچھی تعلیم ہو سکے۔

ایسا لگتا ہے جب موہان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وہاں روزگار کے

مواقع کم ہوتے گئے تو اہلِ علم وفضل نے موہان کی محدود فضا سے نکل کر دوسری جگہوں کا رُخ کیا۔ ریاست حیدرآباد میں ان دنوں پڑھے لکھے قابل لوگوں کی بہت مانگ تھی اس لیے زیادہ تر یہاں آ گئے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ ترکِ وطن کرنے والوں میں بلگرامی خاندان کے علاوہ سب سے زیادہ تعداد حیدرآباد میں اتر پردیش، موہان سے آنے والوں کی تھی۔ اور چوں کہ ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی ان کے لیے یہاں اچھے مواقع تھے۔

ہمارے خاندان کے سب سے پہلے ادھر آنے والوں میں میرے دادا سید سلطان حسن بھی تھے۔ انھوں نے یہاں آ کر، قانون کا ایک امتحان ہوتا تھا۔ (جس میں اول آنے والے وکالت سے لے کر کسی بھی بڑے عہدے کے قابل سمجھے جاتے تھے)۔ وہ پاس کیا، درجہ اول میں، اور وکالت شروع کی اور پھر جلد ہی اپنے بیوی بچوں کو بھی یہیں بلا لیا۔ بڑا لڑکا تو پہلے ہی سے یہاں ان کے ساتھ تھا مگر ان کی وکالت کچھ اچھی نہیں رہی تھی ان کو زیادہ بہتر کام کی تلاش ہوئی۔ نظام اسٹیٹ اس وقت مختلف چھوٹی بڑی جاگیروں، ریاستوں اور رجواڑوں وغیرہ میں بٹا ہوا تھا۔ جس جاگیر کا مالک مسلمان ہوتا وہ نواب، کہلاتا تھا اور جس کا مالک ہندو ہوتا وہ راجا۔ چار پانچ لاکھ آمدنی والی جاگیریں کم تھیں مگر سالانہ لاکھ دو لاکھ، آمدنی والی تو بہت تھیں۔ اس کے علاوہ تین پائیگاہیں تھیں جن کی آمدنی لاکھوں کی تھیں۔ سب سے زیادہ آمدنی والا اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر کا تھا، نظام کے تحت کا علاقہ ''صرف خاص'' کہلاتا تھا۔ بڑی آمدنی والی جاگیروں میں ناظم، تحصیل دار، اور تعلق دار کے عہدے بہت اہم تھے اور اس طرح محکمہ پولیس میں، ''امین اور صدر امین'' ان عہدہ داروں کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ ریاست میں تین زبانیں عام تھیں، تلگو مراٹھی اور اردو۔ تلگو بولنے والوں کا نمبر پہلا تھا، مراٹھی بولنے والوں کا دوسرا اور تیسرا اردو بولنے والوں کا۔ کنڑ بھی کچھ علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ مگر خیر تو کہنا یہ چاہتی تھی کہ ایسی ہی ایک جاگیر کسی مسلم نواب کی تھی جس کا صدر مقام کلیانی تھا (اب وہ

کرناٹک میں ہے) کہتے ہیں میرے دادا سید سلطان حسن کو کلیانی اسٹیٹ میں ناظم کی حیثیت سے جگہ مل گئی جو وہاں کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔ یہ مقام حیدرآباد سے کوئی 100 میل دور تھا اور وہاں کے نواب صاحب سنا بہت نیک اور بااخلاق تھے۔ میرے والد صاحب کو کھیتی باڑی کا بہت شوق تھا۔ جب وہ اپنے والدین کے ساتھ کلیانی آئے اور ایک دعوت میں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنے ناظم کے نوجوان فرزند کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور ان کا کاشت کاری کا شوق جان کر کئی ایکڑ تری کی زمین بلا معاوضہ دوامی پٹہ پر دے دی۔ نواب جو ٹھہرے کہ:

"گاہے بہ سلامی برنجند گاہی بہ دشنامی خلوت می دہند"

والد صاحب کو اپنا شوق پورا کرنے کو مل گیا کہتے تھے کہ ایک سال کے اندر ہی مجھے زمین سے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ گھر کا پورا خرچ اسی سے چلتا تھا۔ کُل نو، دس آدمیوں کا کنبہ، نوکر چاکر الگ، پھر بھی بڑی فراغت تھی، اناج، سبزی، ترکاری، انڈے، دودھ دہی وافر مقدار میں سب اپنے گھر کا، سوائے گوشت وغیرہ دو ایک اور چیزوں کے بازار سے کچھ نہ آتا۔

کم و بیش اسی زمانے میں میرے دادا کے بڑی سالی کے شوہر بھی یہاں آچکے تھے اور بیدر میں مہتمم پولیس کے عہدے پر فائز تھے۔ ابی ان کے بہت سے لطیفے سنایا کرتے۔ مثلاً یہ ایک دن ڈیوٹی سے گھر آئے۔ اندر داخل ہونے والے تھے کہ فوراً پلٹ کر مردانے میں بیٹھ گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بیوی نے اپنے چھوٹے لڑکے کی ضد پر اسے ڈانٹا کہ "نکل یہاں سے دور ہو"۔ انھوں نے سمجھا کہ ان کو دور ہونے کو کہا جا رہا ہے، لہٰذا دروازے میں سے واپس ہو گئے، ایسے ہی کئی اور قصے مشہور تھے۔

دوسرے آنے والوں میں دادی ماں کے قریبی رشتے کے تین بھائی۔ ان میں سے بڑے بادشاہ حسن صاحب ہائی کورٹ کے جج بنے۔ منجھلے تھے خواجہ حسن صاحب بہت مشہور وکیل، تیسرے شریف الحسن صاحب مجسٹریٹ ہوئے۔ یہ دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ بڑے

بھائی کے اکلوتے ایک لڑکے امین الحسن اور ایک لڑکی تھی۔ ابیؔ بتاتے ہیں کہ بادشاہ حسن صاحب اور ان کی بیوی دونوں بے حد کنجوس تھے۔ ان کے لڑکے امین الحسن سے ابی کی بہت دوستی تھی۔ یہ شاعری کرتے تھے اور بسمل تخلص رکھا تھا۔ بہ قول ابی ان کے صرف دو گہرے دوست تھے، ایک فضل الحسن ''مسرت'' جو ابیؔ سے ایک سال چھوٹے تھے، دوسرے امین الحسن۔ وہ جب بھی کلیانی سے شہر آتے اپنے انھیں دوست کے ہاں ٹھہرتے، واپسی کا ارادہ کرتے تو امین الحسن صاحب انھیں روکتے۔ تب ان کی والدہ فرماتیں، ''اے بیٹا جانے بھی دو وہاں ان کی ماں ہڑک رہی ہوگی''۔ ان کے برخلاف خواجہ حسن صاحب بے حد خراج۔ گھر سے باہر جاتے تو سڑک کے دونوں طرف خیرات بانٹتے جاتے۔ یہ تو معمولی بات تھی۔ ان کے انتقال پر معلوم ہوا کہ کتنی ہی بیوائیں، یتیم و یسیر اور ضعیفوں کے وظیفے مقرر تھے جن کا کسی کو علم نہ تھا۔ ان کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ لاکھوں کمانے کے بعد یہ بہت مقروض تھے۔ ایک گھر تھا اسے بیچ کر قرض چکایا گیا۔ ان کی پہلی بیوی گزر چکی تھیں ان سے دو لڑکیاں تھیں، دوسری سے ایک لڑکا ہوا۔ فروری 1908ء میں جب ندی آئی تھی ابیؔ یہیں آئے ہوئے تھے۔ وہ اس قیامت کی رات کا آنکھوں دیکھا حال سناتے اس وقت تک امین الحسن صاحب کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں بیٹا ساتھ رہتے تھے۔ ندی کا پانی چڑھ رہا تھا، بیٹا ماں کو چھوڑ کر گھر سے نکلنے کو تیار نہیں اور ماں اپنا صندوق چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔ ابیؔ نے بتایا کہ آخر میں نے کہا ''چچا دیکھیے لوگ کیسے بھاگے جا رہے ہیں''۔ یوں انھیں تماشہ دکھانے کے بہانے دروازے پر لائے اور پھر پانی میں ڈھکیل دیا جو کمر کے قریب تک ہو چلا تھا۔ یوں ہم تینوں قریب ہی ایک بنیے کے سہ منزلہ گھر پر پناہ گزین ہوئے جہاں قریب کے کبھی عزیز موجود تھے۔

ابیؔ کے دوسرے دوست حسرت موہانی تھے۔

کہتے ہیں کہ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا۔ وہ جب بھی حیدرآباد آتے اپنے دوست اکبر

حسن سے ضرور ملتے۔ ابی آپنے دوسرے دونوں بھائیوں سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ یہاں وکالت کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا تھا۔ اردو فارسی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ شعروشاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ کچھ لکھنے کا بھی شوق تھا۔ چناں چہ ایک ناول لکھی بھی تھی۔ بہت روشن خیال، والدین کے چہیتے تھے۔ سب ان کی بات مانتے۔ ان میں کچھ ایسی بات تھی کہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسرے اور لوگ بھی ان کی بات مانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ ہر کسی سے میل جول رکھتے۔ میرے دادا اور دادی کی طرح وہ بھی بے حد بردبار، نیک سیرت اور سادہ مزاج تھے۔ میں نے ان کو کبھی غصہ کرتے یا جھنجلاتے نہیں دیکھا۔ ہر ایک سے بڑی اپنایت سے بات کرتے۔ لوگوں کے برا بھلا کہنے کی وہ بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ کوئی شکایت کرتا تو ہنس کر ٹال جاتے۔ جس بات کو ٹھیک اور درست سمجھتے، کسی کے کہنے سننے کی بنا پر اس سے کبھی نہ ہٹتے۔ ایک بار جو وعدہ کر لیتے اس پر قائم رہتے۔ بے حد نفاست پسند اور ذرا حسن پرست بھی۔ میں نے ان کو ہمیشہ نفیس ململ کا کرتا اور اچھے بر ک کے ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ پہنے دیکھا۔ باہر جاتے تو عمدہ کپڑے کی شیروانی، ترکی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی اور پیر میں پمپ شوز۔ دادا میاں حقہ پیتے تھے مگر ان کے کسی لڑکے میں پان، سگریٹ یا حقہ کی لت نہ تھی۔ چائے کی عادت البتہ نہ جانے کیسے پڑ گئی تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں صبح وشام کی چائے پیتے دیکھا۔ بے حد نفیس، خوشبودار اور گرم۔ ان دو قریبی دوستوں کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست و احباب تھے۔ چھوٹوں سے برابری سے ملتے۔ زمانہ ساز بالکل نہ تھے۔ بہت اصول پرست وایمان دار۔ ''شاید اسی لیے ملازمت کے دوران نقصان اٹھاتے رہے۔'' کسی کی بے جا تابع داری نہیں کر سکتے تھے کم گو تھے مگر باتیں دل چسپ اور پُر مزاح کرتے، لطیفے بہت سناتے۔ ان کے کچھ لطیفے ہم کو یاد بھی آتے ہیں۔ ایک واقعہ جو تقریباً لطیفہ سا لگتا ہے۔ بتایا جاتا ہے۔ ان کے کچھ رشتے کے بھائی ایک مکان کے اوپری حصہ میں رہتے تھے' اُن کے سامنے ہی نظام سابع کے استاد داغ دہلوی صاحب

کا گھر تھا، جس کا دیوان خانے کا منظر اُن لوگوں کے گھر کے چھجے سے صاف نظر آتا تھا۔ اُن ہی دنوں وہ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ آ کر ٹھہرے ہوئے تھے۔ داغ صاحب کے یہاں روزانہ رقص وسرور کی محفلیں جمتیں۔ ایک رات ہم سب چھجے پر بیٹھے اس محفل کا نظارہ کر رہے تھے، گانے والی بہت خوب صورتی سے ایک مصرعے کو مختلف انداز سے دہرا دہرا کر رقص کر رہی تھی۔ مصرعہ یہ تھا "پنہا بھرن میں نہ جھیون"۔ ایک بھائی صاحب سو رہے تھے۔ میں نے جا کر اٹھایا کہ بہت اچھا گانا ہو رہا ہے آ کر سنیے۔ تھوڑی دیر وہ آ کر بیٹھے پھر گانے والی کو گالی دے کر کہا "حرام زادی نخرے کر رہی ہے، دس روپے مہینہ دے کر ایک بھوئی رکھ لیں تو دسیوں گھڑے پانی لا دے گا"۔ داغ سے ان کا ملنا جلنا بھی تھا اور وہ ان کی باتیں بھی سنایا کرتے تھے۔

ان کی شادی کافی بڑی عمر میں ہوئی۔ اس بارے میں بھی ایک قصہ۔ ان کی بڑی خالہ کے ہاں لڑکی ہوئی تو میری دادی نے اپنے لڑکے اکبر حسن سے ٹھیکرے کی منگنی کر دی۔ وقت گزرتا گیا یہاں میں نے کہیں خواجہ حسن صاحب کا ذکر کیا ہے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ انھوں نے ان ٹھیکرے کی منگیتر صاحبہ سے شادی کا پیام دیا جو منظور کر لیا گیا۔ سنا کہ اس کے بعد ہی یہ لڑکی ایسی بیمار پڑی کہ پھر ختم ہی ہو گئی۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد دادی اماں موہان گئیں تو بڑی بہن نے جو وہیں رہتی تھیں کہا کہ "بڑی تو رہی نہیں منجھلی کی شادی ہو چکی ہے"۔ چھوٹی سے اکبر حسن کی شادی کر دو۔ انھوں نے یہ بات منظور کر لی لیکن جب ابی کو اس بات کا علم ہوا تو صاف انکار کر دیا۔ بہت کہا گیا کہ ہم زبان دے چکے ہیں پر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اب کیا کریں؟ سوچا چھوٹے سے کر دیں۔ یہ صاحب زادے اس وقت صرف سولہ سال کے تھے۔ والدین نے خیال کیا کہ ان سے پہلے پوچھ لیا جائے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو جواب دیا کہ ہماری ایسی قسمت کہاں۔ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ بیوی ان کی ہم عمر تھیں۔ ان خوش قسمت صاحب نے ساس سسر کی زندگی تک کبھی بھی بیوی کو

ساتھ نہ رکھا۔ کبھی کبھار جب موہان جاتے تو دو ایک مہینے سسرال میں رہتے۔ باپ کے انتقال کے بعد جب کوئی سہارا نہ رہا تو وہ یہاں آئیں۔

کلیانی

ددھیال کا قصہ تو بہت ہوگیا۔ اب کچھ ننھیال کی باتیں بھی۔ وہی امی وغیرہ سے سنی سنائی۔

کہتے ہیں کلیانی میں ایک گھرانہ تھا، جس کا تعلق بیدر کے نواب سے تھا۔ ان صاحب کے ہاں ایک اکلوتی لڑکی ہوئی۔ اپنی جائیداد وغیرہ کی خاطر انھوں نے لڑکی کی شادی ایسے فرد سے کی جو گھر داماد رہ سکے۔ یہ صاحب گل مرزا نامی کشمیری نژاد تھے اور قصبہ چنگوپہ میں قضاۃ کا کام کرتے تھے۔ گل مرزا صاحب ہی اپنے خسر کے پورے اثاثہ اور نواب کلیانی کے وقائع نگاری کے اہم عہدے کے بھی حقدار ٹھہرے۔ ان کے ہاں بھی صرف ایک لڑکی افضل بیگم ہوئیں۔ ان کی بیوی کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی اپنی لڑکی کی شادی حیدرآباد کے کسی منصب دار سید فخر الدین سے کردی۔ ان کے یہاں بھی یکے بعد دیگرے چھ لڑکیاں ہوئیں، اس کے بعد ایک لڑکا جس کا نام جمال الدین رکھا گیا۔ ان کے بعد پھر ایک اور لڑکی، جو ابھی ڈیڑھ سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد افضل بیگم کا حیدرآباد آنا جانا تقریباً ختم ہوگیا۔ یہ صاحبہ بالکل سیدھی سادی دنیاداری سے ناواقف تھیں۔ گھر کا انتظام باپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ گھر تھا جس سے کہتے ہیں کہ دادا میاں کے گھرانے کا کلیانی کے قیام کے دوران بہت ملنا جلنا رہا۔ ابی بتاتے تھے کہ قیام کلیانی کے دوران ایک صاحب کہیں باہر سے وہاں آئے۔ ان کا قصہ یہ تھا کہ کسی انگریز کو فارسی پڑھاتے تھے۔ ایک دن گلستان کے سبق کا ترجمہ بتاتے ہوئے عارف کی یہ تعریف بتائی کہ اگر پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور اوپر سے کوئی بڑا پتھر آرہا ہو تو اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہے۔ انگریز کو اس بات پر غصہ

آ گیا اس نے کہا، عارف نہیں گدھا ہے۔ ان صاحب کو یہ بات اتنی بری لگی کہ اسے طمانچہ رسید کردیا۔ اسی حرکت کے بعد برٹش انڈیا میں رہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ نہ جانے کیسے چھپتے چھپاتے کلیانی پہنچ گئے تھے۔ انھیں یہاں ناظم صاحب ''یعنی میرے دادا'' کے ہاں پناہ ملی۔ انھوں نے ان سے لڑکوں کو کچھ انگریزی وغیرہ پڑھانے کی درخواست کی۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تو گل مرزا صاحب کے نواسے بھی یہاں پڑھنے آنے لگے۔ یوں باوجود تفاوت عمران میں اور جمال الدین صاحب میں دوستی ہوگئی۔ کیوں کہ دونوں کے کچھ مشغلے یکساں بھی تھے۔ ابیؔ کو گھڑ سواری اور شکار وغیرہ کا شوق تھا۔ جمال الدین صاحب کے نانا کے جو دو گاؤں تھے وہاں تالابوں پر سرخاب بطخوں، چڑیوں کا بہت شکار ملتا۔ دونوں ساتھ جاتے۔ جمال الدین صاحب کچھ شعر و شاعری بھی کرنے لگے تھے۔ گل مرزا صاحب کے کوئی اولاد نرینہ تو تھی نہیں لہذا وہ اپنی جائیداد قانونی طور پر اپنے نواسے کے نام کرنا چاہتے تھے۔ اسی ضمن میں ناظم صاحب کے ذریعے خواجہ حسن صاحب کو وکیل بنایا گیا۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں کلیانی میں پلیگ کی وبا پھیلی۔ گھر والوں کو جنگل میں خیموں میں ٹھہرا کر خود حیدرآباد روانہ ہونے والے تھے کہ وبا کا شکار ہوگئے۔ ابیؔ سے ہی سنا کہ چار لڑکیوں کی زندگی میں ہی شادیاں ہوگئی تھیں۔ صرف ایک چھوٹی لڑکی غیر شادی شدہ تھی۔ نانا نے ان کی اور ان کے بھائی کی شادی کے لیے گیارہ گیارہ ہزار کی رقم تھیلیوں میں بھر نام کی چھٹی ڈال کر الگ چھوڑ رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کافی رقم تھی۔ ان کے انتقال کے بعد افضل النساء صاحبہ کو یہ پریشانی کہ اتنی خطیر رقم کی حفاظت کیسے کی جائے۔ ایک داماد قریب ہی رہتے تھے' ان پر بھروسہ بھی تھا' چناں چہ یہ ساری رقم ان کے پاس امانت رکھوادی۔ یکمشت اتنی بڑی رقم ہاتھ آئی تو ان صاحب کی نیت بدلی اور وہ چپ چاپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر بمبئی چل دیے۔ یہ صاحبہ بے یار و مددگار نوجوان لڑکے اور لڑکی کا ساتھ۔ گھر میں دنیا بھر کا سامان۔ محرم میں علَم بٹھانے اور عزاداری کا دستور۔ دسویں محرم سارے گاؤں میں شربت

اور قبولی تقسیم ہوئی۔ فرش فروش، بڑی بڑی دیگیں، دستر، ہانڈیاں غرض ڈھیروں سامان۔ سب ہی کچھ ایک لے پالک کے حوالے کر دونوں بچوں کو لے حیدرآباد آ گئیں۔ بس زیورات، چاندی کی چیزیں اور کچھ نقدی کے ساتھ۔ پھوپی اماں کہتی تھیں کہ افضل بیگم صاحبہ نے ان سے ان زیورات کی فہرست بنوائی تھی۔ ان میں سچے موتیوں کے ست لڑے، جڑاؤ، گلو بند، کڑے اور جانے کتنا ہی سونے کا ایک پٹاری بھر زیور تھا ان صاحبہ کو زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔ انداز وہی شاہانہ۔ خوشامدیوں کا مجمع۔ ادھر نوجوان جمال الدین کو دوست احباب نے گھیرا۔ گانے بجانے کی محفلیں سجنے لگیں۔ باپ کا وظیفہ خاندانی تھا مگر اس سے ان خرچوں کی تکمیل کہاں ہوتی، زیور رہن رکھے جانے لگے۔ ابی کا جمال الدین صاحب سے کلیانی میں ربط قائم ہوا تھا وہ حیدرآباد آنے پر بھی قائم رہا۔ پھر عرصہ بعد ان کی خواہش یا جانے کیسے جمال الدین صاحب کی چھوٹی بہن اقبال النساء سے ان کی شادی ہو گئی شاید یہ بھی بات ہو کہ ان کی عمر تیس کے قریب ہو رہی تھی اور اس زمانے میں بڑی عمر تک کنوارا رہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خاندان جانا پہچانا تھا۔ بہرحال اس طرح شمال و جنوب کا ملاپ ہوا اور اس کی پہلی نشانی میں ہوں۔

نوابِ کلیانی

ابی ان نواب صاحب کی سادہ لوحی کی تعریف کرتے تھے اور یہ کہ وہ ان کو بہت پسند کرتے تھے لیکن ساتھ ہی یہاں کے نوابوں میں جو اخلاقی پستی آ گئی تھی اس کا بھی ذکر کرتے۔ اس تعلق سے امی نے بھی بتایا کہ ہم لوگوں کا نواب صاحب کے گھر آنا جانا تھا۔ ان کی بیوی بہت خوب صورت تھیں لیکن کوئی اولاد نہ تھی۔ نواب صاحب نے ایک طوائف کو رکھ لیا اور اُسی سبب کی بنا پر نواب صاحب کی بیوی نے خودکشی کر لی۔ بہرحال اسی قسم کے واقعات کے تحت کلیانی کی جاگیر کورٹ آف

وارڈس میں جانے کا اندیشہ تھا۔ چناں چہ دادا میاں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور حیدرآباد آ کر پھر وکالت شروع کردی۔

نظام آباد کا قیام

پتہ نہیں کہ دادا میاں وغیرہ حیدرآباد کتنے سال رہے۔ اس وقت کی کچھ سنی ہوئی باتیں جو ابیّ نے اور امّی نے بتائیں ۔ کہ دادا میاں وکیل سرکار کی حیثیت سے نظام آباد میں تھے اور وہیں میں اور اختر پیدا ہوئے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہاں کئی سال رہے ہوں گے کیوں کہ وہیں سے قریب کے ایک مقام ہنگولی میں ابیّ نے جا کر وکالت شروع کی تھی۔ امّی بتاتی تھیں کہ یہاں جو مکان ملا اس میں مشہور تھا کہ جن رہتے ہیں اور اسی لیے بہت دنوں سے خالی پڑا تھا۔ ابیّ ان باتوں کو نہیں مانتے تھے اور ان کی صحبت میں امّی نے بھی ان توہمات سے نجات پالی تھی ۔ وہ بہت ذہین اور سمجھ دار تھیں۔ کہتی تھیں کہ جب سسرال آئی تھی تو مجھے کچھ نہیں آتا تھا مگر بہت جلد گھر کا کام، پکانا، سینا، پرونا سب سیکھ لیا۔ اپنے شوق سے ہی بھائی سے اردو پڑھنا بھی سیکھی تھی ۔ شادی کے بعد لکھنا بھی سیکھ لیا۔ ہنگولی میں ڈیڑھ سالہ لڑکا اختر بیمار پڑ گیا تو نظام آباد لوٹ آئے۔

مشن ہاسپٹل میں داخلہ

میری پھوپی کی اکلوتی لڑکی سعیدہ بیگم مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھیں، ان کے بعد دو تین بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ایسے ہی ایک وقت پر انھیں مشن ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا۔ اس زمانے میں یہاں داخلہ بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ ہاسپٹل خالی پڑے رہتے ۔ یہ ہاسپٹل والے اتنی رعایتیں دیتے کہ سارے گھر والوں کو ساتھ رہنے کی اجازت ۔ چناں چہ دادی اماں میری امّی ان کے ساتھ

رہے۔ وہاں کی لیڈی ڈاکٹر باہر کی میم تھیں اور ننگ وغیرہ بھی کرتی رہتی تھیں۔ پھوپی اماں کو دست کاری سیکھنے کا شوق تھا۔ سنا کہ نظام آباد میں کار چوب وغیرہ سیکھنے کے لیے باقاعدہ سواری پر کسی کے گھر جایا کرتی تھیں۔ اب جب ذرا صحت بہتر ہوئی تو ان لیڈی ڈاکٹرس سے یہ ہنر بھی سیکھے۔ امی نے بھی ان کے ساتھ یہ کام سیکھا۔ امی یہ بھی کہتی تھیں کہ میں بہت موٹی اور ذرا صاف رنگ کی تھی تو یہ ڈاکٹرس اکثر "یہ تو ہمارا بچہ ہے" کہہ کر اٹھالے جاتیں۔ نظام آباد سے کیوں اور کب واپس آئے کچھ یاد نہیں۔ اتنا خیال ہے کہ حیدرآباد میں بیگم بازار نامی محلّہ میں قیام تھا اور یہیں رابعہ پیدا ہوئیں۔ ان سے پہلے دوسری بہن رضیہ بیگم بھی کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے اس تعلق سے بالکل کچھ یاد نہیں۔

ان لوگوں کا قاعدہ تھا کہ بچوں کے نام لکھنؤ کے فرنگی محل کے مرشدوں سے رکھوائے جاتے تھے۔ میرے وقت پر ماں کا نام لکھ بھیجا گیا، اس کے وزن پر میر اجمال النساء تجویز ہوا۔

"برعکس نہند نام زنگی"۔ مشترکہ خاندان میں چھوٹے موٹے اختلافات تھے اور ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میری امی غیر خاندان اور پھر دکن کی تھیں۔ یہ شمالی ہند کے رہنے والے اپنے کو بہت بڑا اور دکن والوں کو جاہل اور غیر مہذب سمجھتے تھے۔ شروع شروع میں امی کو بہت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے منجھلے چچا، چچی، پھوپا اور پھوپی کی تنگ نظری اور احساس برتری سے بہت تکلیف پہنچائی۔ مگر اپنی ساس سے ان کو کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ کہتی تھیں کہ وہ بہت فرشتہ صفت، نیک مزاج خاتون تھیں۔ اکیلی سارے گھر کا کام کاج کرتیں بہو بیٹی کوئی ہاتھ نہ بٹاتا۔ اعتراض کرنے اور ہر بات پر ٹانگ اڑانے کو سب تیار رہتے۔ "سنا جب کلیانی میں قحط پڑا تھا اور مائیں ایک ایک دو دو روپے، اور بعض وقت چند روٹیوں کے بدلے" اپنے بچوں کو بیچ رہی تھیں تو انھوں نے دو لڑکیوں کو لے کر اپنے پاس رکھا۔ گھر کا کام کاج سکھایا اور بڑے ہونے پر دونوں کی شادی کر دی ان میں سے

ایک تو پہلی زچگی میں ہی ختم ہوگئی۔ دوسری سلمی کا مرد سے نباہ نہیں ہوا۔ وہ اسے بہت مارتا تھا۔ گھر چھوڑ کر دادی اماں کے پاس آ گئی۔ انھوں نے اسے رکھ لیا۔ تو ہمارے سب ہی چچا، چچی، پھوپی کے سروں پر مذہبی جنون سوار ہوگیا۔ شریعت بگھاری جانے لگی کہ اسے ہر حالت میں شوہر کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور آخر اسے نکلوا کر دم لیا۔ ابی اور چھوٹے چچا کو ایسی باتوں سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور وہ گھر کے معاملات میں بالکل دخل نہ دیتے۔ کچھ عرصہ بعد وہ پھر پریشان حال چھ سات ماہ کا لڑکا گود میں لیے آئی تو انھوں نے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کی۔ اس کے آنے سے انھیں گھر کے کاموں میں بھی مدد ملنے لگی۔ وہ بچے کو اپنے پلنگ کے پاس کھٹولے پر لٹوا لیتیں کہ ماں بے فکری سے کام کر سکے۔ امی کہتی تھیں کہ پھوپا میاں نے اپنی سات آٹھ سالہ لڑکی کو نانی کے پاس جانے سے منع کر دیا کہ وہاں ایک ناجائز لڑکا پل رہا ہے جس سے پردہ کرنا چاہیے۔ یہ تھی ان کی ذہنیت۔ اور ایک ہماری دادا اماں تھیں جن کا سلوک نوکروں کے ساتھ بے حد ہمدردانہ رہتا۔ ان کے دکھ یا بیماری میں اپنوں جیسا خیال رکھتیں۔ امی بتاتی تھیں کہ یہی سلمہ بیمار پڑ گئی۔ طاعون کی وبا شروع ہوئی تھی۔ اس کی بغل میں بھی گھٹلی نکل آئی۔ کوئی اس کے پاس نہ جاتا تھا۔ مگر دادی اماں نے اس کی دیکھ بھال کی۔ حکیم باپ کی بیٹی تھیں دواؤں کا کافی علم۔ خود مرہم بنایا دیکھ بھال کی، علاج سے اچھی ہوگئی۔

دادی اماں وغیرہ اور ہم سب غالباً بیگم بازار محلّہ میں رہتے تھے۔ رابعہ وہیں پیدا ہوئیں۔ یہ نام دادا میاں نے چوتھے بچے کی مناسبت سے خود تجویز کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے بچوں کے نام فرنگی محل کے مرشد تجویز کرتے۔ رابعہ کے نام کے بعد یہ روایت برقرار نہیں رہی۔ رابعہ کچھ چھ سات ماہ کی ہوگی کہ دادا میاں کو امرچنتہ میں پھر مجسٹریٹ درجہ اوّل کی ملازمت مل گئی۔ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے کہ ریاست حیدرآباد اس وقت کئی چھوٹی بڑی جاگیروں، رجواڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یہاں پچاسوں نواب اور راجا تھے۔ راجہ کے تحت علاقے کو سمستان کہتے تھے اور مسلم مالکوں کو نواب کہا جاتا

تھا۔ یہ سمستان کافی بڑا تھا۔ وہاں تعلق داری اور تحصیل داری بھی تھی۔ یہاں کے راجہ کا نام غالباً سری رام تھا۔ وہ زیادہ تر مدراس میں رہتے، ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ امر چنتہ پہنچنے کے لیے ونپرتی نامی ایک اسٹیشن پر اترنا پڑتا۔ یہاں سے چھ سات میل بیل گاڑی پر، امر چنتہ میں بہت زیادہ رہے اس لیے وہاں کی بہت ساری یادیں ذہن میں ہیں۔ جس گھر میں رہے تھے اس کا تو پورا نقشہ ایسے یاد ہے جیسے کل دیکھا ہوا۔ یہ پرانے راجہ کا گھر تھا۔ ایک گڑھی کی طرح کا۔ جو گاؤں کے آخری سرے پر ایک مندر سے ملا ہوا تھا۔ پھاٹک اتنا اونچا تھا کہ ہاتھی معہ حودے اس میں سے بہ آسانی گزر سکتا۔ اس وقت ہم سب لوگ بھی ان کے ساتھ آئے سوائے ابیؔ کے۔ جنھوں نے افضل گنج میں اوپری منزل پر ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لیا اور وکالت شروع کی تھی۔ امر چنتہ میں اس گھر کے بازو کوٹھے پر سے ایک چھوٹا سا گھر نظر آتا۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر رہتے ہیں جو کشمیری نژاد ہیں۔ مگر بیوی حیدرآبادی ہیں۔ دو لڑکیاں ہیں۔ جن کی شادی ہو چکی ہے۔ بڑی کی کرنول میں کسی وکیل کے ساتھ اور چھوٹی کی حیدرآباد۔ یہ دونوں بہنیں بڑی بی اور چھوٹی بی کہلاتیں۔ ان کی ماں کو سب محلے والے اماں جان کہتے بڑی ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھیں۔ پھوپی اماں کو لوگوں سے ملنے جلنے کا بڑا شوق تھا شروع میں تو ایسا لگا کہ جیسے اس گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ لیکن پھر کچھ دنوں بعد ایک نوجوان خاتون نظر آنے لگیں۔ پھوپی اماں نے ان سے فوراً ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دونوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی۔ وہ اردو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ دست کاری سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ بچے نہیں ہوئے تھے اس لیے شوہر نے دوسری شادی کرلی تھی۔ اچھی صورت شکل تھی۔ ان کے باپ فالج کے مریض تھے اور ایک کمرے میں پڑے رہتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت اب ہماری طرف ہی گزرتا۔ وہ پھوپی اماں سے فارسی پڑھ رہی تھیں۔ کچھ دنوں بعد ان کی چھوٹی بہن بھی آ گئیں۔ وہ عمر میں بڑی بہن سے کم اور صورت شکل میں بہت اچھی۔ انھیں پڑھنا لکھنا بالکل نہ آتا تھا مگر محلے کی ساری لڑکیاں جمع کھیل کود،

ہنگامہ۔ ہم بھی کھیل میں شریک ۔ اندر سامنے کے دالان کے بازو ایک چھوٹا سا کمرا تھا اسے میں نے اور اختر نے اپنا خاص کمرا بنالیا تھا۔ دو چپراسیوں کو بھی ہم نے ساتھ کے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ اختر تو اکثر اپنے چپراسی کو گھوڑا بھی بنالیتے تھے۔ ابّی ہم کو روزانہ قرآن پڑھاتے ۔ اردو تو میں اس وقت تک بہ آسانی پڑھنے لگی تھی۔ اختر اور رضیہ نے تو سات سال کی عمر میں ہی قرآن ختم کرلیا تھا۔ سوائے میرے، شاید میری تعمیر میں ہی کوئی خرابی تھی میں نے اور اختر نے یہاں ایک چمن بھی لگایا تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے نیچے۔ سینٹھی کے پھڑوں سے جگہ گھیر کر کیوں کہ گھر میں مرغیاں پلی تھیں۔ ابّی کو ہمیشہ مرغیاں پالنے کا شوق رہا۔ حالاں کہ یہاں ہر چیز بہت سستی تھی۔ اچھا دودھ روپے کا بارہ سیر۔ دو پیسے میں بہت بڑا کٹورا بھر نفیس دہی' غرض یہ جگہ ایسی رہی جہاں ابّی نے بھینس نہیں پالی۔ ورنہ بعد میں اور جہاں بھی رہے بھینس ضرور پال لیں۔ اس چمن میں ہم نے چار کیاریاں بنائی تھیں اور ان کو کاٹتی ہوئی دو پتلی پتلی روشیں بیچ میں وہ جہاں ملتی تھیں دو گول چبوترے سے بنوا کر ان پر باہر صحن میں جو بڑے چکی کے پاٹ سے پڑے تھے وہ رکھوا لیے تھے۔ روز صبح سویرے ہم دونوں ان پتھروں پر جا بیٹھتے اور اپنی کیاریوں میں بڑھتے پودوں کو دیکھتے رہتے۔ یہاں ہم نے گل مہندی، گل عباس، موتیا، موگرا اور ایسے ہی گاؤں میں مل سکنے والے پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ دو ایک پھول بھی نظر آجاتے تو اتنی خوشی ہوتی کہ جیسے ساری دنیا کی دولت مل گئی۔ برسات میں مسلسل تین دن تک بارش ہوتی رہی ہم اپنے وظیفۂ صبح گاہی سے محروم رہے۔ تیسرے دن بارش رکی۔ بہت بے چینی سے سویرے ہی اٹھ کر اپنے چمن کو دیکھنے جارہے تھے۔ صحن دالان سے تین چار سیڑھی نیچے تھا۔ دوسری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھی کہ سامنے کی دیوار جس کے دامن میں ہمارا چمن تھا اُڑ اُڑ ادھم کچی دیوار تھی ، بارش میں بھیگ کر ایک دم بیٹھ گئی۔ دو سیڑھیاں اور اتر جاتے تو ہم بھی اپنے چمن کی طرح اس کے ملبے کے نیچے دب جاتے۔ چمن ختم ہوگیا اور اس کی سیر بھی مگر یہ افسوس جلد ہی یوں ختم ہوگیا کہ دادی اماں، چچا، چچی،

پھوپی غرض سبھی لوگ آ گئے۔ ابیؔ نے ان کو خاص طور سے بلایا تھا۔ اس گڑبڑ میں ہم اپنے چمن کو بھول گئے۔ چچا میاں کا تین سالہ لڑکا وقار بڑا خوب صورت تھا۔ رضیہ کا ہم عمر مگر اٹھان ایسی کہ پانچ چھ سال کا لگتا۔ میں اسے بہت چاہتی تھی۔ تقریباً ایک مہینہ وہ سب لوگ ہمارے یہاں رہے پھر دادا، دادی تو اپنے مستقر امرچنتہ واپس گئے اور چچا میاں اور چچی، پھوپی اماں کے ساتھ جالنہ گئے۔ جہاں پھوپا میاں ملازم تھے۔ چھوٹے چچا ہمارے پاس ہی رہے۔ ان کے ساتھ ہم جنگلوں اور کھیتوں میں خوب گھومتے۔ قریبی نالوں میں ڈوپٹہ پھیلا پھیلا کر مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے۔..........

چائے کی عادت......

ابیؔ کے ایک دوست تھے سید صاحب پکارے جاتے تھے۔ اور تو کچھ ان کے بارے میں معلوم نہیں بس صرف یہ کہ چائے کہ عاشق۔ وہ اکثر آ کر کئی کئی دن رہتے۔ اپنے ساتھ ایک دودھ کا ڈبہ ضرور لاتے۔ ابیؔ نے دو اسٹو خرید لئے تھے۔ ان پر بآسانی ہر وقت چائے بنتی رہتی۔ اتنی زیادہ تو نہیں تاہم ہم بھی کم عمری سے چائے کہ عادی ہو گئے۔ یہاں شاید گنا بہت ہوتا تھا۔ کیونکہ فصل پر گنے کا رس آتا۔ اس کا میٹھا جو رساول کہلاتا بہت بنتا۔ یہ مشکل طلب کام تھا۔ پکنے میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے۔ ایک ادھیڑ سی عورت کام کو مل گئی جو رات دن رہتی تھی۔ سنا افین بھی کھاتی تھی۔ وہ اُسے بہت خوشی سے پکاتی۔ ابیؔ اس رساول کو شہر میں مقیم سبھی عزیزوں میں لے جا کر بانٹتے۔ موہان کے اس میٹھے کو یہاں کے لوگ بالکل نہ جانتے تھے۔ پر میں نے دیکھا دودھ اور بالائی کے ساتھ اس کو کھانا سبھی کو پسند آتا۔

اسی زمانہ میں آپا نے میرے نام تہذیب نسواں جاری کروا دیا تھا۔ مطالعہ کا شوق تبھی سے تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ اب تو بس اتنا یاد ہے کہ اس میں شوہر کو کیسے رام

کریں۔ ساس سسر سے کیسے برتاؤ کریں۔ وغیرہ قسم کی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ جن کے بارے میں مجھے نہ کچھ علم تھا نہ جاننے کی فکر یا دلچسپی۔

پہلی چوری............

اُن ہی دنوں ایک روز خط آیا تو میں نے دیکھا اسے پڑھ کر ابی کچھ چپ سے ہو گئے اور خط کو احتیاط سے شیروانی کی جیب میں رکھ دیا۔ مجھے ذرا تجسس ہوا تو پہلی بار چوری سے وہ خط نکال کر پڑھا۔ معلوم ہوا وہ پیارا سا لڑکا وقار ڈائیریا میں مبتلا ہو کر دو دن میں جاں بحق ہو گیا۔ میں اردو اچھی طرح پڑھنے لگی تھی۔ پھوپی زاد بہن سعیدہ بیگم نے تہذیب نسواں رسالہ میرے نام جاری کروا دیا تھا۔ جس میں وہ "س۔ب" کے مخفف سے مضامین لکھتی رہتی تھیں۔ ہم انھیں آپا پکارتے تھے۔ مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں اور اپنے برابر کا سمجھتیں۔ بچپن میں چیچک کی وجہ سے ان کی سماعت خراب ہو گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ بے حد شکی مزاج ہو گئی تھیں۔ اردو فارسی گھر پر ہی بہت اچھی پڑھ لی تھی۔ لکھنے کا خاص ملکہ تھا۔ عبارت بے حد شستہ اور جا بجا برموقع اشعار کا استعمال۔ مطالعہ کا بھی شوق تھا ہم دونوں بچپن سے ہی ساتھ رہے اور مجھے ان کے اشارے کو سمجھنے اور اشاروں میں ان سے بات کرنے کی کافی مشق ہو گئی تھی۔

گلن پور میں آئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ امی کی ڈلیوری کے لیے پھر حیدر آباد آنا پڑا۔ یہاں بہت کم کرایہ پر ایک مکان مل گیا تھا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں جن رہتے ہیں۔ رابعہ کے وقت تک تو دادی اماں امی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس دفعہ ساتھ رہنے کے لیے نانی اماں آ گئیں۔ انھوں نے مکان کو آسیب زدہ سنا تو ان کو جن نظر بھی آنے لگے۔ ایک اتفاق یہ۔ سلمٰی کا لڑکا اسلم ہمارے ہاں کام کرتا تھا۔ وہ ایک دن مرغیوں کو دانہ ڈالنے اوپر چڑھا اس گھر میں جالی لگا ہوا

ایک اندھیرا سا کمرہ تھا جس میں گھن پور سے لائی ہوئی مرغیاں چھوڑ دی گئی تھیں، دروازے میں سے دانہ ڈال رہا تھا کہ نہ جانے کیسے اتنی بلندی سے نیچے گرا مگر اسے کہیں خراش تک نہ آئی۔ ایسے لگا جیسے کسی نے گود میں اٹھا کر آہستگی سے زمین پر لیٹا دیا ہو۔ امّی نے یقین کے ساتھ کہا یہ ضرور جن کا کام ہے مگر شریف جن لگتا ہے۔ افضل بیگم نامی ہماری نانی دراز قد، دبلی پتلی، متناسب اعضاء، گورا رنگ بہت اچھی شکل۔ آٹھ بچوں کی ماں مگر دیکھنے میں لگتی نہیں تھیں۔ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر بہت نیک سیدھی سادی خاتون۔ رابعہ کے بعد پیدا ہونے والے بھائی کا نام انور حسن رکھا گیا تھا۔ ان کی پیدائش کے دو تین ہفتوں بعد وہ پرانے شہر اپنے گھر چلی گئیں۔ پھر کچھ دنوں بعد ہماری ایک خالہ "جن کو ہم نے کبھی دیکھا نہیں تھا" بہن سے ملنے آئیں۔ وہ کلیانی کے قریب کسی مقطعۂ دار سے بیاہی گئی تھیں۔ ان کے کئی بچے تھے مل کر جانے لگیں تو امی نے چار پانچ دن کے لیے روک لیا وہ ابّاؔ سے پردہ کرتی تھیں۔ ان کو اوپر کے کمرے میں "جواب خالی ہو چکا تھا" ٹھہرایا گیا مجھے اور اختر کو شرارت سوجھی کہ ان کو جن سے ڈرانا چاہیے۔ ہم دونوں نے مل کر الا بلا جمع کر کے رسیوں، پرانے کپڑوں وغیرہ سے اپنی دانست میں ایک ڈراونا ہیولا بنا کر "جب وہ تھوڑی دیر کے لئے کہیں گئی ہوئی تھیں" لے جا کر اس کمرے کے ایک اندھیرے کونے میں کھڑا کر دیا۔ اتنا تو یاد ہے۔ مگر یہ بالکل یاد نہیں کہ وہ ہمارے جن سے ڈریں کہ نہیں۔ یہ وہی خالہ تھیں جن کے شوہر ساس کی امانت رکھائی ہوئی خطیر رقم لے کر بمبئی فرار ہو گئے تھے۔ چھ سات ماہ بعد ہی وہ پھر اپنے مقطعۂ واپس چلی گئیں۔ اس کے کوئی پندرہ بیس سال بعد دوبارہ ان سے ملنا ہوا۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑے لڑکے کو کھیتی باڑی سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہے جو بے حد تنگ و تاریک تھا۔ دیواریں گز گز بھر تک نم۔ یہ مجھے اس لیے یاد رہ گیا کہ اس وقت میرا لڑکا جاوید تین چار ماہ کا تھا۔ انھوں نے یہاں کی رسم کے مطابق مجھے بلا کر گود بھری اور پھول پہنائے تھے۔ ان کے صاحب زادے کے پاس قابلیت تو کچھ تھی نہیں کام کیا ملتا۔ خالہ جنگل

کی کھلی ہوا میں پلیں بڑھیں۔ یہاں اس تنگ و تاریک نم مکان میں رہ کر کچھ ہی دنوں میں بیمار پڑ گئیں۔ چند مہینے بے روزگاری کے گذار کر وہ سب پھر مقطہ واپس چلے گئے۔ مگر انھیں جو روگ لگ گیا تھا اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ تین چار سال کے بعد وہ لوگ پھر شہر آئے اور میرے ہی گھر آ کر ٹھہرے۔ یہاں تین چار ماہ بعد ہی میری خالہ کا انتقال ہو گیا۔

یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ بتادوں کہ ابی گھن پور کیوں نہیں گئے۔ اوپر میں نے ان کے ایک بہت گہرے دوست امین الحسن صاحب کا ذکر کیا ہے۔ وہ سشن جج کے عہدے پر فائز تھے۔ نواب سالار جنگ نے اپنے پورے اسٹیٹ کے انتظام کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور ایک طرح سے وہی پورے اسٹیٹ کے کرتا دھرتا بن گئے تھے۔ ایک دن اپنے دوست سے ملنے آئے تو کہا تم کہاں ایک معمولی سی جاگیر میں پڑے ہوئے ہو۔ سالار جنگ اسٹیٹ میں آ جاؤ۔ میں مجسٹریٹ کے عہدہ پر ہی تمھارا تقرر کروا دیتا ہوں۔ ابیؔ نے ان کی پیش کش کو قبول کر لیا اور سرور نگر پر جو شہر سے چھ سات میل دور تھا ان کا تقرر ہو گیا۔ سرور نگر جانے سے پہلے چار پانچ مہینے میں جو حیدر آباد میں گذرے تقریباً روز ہی والد صاحب کے کوئی نہ کوئی رشتہ دار بھائی ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ ایک دن بہت نوجوان سے، میانہ قد، صاف رنگ صاحب ان سے ملنے آئے تو ابیؔ نے انھیں گلے لگا کر پیار کیا۔ معلوم ہوا وہ ان کی سگی خالہ کے لڑکے سلیم الحسن ہیں۔ مڈل پاس کر چکے تھے۔ والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ سیدھے موہان سے چلے آ رہے تھے۔ اکثر ہمارے گھر آنے لگے۔ ابیؔ کا تقرر سرور نگر پر ہو گیا تو انھوں نے اپنے ہی آفس میں ان کو کچھ کام پر لگا دیا۔ ہم لوگ اپنی نئی جگہ جانے ہی والے تھے کہ وہ امرچتہ والی چھوٹی بی آ دھمکیں۔ وہ اپنے ماموں کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ وہاں نہ جانے ان کو کیسے ہمارے گھر کا پتہ ملا اور وہ دو تین دن ہمارے پاس رہنے کی نیت سے آ گئیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ کل سرور نگر جا رہے ہیں

تو ذرا پریشان ہوئیں کہ اب کیا کریں؟ ماموں پہنچا کر واپس ہو گئے تھے۔ ابّیٰ نے کہا اب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے ساتھ سرور نگر چلیے۔ وہاں سے خط لکھیں گے تو آ کر لے جائیں گے۔ فوراً خوشی سے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ دوسرے دن سویرے سب سامان گاڑی پر لد چکا تھا کہ ابّیٰ کو یاد آیا قرآن شریف ''جس کمرے میں چھوٹی بی ہیں اس کے دروازے کی اندر کی مچان پر رکھا ہے تو انھوں نے پکار کر کہا'' کہ آپ ذرا کچھ آڑ کر لیں تو میں مچان سے قرآن اتار لوں۔'' دو تین منٹ رُک کر اندر گئے تو دیکھا وہ بے تکلف کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ ابّیٰ نے انھیں سلام کیا اور قرآن اتار کر باہر آ گئے میں وہیں کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مارے خوشی کے بے تحاشہ بھاگی۔ سب کو خبر کرنے کہ چھوٹی بی کا پردہ ٹوٹ گیا۔''

سرور نگر

جس مکان میں ہم آ کر رہے وہ بھی بڑا تھا۔ صحن آمنے سامنے دالان در دالان ان کے بازو کمرے ایک طرف کے حصہ میں چچا میاں اپنی فیملی کے ساتھ رہنے لگے تو دوسری طرف ہم لوگ۔ سلیم چچا اور چھوٹے چچا بھی ساتھ تھے۔ دالان میں ایک طرف باقی حصہ میں پلنگ۔ ابّیٰ کو کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ دفتر میں کام کافی کم۔ ان کو شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ اس کے لیے کوئی ساتھ تھا نہیں۔ اکثر پچیسی کی محفل جمتی۔ امی اور ابی ایک طرف، دوسری طرف سلیم چچا اور چھوٹی بی جو کہ اب ہمارے گھر کے کسی فرد سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہ صاحبہ بہت تیز، شوخ و شریر تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن انھوں نے سب کو بہت پریشان کیا۔ ہم بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، کہ نہ جانے کیسے کہاں جا کر چھپیں کہ بہت تلاش کرنے پر بھی کہیں نہ ملیں یہاں تک کہ سلیم چچا، چھوٹے چچا اور چچا میاں بھی ان کی تلاش میں شریک ہو گئے۔ آخر سب تھک کر بیٹھ گئے۔ تب کچھ دیر بعد وہ چھت سے

اترتی نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ دو اونچی اور ذرا نیچی چھتوں کے درمیان جہاں پانی بہنے کی نالی بنی ہوئی تھی وہاں چھپی تھیں۔ بڑی عجیب تھیں وہ صاحبہ ملنے آئی تھیں لیکن یوں رہ گئیں جیسے ہمارے ہی خاندان کی ایک رکن ہوں۔ کوئی بیس پچیس دن رہ کر واپس گئیں۔

اختر آٹھ سال کے ہو رہے تھے کہ ابیؔ نے ان کو پڑھنے کے لیے دادا میاں کے پاس بھیج دیا۔ میں بہت اکیلا محسوس کرنے لگی۔ وہ مجھ سے صرف ایک سال اور دو مہینے چھوٹے تھے۔ بچپن سے ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہے اور ہر کام میں شریک۔ رضیہ مجھ سے پانچ ساڑھے پانچ سال چھوٹی تھیں۔ میرا قرآن اب تک ختم نہیں ہوا تھا۔ چار پانچ پارے باقی رہ گئے تھے۔ دس سال کی عمر۔ اتنی بڑی لڑکی کو پڑھانا شاید ابی کو اچھا نہیں لگا۔ مجھ سے کہا اب تم خود پڑھ سکتی ہو۔ دو تین رکوع پڑھ کر روز یاد کر لیا کرو۔ میں قرآن لے کر بیٹھ تو جاتی مگر ابتدائی سورتیں جو اچھی یاد تھیں انھیں کو پڑھتی۔ یوں وہ آخری پارے بغیر پڑھے ہی رہے۔ بلا معنی مطلب سمجھے پڑھنا عجیب سا لگتا۔ ویسے اردو کے اخبار، کتابیں جو بھی مل جاتیں بڑے شوق سے پڑھتی۔ راشد الخیری کی شام غم، شب غم اور جانے کیا کیا غم۔ نذیر احمد کی سب کتابیں پڑھیں وہ بہت اچھی لگیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار اچھی طرح یاد ہیں۔ کلیم، نعیمہ، عاقل ،کامل، اصغری، اکبری، حسن آرا، محمود وغیرہ سب ہی، مگر راشد الخیری کی کتابوں سے کچھ یاد نہیں۔ وہ زیادہ اچھی بھی نہیں لگتی تھیں۔

سرور نگر میں ہم دو تین سال رہے مگر گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ بس سال میں دو بار دادا میاں کے پاس چلے جاتے۔ دو ہفتوں کے لیے محرم میں اور ایک مہینہ رمضان میں۔ دادی اماں کے پاس رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر جمعہ کو ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے محلے کی لڑکیوں کو جمع کرتیں اور ہم پیچھے کے آنگن میں جو بہت بڑا تھا خوب کھیلتے۔ شام میں لڑکیاں سب مل کر ڈھول بجاتیں، گیت گاتیں، کبھی کبھی دادی اماں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتیں۔ گانے بجانے میں میں بالکل

حصہ نہ لیتی۔ شاید یہ احساس کہ ہمارے دوسرے اہل خاندان اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گانا تو بڑی بات زندگی بھر کبھی گنگنا بھی نہ سکی۔ کیوں کہ ایسی کسی بات پر مجھے تو نہیں بلکہ امی کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا کہ بچوں کی تربیت کرنا تک نہیں آتا یہ بات مجھے اچھی نہ لگتی۔ اسی لیے بہت محتاط رہتی۔ بہرحال دادی اماں کے پاس بہت دل لگتا۔ برسات کے موسم میں صحن میں جو نیم کا پیڑ تھا اس میں ہمارے لیے جھولا پڑتا۔ ہم سب خوب جھولتے۔ رضیہ بھی دادی اماں کی چہیتی تھی۔ اس وقت وہ باتیں بھی بہت کرتی اور کتنی ہی نقلیں اتارتی۔ کبھی سوئی پوت والی بنی چلی آ رہی ہے تو کبھی دھوبن، کبھی دہی مکھن بیچنے والی۔ اور بالکل اُن ہی کی طرح آوازیں لگاتی۔ پڑھنے کی بھی شوقین تھی۔ غرض اس طرح ڈیڑھ دو ماہ امر چنتہ میں بہت اچھی طرح گزرتے۔ سرور نگر کے دوران قیام کا سلیم چچا کا ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ معلوم ہوا کہ سلیم چچا کے والد "یعنی ابی کے سگے چھوٹے خالو نے" ان کی شادی میری پھوپی کی لڑکی سعیدہ بیگم سے طے کردی ہے۔ سلیم چچا کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے رشتہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ سنا ان کے والد صاحب نے بہت دھمکیاں دیں۔ ہماری چچی اماں کو اس انکار میں امی کا دخل نظر آیا۔ اور کہا کہ یہ سب بھاوج کا کیا دھرا ہے۔ خیر، مزے کی بات یہ کہ ابی کے تایازاد بھائی وحید الحسن صاحب جن کی شادی مشہور وکیل خواجہ حسن صاحب کی لڑکی آمنہ بیگم سے ہوئی تھی ان کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ دوسری شادی انھوں نے اپنے چچا حکیم مرزا صاحب کی لڑکی سے کی۔ وہ بھی ایک لڑکا چھوڑ کر چل بسیں۔ اب ان کو تیسری شادی کی فکر تھی۔ صاحب موصوف بھی سالار جنگ اسٹیٹ میں ملازم تھے۔ گیل ان کا مستقر تھا۔ یہ صاحب دکنیوں کو بہت برا سمجھتے تھے۔ امی اور بچوں سے ان کا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ سلام کرتے تو جواب نہ دیتے۔ دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ ابی کو ان کا یہ رویہ پسند نہ تھا مگر ان کی عادت تھی کوئی کتنا ہی مخالف ہو وہ اس سے خود اچھی طرح ملتے۔ اتفاق سے چچا میاں اور چچی اماں نے انھیں چھوٹی بی سے عقد کر لینے کا مشورہ دیا۔ اسی سلسلہ میں وہ

حیدرآباد آئے۔ دونوں دادا میاں کے پاس گئے ہوئے تھے اور ان صاحب کی ملاقات ابی سے ہی ہوئی۔ انھوں نے چھوٹی بی کے بارے میں پوچھا کہ کیسی ہیں۔ ابی نے بس اتنا کہا کہ " وہ تو ہم سب کے ساتھ کئی ہفتے یہاں رہ چکی ہیں اچھی خاصی ہیں"۔ اس پر انھوں نے بڑے تعجب سے پوچھا! " بے پردہ رہیں؟" ابی نے جو سچ بات تھی بتادی تو انھوں نے بڑے زور سے لاحول پڑھی اور پھر کہا کہ " اتنی دور سے آیا ہوں چچا چچی سے بھی ملتا جاؤں"۔ اور امرچنتہ چلے گئے۔ وہاں سے جب واپس ہوئے تو چھوٹی بی کو اپنی تیسری بیوی بنا کر ساتھ لے گئے۔ ادھر سلیم چچا نے اپنے والد کے دباؤ پر سعیدہ بیگم سے شادی پر رضامندی ظاہر کردی اور یہ شادی امرچنتہ کے گھر میں بڑی سادگی سے انجام پائی۔ سلیم چچا کا قد زیادہ نہیں تھا لیکن گورا رنگ اچھا ناک نقشہ، پُر مذاق نوجوان تھے۔ موسیقی شاعری وغیرہ سے بھی لگاؤ تھا۔ جتنے وہ صفائی پسند تھے ہماری آپا اتنی ہی صفائی سے گریزاں۔ بس ہر وقت اس ٹوہ میں رہتیں کہ ان کے ہونے والے شوہر کس سے ملتے، کیا باتیں کرتے ہیں وغیرہ۔ اس کے لیے وہ مجھے آلۂ کار بناتیں اور ان کی خاطر مجھے یہ ناخوش گوار کام کسی نہ کسی طرح انجام دینا ہوتا۔ سلیم چچا دو تین سال سے ہمارے ساتھ تھے۔ وہ کھلے دماغ کے اچھے آدمی لگتے۔ ہم سب بچوں کو بہت چاہتے، ہنسی مذاق کرتے شرلاک ہومز کی کہانیاں بہت دل چسپ انداز میں سناتے۔ رضیہ تو کہانی سننے کی خاطر شام سے ہی ان کے آگے پیچھے پھرتی۔ ان کی بیوی کو یہ بہت برا لگتا تھا۔ ان کی شادی کے بعد ابھی ہم سب امرچنتہ میں ہی تھے کہ انور پر یکایک ڈائریا کا حملہ ہوا اسے فوراً حیدرآباد لائے دوا علاج سے ٹھیک تو ہوگیا مگر ڈاکٹر نے نہ جانے کیا دوا دی کہ دونوں آنکھوں کی پتلیوں پر سفید جھلی سی آگئی۔ بینائی تقریباً مفقود۔ اُن ہی دنوں ابی کو ٹنل پر تین مہینے کی منصری کے آرڈر ملے۔ ابی ہم سب کو لے کر وہاں روانہ ہوئے۔ راستے میں رائچور پڑتا تھا جہاں حسرت موہانی کے خسر شبیر حسن صاحب رہتے تھے۔ پہلے وہ نظام آباد میں تھے وہاں سے رائچور آگئے تھے۔ نشاط النساء صاحبہ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ جس کے بعد

انھوں نے ابی کی تایازاد بہن صالحہ بیگم سے جو وحیدالحسن صاحب کی سگی بہن تھیں، عقد کرلیا تھا۔ انھوں نے گنٹل جاتے ہوئے بہنوی سے ملنے کے لیے دو دن رائچور میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ بہت خلوص ومحبت سے ملے۔ خوب خاطر کی۔ ان دو دنوں کے قیام میں یہ انکشاف ہوا کہ ان کی دو بیویاں اور بھی ہیں۔ ایک تو ایک ہی گھر میں صالحہ بیگم کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور اتر پردیش کی تھیں۔ تیسری بیوی کو انھوں نے الگ گھر میں چھوڑ رکھا تھا، وہ دکنی تھیں۔ پہلی دو سے تو کوئی اولاد نہ تھیں البتہ یہ تیسری سے سنا دو لڑکیاں تھیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ شبیر صاحب دُختِ رز کے بھی رسیا تھے۔ غرض پوری طرح حیدرآباد کے بگڑے نواب۔ خیر، وہاں ابی نے پہلے ہی سے وحیدالحسن صاحب کو لکھ دیا تھا کہ مکان کا انتظام کروادیں۔ وہاں پہنچے تو جو لوگ لینے آئے تھے انھوں نے وحیدالحسن صاحب کے گھر پہنچادیا۔ چھوٹی بی نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور خود چچا صاحب بھی بڑی محبت سے اچھی طرح پیش آئے۔ اس دوران مکان کی تلاش جاری رہی۔ زیادہ تو رہنا نہیں تھا۔ صرف ڈھائی تین مہینے کی بات تھی تو کسی ایک ساہوکار سنگلپا نامی نے اپنا ایک تفریحی بنگلہ دے دیا۔ چھوٹے سے ایک باغ کے بیچ میں یہ بنگلہ بڑا اچھا لگا۔ وہاں ایک انگور کی بیل بھی تھی۔ جس میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے۔ جب پانی دیا جاتا تو انگوروں میں پانی دوڑتا صاف دکھائی دیتا۔ گلاب کے پودے بھی کتنے ہی رنگوں کے بکثرت تھے۔ یہاں کے مختصر قیام میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ میرے چھوٹے بھائی انور کو پھر بینائی مل گئی۔ وہاں ایک ڈاکٹر تھا۔ پستہ قد، کم رو، سیاہ فام مگر شہرت بہت تھی اس کی۔ اس نے آنکھ میں ڈالنے کی کچھ ایسی دوا دی کہ سفیدی تیزی سے چھٹنے لگی۔ بینائی تقریباً نارمل ہوگئی۔ مجھے بچپن سے اکثر نزلہ کی شکایت رہتی اور ناک تو مستقل بند رہتی۔ منہ سے سانس لیتی تھی۔ اس نے حلق میں لگانے کی کوئی دوا دی۔ اگرچہ وہ بہت پابندی سے نہیں لگائی گئی پھر بھی اتنا فائدہ ہوا کہ ناک سے سانس لینے لگی۔ منصرمی ختم کر کے ابی پھر اپنی پرانی جگہ واپس آگئے۔ یہاں دادامیاں کے پاس ڈیڑھ سال رہ کر

اختر فارسی اچھی طرح اور تھوڑی بہت عربی سیکھ چکے تھے۔ وہ خود شاعر تھے۔ اختر کو بھی شعر کہنے کا شوق ہو گیا تھا۔ اردو بھی بہت اچھی۔ مگر انگریزی حساب وغیرہ میں بالکل کورے تھے۔ ابی ان کو اچھی اور نئی تعلیم دلوانا چاہتے تھے لیکن سرور نگر میں ایسا کوئی اسکول نہ تھا۔ ابی عموماً بھی بڑے عہدہ داروں سے ملتے رہتے تھے۔ نواب صاحب کے پاس بھی کبھی کبھی چلے جاتے۔ ایک دو بار کچھ مخصوص عہدہ داروں کے ساتھ دعوت میں ابی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان دعوتوں کا ابی بڑے دل چسپ انداز میں ذکر کیا کرتے تھے۔ بتاتے کہ شروع شروع میں کانٹے چھری سے انھوں نے دوسروں کو دیکھ کر تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اور ایک بار کوئی لذیذ میٹھا مزید منگوانے کی خاطر جو پلیٹ میں تھا وہ بھی کیسے کھو دیا۔ ایک بار جب وہ نواب صاحب سے ملنے گئے تو ان سے کہا کہ "مستقر پر لڑکے کی پڑھائی نہیں ہو رہی ہے۔ شہر میں رہنے کی اجازت دی جائے میں وہاں سے دفتر آتا جاتا رہوں گا"۔ نواب صاحب نے اجازت دے دی اور ہم سب شہر آ کر پرانے فیل خانے کے اسی مکان میں کرایہ دار رہے۔ نیچے مارواڑی، جن کے گھروں کے پیچھے کا رُخ سدی عنبر بازار کی سڑک پر ہوتا۔ دوسری طرف کے تینوں مکان بھی دو منزلہ تھے۔ اُن ہی مکانوں میں سے آخری تیسرا مکان ہمیں ملا تھا۔ ان سب مکانوں میں ہمارے رشتہ دار ہی کرایہ سے رہتے تھے۔ چچا میاں کی فیملی بھی سرور نگر سے ساتھ ہی آئی تھی۔ وہ لوگ نچلی منزل میں اور ہم اوپری منزل میں رہے۔ چھوٹے چچا اور سلیم چچا بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ سلیم چچا کی بیوی وہیں امرچنتہ میں ماں اور نانی کے پاس رہیں۔ چند ہی روز بعد ابی کو پھر تین مہینے کے لیے منصرمی پر گنگل جانا پڑا۔ اس بار چھوٹے چچا اور سلیم چچا بھی ساتھ تھے۔ چھوٹے چچا کی عجیب لاأبالی طبیعت تھی۔ حسرت موہانی کے ساتھ سدیشی تحریک میں بھی حصہ لیا تھا۔ کانپور میں ان کے سودیشی اسٹور میں کام کرتے رہے تھے۔ ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت کی کھادی کا لباس پہنتے اور ٹوپی بھی اسی کی۔ مگر گاندھی کیاپ سے بالکل الگ۔ جب کانپور میں سودیشی اسٹور پر کام کرتے تھے کہ گرفتاری کا

وارنٹ آیا۔ مگر اتفاق دیکھیے دادی اماں کی بیماری کا تار ملتے ہی وہ ایک دن پہلے وہاں سے حیدر آباد کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ (ورنہ خون لگا کر شہیدوں میں تو شامل ہو ہی جاتے) بہر حال پھر وہ زیادہ تر ہمارے ساتھ ہی رہے۔

ذکیہ کی پیدائش

گیل میں ہی دس شعبان کو چوتھی بہن ذکیہ پیدا ہوئی اور امی بیمار ہو گئیں۔ نوکرانی کوئی تھی نہیں۔ سات آٹھ لوگوں کا کنبہ۔ گھر میں بڑی لڑکی میں ہی۔ چناں چہ ابّا اور میں نے مل کر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ابی سالن بنا لیتے مگر روٹی بالکل نہ آتی اس کی کوشش میں نے کی۔ شروع شروع میں تو عجیب ٹیڑھی میڑھی بنی پھر کچھ ٹھیک بننے لگی۔ منصری کی مدت ختم ہو رہی تھی کہ امی بیمار، ذکیہ بھی بیس دن کی۔ واپس شہر پہنچے۔ اور عارضی طور پر یہاں محبوب گنج کے ایک پرانے سے مکان میں اترے سلیم چچا کے بڑے بھائی علیم الحسن صاحب نے اس کا نام ضیا برج رکھ چھوڑا تھا۔ پرانی وضع کا دو منزلہ مکان تھا وہی دالان در دالان وغیرہ اوپر بھی تین چار کمرے اور دوسری ضرورت کی چیزیں۔ ان کمروں میں سے ہر ایک میں ابی کے بھائی بند مقیم تھے۔ یہ سب حیدر آباد میں کام کرتے مگر ان کی بیویاں موہان ہی میں رہیں۔ ایک ماما نوکر رکھ لی تھی وہ سب کا کھانا بنا دیتی۔ نیچے کے دالان خالی تھے اور اس میں ہم نے پڑاؤ ڈالا ابی کو دفتر جانا ہوتا تو میں اور اختر یہاں کھانا بناتے۔ گھر کا پچھلا حصہ گر چکا تھا۔ اسی طرف ایک لانبا سا کمرا تھا جسے ہم نے باورچی خانہ بنا لیا تھا۔ یہاں بچھو بہت تھے۔ ہم چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لیتے۔ دو ایک کو ٹھکانے لگا کر کام شروع کرتے۔ یہاں ہم تین چار ہفتوں سے زیادہ نہیں رہے۔ امی ٹھیک ہو گئیں تو دادی اماں کے پاس چلے گئے۔ وہاں بھی ان دنوں کوئی نوکر نہیں تھا۔ کام کرنے والی پرانی لڑکیاں سب شادی ہو کے رخصت ہو چکی تھیں۔ دادی اماں

اکیلی ہی سارا کام کرتیں۔ کوئی ہاتھ نہ بٹاتا مگر اعتراضات کرنے کو سب تیار۔

اُن ہی دنوں ایک چپراسی کی شادی شدہ لڑکی کو شوہر نے گھر سے نکال دیا کیوں کہ وہ بہت بیمار تھی اور کوئی اسے رکھنے کو تیار نہ تھا دادی اماں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہاں ایک اچھا برہمن ڈاکٹر تھا جس سے اس کا علاج کروایا۔ تھوڑے دنوں میں وہ ٹھیک ہوگئی۔ بہت کم عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی مالن نام تھا۔ جب دادی اماں نے بیمار لڑکی کو پناہ دی تو اعتراض کیا کہ مرض کیا ہے، کیسی ہے بلا جانے بوجھے گھر میں رکھ لیا وغیرہ وغیرہ۔ جب اچھی ہوگئی تو ہر ایک اس پر حکم چلانے لگا۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے اسے پکارا جاتا۔ وہ بے چاری کس کس کا کام کرتی۔ ایک دفعہ تو جانے کیا ہوا شاید اس نے چچی اماں کا کوئی کام نہیں کیا اور انھوں نے میاں سے نہ جانے کتنے مبالغہ کے ساتھ غریب مالن کی شکایت کی کہ ہمارے چچا ڈنڈا لے کر اسے مارنے دوڑے کہ اس کی یہ مجال؟ دادا میاں سے برداشت نہ ہوا۔ بیچ میں پڑ کر منت سماجت کر کے اس غریب مالن کو ان کے عتاب سے بچایا۔ دادا میاں بڑے نرم دل، ہمدرد، خوش مزاج اور روشن خیال تھے۔ ماہ وار جو ملتی سب لا کر دادی اماں کے ہاتھ میں رکھ دیتے کہ وہ جانیں اور ان کا کام اتنا بڑا کنبہ جانے کیسے چلاتی تھیں۔ وہ کافی موٹی اور گھٹنوں کے درد کی مریض تھیں۔ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ہی سارا کام کرتیں اور پھر ہر فیملی کو الگ الگ سینیوں میں کھانا لگا کر بھیجنا، عجیب دستور تھا۔ سب لوگ ایک دسترخوان پر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ میری عمر اس وقت تقریباً بارہ سال کی ہو رہی تھی۔ پردہ تو آٹھ سال سے ہی شروع ہوگیا تھا لیکن میں کبھی اس کی ٹھیک سے پابندی نہ کرسکی۔ یہاں بھی کافی چپراسی تھے مگر ایک راج محمد نامی سے پردا نہ کرتی۔ وہ باہر کے سارے کام کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے اسے بہت بُرا بھلا کہا کہ اس نے اپنی ایک لڑکی کو چھوٹی بی کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔ گنٹل میں جب ہم چھوٹی بی کے ہاں رہے تھے تو پتہ چلا تھا کہ کام کرنے والی تیرہ چودہ برس کی لڑکی انھوں نے راج محمد سے لی تھی اور اس پر کافی سختی کرتیں۔ اب اسی

وجہ سے میں نے راج محمد کو یہ سب کہا۔ کافی عرصہ بعد جب ذرا اچھی سمجھ آئی تو افسوس ہوا آٹھ روپے ماہوار تنخواہ۔ پانچ لڑکیاں وہ خود اور ان کی بیوی سات افراد کا خرچ کتنا ہی سستا زمانہ ہوا تنے کم پیسوں میں کیسے گزر ہو سکتا تھا۔ ورنہ کوئی اپنے بچوں کو بیچتا۔؟

شہر واپسی

امر چنتہ سے پھر شہر منتقل، وہی پہلے والا فیل خانہ کا دو منزلہ مکان مل گیا۔ چچا میاں اور چچی اماں بھی یہیں رہنے لگے۔ سلیم چچا اور چھوٹے چچا ساتھ۔ امی کے اب چھ بچے تھے۔ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا میرا فرض تھا۔ ماما تھی مگر روٹی بنانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے ابی سے کہہ کر خاص طور سے ایک بڑا توا بنوالیا تھا۔ باورچی خانہ نیچے کے حصہ میں تھا۔ روز نیچے آ کر غلہ وغیرہ نکلوا کر دینا روٹی پکانا وغیرہ خوشی خوشی کرتی کیوں کہ سامان میں جو لکڑی کا بڑا سا صندوق آیا تھا اس میں جو دولت ہاتھ لگی اس کی خوشی نہ پوچھیے۔ تقریباً ہر موضوع پر کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ مرثیے، میلاد نامے، تاریخ، سوانح، ناولیں، شعرا کے دیوان وغیرہ وغیرہ۔ یہ صندوق اس دروازے میں رکھا تھا جس کے پیچھے دالان میں چچی اماں کا پلنگ تھا۔ اس دروازے میں بڑی بڑی درازیں تھیں کہ ان میں ادھر کی چیزیں اُدھر صاف دکھائی دیتیں۔ کمرے میں سڑک کی طرف ایک کھڑکی بھی تھی جس سے کمرا کافی روشن رہتا۔ بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ میں کوئی کتاب نکال کر کھڑے کھڑے ہی پڑھنے لگتی۔ کتاب کی پشت دروازہ کی طرف ہوتی۔ چچی اماں کو دراز سے کتاب کا نام صاف دکھائی دے جاتا۔ ''وہ زیادہ تر پلنگ پر ہی لیٹی یا بیٹھی رہتی تھیں۔ امی سے عمر میں بڑی مگر رشتہ میں چھوٹی۔ گندمی رنگ، گداز جسم، اچھا ناک و نقشہ، تین بچے ہو چکے تھے جن میں سے دو تو فوت ہو گئے تھے۔ اب ایک لڑکی صفو را حیات تھی۔ چچی اماں کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ پورے خاندان کا شجرۂ نسب از بر تھا ہر محفل میں اپنی دل چسپ باتوں اور من گھڑت قصوں سے رنگ جما لیتیں۔ کہتیں یہ سب جدید سائنس کی ایجاد کوئی نئی

بات نہیں پہلے بھی یہی سب کچھ تھا۔ بس اب نام بدل گئے ہیں مثلاً اُڑن کھٹولہ، بس یہی ہوائی جہاز۔۔۔ ان کے والد دادی اماں کے بڑے بھائی حکیم ادریس صاحب مشہور حکیم تھے۔ بھوپال سرکار میں ملازم تھے ان کی حکمت کے کرشمے اکثر سنایا کرتیں۔ ہم نے جب سے انھیں دیکھا پلنگ پر لیٹے رہتے۔ شوہر بندہ بے دام تھے۔ دوائیں پیس کر پلاتے کھانا بھی اکثر خود ہی پکاتے وہ پلنگ سے نہ اُٹھتیں۔ یہی تھیں ہماری چچی۔ منجھلے بھائی نظام الحسن کی بیوی ناظمہ بیگم۔ بہت عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ ان کے ساتھ ایک رومان بھی وابستہ تھا۔ تو میں جو بھی کتاب پڑھتی تھی انھیں اس کا نام معلوم ہو جاتا۔ مرثیوں، میلاد ناموں، سیرت وغیرہ تک تو کوئی بات نہ تھی مگر جب میرے ہاتھ میں الف لیلیٰ اور ناولیں دیکھیں تو ابی تک شکایتیں پہنچائیں کہ کام کے بہانے میں نیچے کھڑی ناولیں پڑھتی ہوں۔ ابی تو حسب عادت سب کچھ سن کر خاموش رہے مگر امی سے ڈانٹ ضرور کھانی پڑی اس طرح مجھے دھوکہ دینا بھی سکھایا کیوں کہ تب تک مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ ناول کسے کہتے ہیں اب انداز ہو گیا تھا۔ تو میں یہ کرتی کہ کسی مرثیے یا نعت کی کتاب کھول کر ناول سمجھی جانے والی کتاب کو اس کے اندر رکھ کر پڑھتی۔ ان کو شاید کچھ شبہ ہو گیا۔ ایک دن انھوں نے چھوٹے چچا سے کہا کہ چپکے سے جا کر دیکھو وہ کیا کتاب پڑھ رہی ہے۔ چھوٹے چچا نے یکا یک آ کر مجھ سے کتاب چھیننا چاہی۔ میں مضبوطی سے سینے سے لگائے اسے پکڑے رہی۔ اسی چھینا جھپٹی میں ہم دالان میں پہنچ گئے اتنے میں بہشتی نے آواز دی۔ چھوٹے چچا نے شاید اس خیال سے کہ میں پرواکرنے کتاب چھوڑ بھاگ جاؤں گی۔ ''اس سے کہا آ جاؤ'' مجھے بھی ضد آ گئی تھی میں اسی طرح کتاب دبائے کھڑے رہی تو وہ لاحول پڑھ کر چلے گئے۔ اب میں یہ کرنے لگی کہ کتاب نکال کر کہیں چھپا دیتی اور رات میں سب کے سونے کے بعد قندیل کی بتی دھیمی کر کے چادر یا رضائی کے اندر سے پڑھتی۔ ابی کبھی بیدار ہو جاتے تو صرف اتنا کہتے کہ اتنی دھیمی روشنی میں مت پڑھو آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ ان کتابوں میں میر مومن اور غالب

کے دیوان تھے اس کے علاوہ چھوٹی تختی کی زعفرانی رنگ کے کاغذ پر سیاہ خوش خط لکھی ہوئی۔ مثنوی مولانا روم، صائب، کلیم، عرفی، نظیری، حزیں، افغانی وغیرہ کے دیوان، سعدی کی گلستان و بوستان بھی۔ مگر فارسی مجھے آتی نہ تھی۔ حسرت سے صرف دیکھتی رہتی۔ حیدرآباد میں آٹھ دس ماہ سے زیادہ رہنا نہ ہوسکا۔ ابیؔ کا تبادلہ بہت دور ایک مقام اجنتہ پر ہوگیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس تبادلہ کے پیچھے دراصل ان کے دوست امین الحسن کا ہاتھ تھا۔ ابیؔ نے راست نواب صاحب سے مستقر چھوڑ کر شہر میں رہنے کی جو اجازت لے لی تھی وہ ان کو ناگوار گذری کیوں کہ قاعدہ کے لحاظ سے اپنی درخواست ان کے ذریعہ سے روانہ کرنی چاہیے تھی۔ اس طرح انھوں نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے تبادلہ کردیا۔ کچھ عرصہ قبل ہی سر علی امام یہاں وزیر ہو کر آئے تھے۔ ابی کے کچھ بہی خواہوں نے انھیں مشورہ دیا کہ اُن سے مل کر سرکارِ عالی میں اپنا تقرر کروالیجیے۔ سر علی امام پر فرنگی محلوں والوں کا بہت اثر تھا اور ابی کا خاندان بھی پشتوں سے فرنگی محل والوں کا مُرید چلا آرہا تھا۔ ابیؔ ذرا بھی کوشش کرتے تو انھیں یقیناً اچھی ملازمت مل سکتی تھی لیکن ان کو ایک تو سفارش وغیرہ کے جھمیلے پسند نہیں تھے دوسرے ان کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ اپنے اتنے دیرینہ دوست سے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انھوں نے سوچا کیا فرق پڑتا ہے یہ اسٹیٹ بھی تو سرکارِ عالی کے مساوی ہے یہاں بھی ترقی پنشن وغیرہ کے سارے قاعدے وہی کچھ ہیں۔ خیر۔ تو اب اجنتہ جانے سے پہلے ابیؔ نے چند ہفتوں کی چھٹی لی اور ہم سب دادا میاں سے ملنے امرچنتہ چلے گئے۔ آپا ایک لڑکے نسیم الحسن کی ماں بن چکی تھیں۔ یہ تھوڑے دن بہت تیزی سے گذر گئے ان سب لوگوں سے بچھڑ کر اتنی دور جانا بہت برا لگ رہا تھا میں تھوڑے دنوں کے لیے کسی سے جدا ہو جاتی تو رونا آجاتا۔ اور اب کی بار تو بہت روئی۔ دادی امّاں سے ہماری یہ ملاقات آخری ثابت ہوئی کیوں کہ اجنتہ کے دوران قیام تقریباً ایک سال بعد ہی ان کے انتقال کی خبر ملی البتہ رضیہ اس وقت اُن ہی کے پاس تھی۔

دائیں سے بائیں حاتم الحسن (حسرت موہانی کے برادر نسبتی)، نظام الحسن (چچا)، اکبر حسن (والد)، سلطان حسن (دادا)، فیض الحسن (چچا)، اکرام الحسن (چچا)، ناصر الحسن (برادر نسبتی حسرت موہانی)، اکرام الحسن کی گود میں باجی جمال النساء

مولانا حسرت موہانی بعمر 25 سال و 75 سال

اجنتہ

اجنتہ ہمیں بہت پسند آیا۔ شہر کے بند مکانوں کی بجائے یہاں ہمیں بہت کھلی فضا نصیب
ہوئی۔ رہنے کو بلندی پر بہت کشادہ بارہ دری نیچے پہاڑوں کے بیچ سے بہتی ہوئی ندی' ورانڈے کے
سامنے کچھ فاصلے پر آبشار کا دل کش نظارہ' چاروں طرف گھنے جنگل' شیروں' بور بچوں اور جنگلی
جانوروں کا مسکن چھلانگیں مارتے ہوئے ہرن اور بارہ سنگے۔ رقص کرتے ہوئے خوش رنگ مور قسم قسم
کے پرندوں کے چہچہے' دُور تک پھیلے ہوئے کپاس کے کھیت' لمحہ لمحہ پُر کیف فطرت سے قربت کا خوش
گوار احساس۔ یہ مرٹھواڑے کا پہاڑی علاقہ تھا منصفی اور تحصیل کے باہم ضم ہو جانے کی وجہ سے دفتر کا
عملہ بھی زیادہ تھا۔ کئی کئی چپراسی ہر وقت پیشی میں حاضر' خزانے کی حفاظت کے لیے چاؤش بھی۔ آئے
دن تیتر بٹیر ہریل' اور خرگوش وغیرہ کا گوشت آیا کرتا تھا۔ گھر کا گھی' مسکہ' دودھ' دہی بالائی وغیرہ وافر
مقدار میں دستیاب تھا اس لیے کہ ابی نے یہاں پہنچتے ہی بھینسیں خرید لی تھیں روزآنہ بیس بائیس لیٹر
دودھ نکلتا۔ ہر روز مسکا نکالا جاتا۔ اور چھانچ جو نکلتی تھی پورے گاؤں میں تقسیم کی جاتی۔ چھوٹے چچا
ساتھ تھے۔ وہ سویرے نماز پڑھنے کو اٹھتے تو ہمیں بھی جگا دیتے رضیہ تو اُن کے ساتھ ہی پابندی سے
نماز پڑھتی تھی اس کے بعد وہ ایک بڑی سی قاب میں بالائی نکال رات کی بچی روٹی لیے ہم بچوں کے
ساتھ بارہ دری کی چھت پر چڑھ جاتے جہاں سے دُور دور تک دکھائی دینے والا منظر بڑا بھلا لگتا تھا۔
صبح کی تازہ اور خنک ہواؤں میں بیٹھ کر بالائی روٹی کا ناشتہ کرتے تھے۔ کبھی چھوٹے چچا کے ساتھ
گھومنے جنگلوں میں نکل جاتے۔ بس فراغت اور بے فکری کے دن تھے۔ ہر کام کے لیے ایک آدمی
ہوتا۔ کوئی صبح صبح آجاتا بستر اُٹھاتا جھاڑو جھٹکا کرتا۔ ایک عورت آتی اور برتن' کپڑے وغیرہ دھو جاتی۔
نائی آتا اور قندیلوں کی چمنیاں صاف کر کے ان میں تیل ڈالتا اور سرِ شام ہی روشن کر کے ان کی مقررہ

جگہوں پر رکھ کر چلا جاتا۔ بس پکانے کا انتظام تھوڑا خود کرنا پڑتا۔ جلد ہی اجنتہ کے غاروں کی سیر کا پروگرام بھی بن گیا۔ تین میل اجنتہ کے پہاڑوں سے اُتر کر فردا پُور نامی ایک چھوٹے گاؤں سے آگے اوپر کو پہاڑی کا چکر کاٹ کر پتلا سا بڑا خطرناک راستہ ہوا کرتا تھا۔ اب تو خیر وہاں بہت اچھا پختہ راستہ بن گیا ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد بسوں کا گذر رہوتا تھا بہر حال ہم اُوپر غاروں تک پہنچ گئے۔ گائیڈ ساتھ تھا۔ اور مسلسل بولے جارہا تھا۔ مگر ہم پہاڑ میں تراشے ستونوں، مجسموں، دیواروں پر بنی رنگین تصویروں اور نقش و نگار کے مسحور کُن نظارے میں محو تھے۔ ان غاروں کی تاریخی اہمیت اور انسانی ہاتھوں کی کاریگری اور فنی خوبیوں کا علم تو بہت بعد میں رفتہ رفتہ ہوا۔ اس وقت وہ ہماری نظر میں ایک مسحور کُن سیرگاہ تھی۔ اس سیر و تفریح اور گھر کے کام کاج کے ساتھ ساتھ یہاں میرے شوقِ مطالعہ کی تکمیل کا بھی کافی سامان تھا تین اخبار آتے تھے ان میں سے کسی کتاب کا اشتہار دیکھ کر پڑھنا چاہتی تو ابّی سے کہتی تو وہ فوراً مطلوبہ کتاب منگوا دیتے "ترکانِ احرار" خالدہ ادیب خانم کی ان سائیڈ انڈیا کا اردو ترجمہ وغیرہ رسالہ "معارف" کی بھی خریدار بن گئی تھی گھر میں گاندھی، نہرو، محمد علی اور حسرت موہانی وغیرہ کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ اخباروں کے باقاعدہ مطالعہ نے نہ صرف میری معلومات میں اضافہ کیا بلکہ میرے شعور و فکر کی تعمیر و تشکیل بھی ہوئی۔ ساتھ ہی میری اپنی ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی بننے لگی ایک عرصے سے امی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ انھیں جلگاوں کے مشن ہاسپٹل میں شریک کروانے کا خیال ہوا تھا لیکن چوں کہ ان دنوں یہ علاقہ برٹش عمل داری کے تحت تھا۔ اور اجنتہ سے ساٹھ میل دور ٹرین کے ذریعہ بھی جایا جاسکتا تھا۔ لیکن ٹرین پکڑنے کے لیے اول تو دس بارہ میل بیل گاڑی پر جاؤ پھر راستے میں دو مقامات پر ٹرین بدلو۔ لہٰذا طے پایا کہ رُکتے رُکتے آرام کرتے بیل گاڑی سے جانا مناسب ہوگا۔ راستے میں جگہ جگہ ڈاک بنگلے بنے ہوئے تھے اس زمانے میں آج کی طرح ڈاک بنگلے افسروں اور عہدہ داروں ہی کے لیے مختص نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہم رات کو ان بنگلوں میں ٹھہرتے آرام

کرتے اور پھر چل پڑتے چوتھے روز جلگاوں پہنچ کر ایک سرائے میں قیام کیا۔ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر بعد سامنے سڑک پر کانگریس پارٹی کا ایک بڑا جلوس گذر رہا تھا بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس میں شریک ہو جاوں۔ ابی ' امی کو ہسپتال میں شریک کروا کر فوراً اپنے مستقر کو لوٹ گئے۔ ہمارے ساتھ چھوٹے چچا رہے ہسپتال میں جو کمرہ ملا تھا اس میں تو صرف ایک پلنگ تھا مگر کمرہ خاصہ بڑا تھا۔ اور سامنے ورانڈا بھی۔ ہم نے فرش پر اپنے بستر لگا لیے چھوٹے چچا نے ورانڈے میں۔ ہسپتال کے منتظمین کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ہسپتال میں ایک مسلم ڈاکٹر بھی تھے جن سے چھوٹے چچا کی جلد ایسی دوستی ہوگئی کہ ہر روز شام وہ دونوں ورانڈے میں بیٹھے دیر تک صرف سیاسی باتیں کرتے رہتے دروازے سے لگی میں غور سے سنتی رہتی۔ یہاں تقریباً ایک ماہ قیام رہا۔ ڈاکٹروں' نرسوں وغیرہ نے بہت توجہ سے علاج کیا۔ امی بالکل تندرست ہوگئیں تو ہم پھر اجنتا لوٹ آئے اس دوران سیاست سے میری دل چسپی بڑھتی گئی جن مشہور لیڈروں کے نام اخباروں میں پڑتی ان کے ساتھ کام کرنے اور ملنے کو دل چاہتا تب ایک ہی خواہش تھی کہ آزادی کی لڑائی میں شریک ہوسکوں۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں یہ معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر غالباً رانچی کی نظر بندی سے چھوٹ کر گھر جاتے جاتے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں اجنتا کے غار بھی دیکھتے ہوئے جائیں گے۔ چھوٹے چچا کچھ دنوں ان کے ساتھ کام کر چکے تھے ان دنوں اختر بھی یہاں آئے تھے ہم دونوں نے مولانا محمد علی سے ملنے کا منصوبہ بنایا چھوٹے چچا ہم کو ان سے ملانے پر آمادہ ہوگئے۔ میں خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتی تھی عیدی کے جمع شدہ پانچ چھ روپے اکٹھا ہو گئے ہم دوپہر کے قریب فردا پور پہنچے۔ محمد علی جوہر صاحب کی بیوی سے مل کر یہ حقیری رقم ان کو نذر کی۔ اتنا یاد ہے کہ انھوں نے بڑے زور سے ''جزاک اللہ'' کہا تھا بات چیت تو یاد نہیں۔ ہاں یہ کہ انھوں نے راست منہ سے شیشی لگا کر کوئی دوا پی تو مجھے بڑی حیرت ہوگئی کہ دوا بھی اتنی آسانی سے پی جاسکتی ہے۔ میرے لیے دوا پینا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ پھر جب انھوں نے

سگریٹ پینا شروع کیا تو ہکا بکا رہ گئی اتنے میں دو پہر کے کھانے کے لیے مولانا محمد علی اندر آئے۔ میں نے چہرے پر نقاب ڈالی۔ نقاب کے اندر سے ان پر ایک نظر پڑتے ہی بے پناہ خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے لیڈر کو قریب سے دیکھ لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ابّا نے بھی ڈھائی تین سو روپے جمع کر کے انھیں پیش کیے تھے خوشی ہوئی اور تعجب بھی کیوں کہ میں سمجھتی تھی اُن کو ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں اچھا چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں کوئی ڈاکٹر تھا نہ دائی۔ امی کو پھر ڈیلیوری ہونے والی تھی اس کے لیے اورنگ آباد جانے کا ارادہ کیا جو غالباً موجودہ مقام سے 60 سے 70 میل کے فاصلہ پر تھا یہاں پہلے نواب صاحب کی بارہ دری میں ہی آکر اترے۔ بارہ دری میں جانے کہاں سے مجھے ایک ضخیم کتاب ''فسانۂ عجائب'' مل گئی تو میں سب سے الگ جھروکے میں بیٹھی اُسے پڑھا کرتی۔ بارہ دری کے احاطہ میں واقع کئی چھوٹے چھوٹے مکان کرائے پر اٹھے ہوئے تھے پچھلے دنوں ایک مکان خالی ہوا اس میں ہم منتقل ہو گئے۔ اس سے ملا ہوا ویسا ہی ایک اور مکان تھا۔ اس مکان کے صحن میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دلی کی رہنے والی ایک خاتون اپنے اکلوتے لڑکے کے ساتھ اس میں رہتی تھیں دوسرے ہی دن سے امی کے پاس آنے لگیں ان کا لڑکا عبدالحق صاحب کی انجمن ترقی اردو میں کام کرتا تھا۔ میرا مطالعہ کا شوق دیکھ کر وہ صاحبہ اپنے لڑکے کے ذریعہ مجھے کتابیں منگوا کر دینے لگیں۔ انھیں پڑھ کر بڑی پابندی سے واپس کر دیا کرتی۔ پھر پتا نہیں دو ایک کتابیں میرے پاس کیسے رہ گئیں۔ ایک تو میرؔ کے بہتّر نشتر اور ایک اسپنسر کا نظریہ تعلیم چھوٹے چچا یہاں بھی ہمارے ساتھ تھے جس روز ہم نے بی بی کا مقبرہ اور پن چکی دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا اسی رات صبح ہوتے ہی ذکیہ کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا۔ دس شعبان ہم کو بڑی مایوسی ہوئی کہ اب ہم نہ جا سکیں گے۔ ان پڑوس والی خاتون نے ہم کو اُداس دیکھ کر کہا تم بچوں کا یہاں کیا کام؟ جاؤ تم لوگ اپنی سیر کو میں ہوں یہاں تمھاری امی کے ساتھ امی نے بھی اجازت دے دی۔ ہم سب خوش خوش اپنا توشہ دوشہ لے کر چھوٹے چچا کے ساتھ نکل پڑے۔ مقبرہ، پن چکی وغیرہ گھوم

گھام کر شام کو واپس ہوئے۔ مجھے برقعہ اُوڑھ کر کہیں جانا اچھا نہیں لگتا تھا اس دفعہ تو خیر میں نے پہن لیا مگر جب دوبارہ امی ابی کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنا تو میں نے کہہ دیا کہ میں برقعہ پہن کر نہیں جاوں گی۔ ابی خاموش رہے۔ امی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ چھوٹے چچا نے میرا ساتھ دیا اور میں اس دن بغیر برقعہ کے بہت گھومی۔ اورنگ آباد کے قیام کے دوران ابی کے دوست خلیل اللہ صاحب کے گھرانے سے ملاقات ہوئی۔ اختر کو انھیں کے پاس پڑھائی کے لیے رکھا گیا تھا ان کے گھر والے بھی ہم سے ملنے آیا کرتے پھوپا میاں اس وقت بسمت میں مقیم تھے ہمیشہ کی طرح رمضان میں امرچنہ جاتے ہوئے وہ چند روز کے لیے ہم سب سے ملنے اورنگ آباد آئے رضیہ کو اپنی پڑھائی جاری نہ رہنے کا بہت افسوس تھا۔ اس نے ضد کی کہ دادا میاں کے پاس پڑھنے جاوں گی ابی نے ان کے ساتھ بھیج دیا اس وقت وہ صرف آٹھ سال کی تھی ہم لوگ تین چار مہینے اورنگ آباد رہ کر کہ اجنتا واپس آگئے یہاں بارہ دری کی کچھ مرمت ہو رہی تھی ابی گاؤں میں ایک گھر کرایہ پر لے لیا۔ یہ کسی قاضی صاحب کا دو منزلہ گھر تھا ان کے لڑکے دوسرے مکان میں رہتے تھے یہ گھر یوں تو عام مکانوں کی طرح تھا بس ایک خاص بات یہ تھی کہ کمروں اور دالانوں کی دیواروں میں الماریاں بنی ہوئی تھیں جو کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ اوپر کے بڑے سے کمرے میں بھی صندوق کتابوں سے بھرے پڑے ہوئے تھے نیچے الماریوں میں تو قفل لگے ہوئے تھے مگر اوپر کے سب صندوق کھلے پڑے تھے یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ میں نے سارے ذخیرے کو چھان ڈالا اردو کی صرف تین کتابیں ملیں۔ نذیر احمد کی مراۃ العروس ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۃ الفاتحہ اور بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ۔ یہیں ہم کو اپنی پیاری دادی اماں کے انتقال کی خبر ملی۔ چند دنوں بعد ہم اس گھر سے سرائے میں منتقل ہو گئے۔ یہ دو سو سال پرانی پتھر سے بنی بہت بڑی قلعہ نما عمارت تھی آمنے سامنے دو آہنی پھاٹک درمیان میں بڑا سا احاطہ اس کے گرد تقریباً پانچ پانچ گز چوکور آمنے سامنے دوہرے کمرے یعنی آگے پیچھے کمروں میں

کھڑکیاں بھی یہاں سے دیکھا تو کافی نشیب میں دور دور تک کھیت ہی کھیت نظر آئے۔ ان کمروں کے سامنے کوئی ڈھائی تین گز کا چوڑا سا چبوترا۔ یہ کمرے کرایہ پر اٹھے ہوئے تھے لوگوں نے چبوترے کے سامنے کچی دیواریں بنا کر گھر کی سی شکل دے رکھی تھی اسی طرح کے تین کمروں والے ایک گھر میں ہم رہنے لگے ان میں ایک پیچھے کے کمرے میں کھڑکی تھی اور دوسرے میں سے اوپر جانے کا زینہ احاطہ کے بیچوں بیچ ایک باولی اور ایک مسجد بھی تھی۔ گھاٹ پر چڑھائی ختم کر کے پھاٹک سے اندر داخل ہو کر مقابل کے پھاٹک سے نکل کر گاؤں میں داخل ہو سکتے تھے پہلے پھاٹک پر اورنگ زیب کے آنے کی تاریخ بھی کھدی ہوئی تھی جہاں تک مجھے یاد ہے یہ جملہ نوے کمرے تھے بازو کے دو کمرے والے مکان میں پولیس کے امین صاحب اپنی بیوی کے ساتھ جو بالکل لڑکی جیسی لگتی تھیں مقیم تھے گنیل سے تبادلہ ہو کر آئے تھے ان کے گھر سے بھی اوپر چھت پر آنے کا زینہ تھا چھت بھی چاروں طرف سے اونچی سنگین دیواروں سے گھری ہوئی تھی جس میں قلعہ کی دیواروں کی طرح سوراخ بنے ہوئے تھے اوپر چھت پر شاید ہی کوئی جاتا ہو کیوں کہ مجھے وہاں کبھی کوئی نظر نہیں آیا۔ میں روز ہی جاتی تھی وہاں ایک دن امین صاحب کی نوجوان بیوی سے ملاقات ہو گئی وہ مجھ سے کچھ ہی بڑی رہی ہوں گی ہم دونوں میں جلد ہی دوستی ہو گئی اوپر چھت پر ہی ہم دونوں روز ملتے اور دیر تک نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے البتہ اتنا یاد ہے کہ وہ جُوڑا باندھتی تو میں بھی جوڑا باندھنے لگی چھت پر لنگور بھی بہت گھوما کرتے تھے ہم ان سے مانوس ہو گئے تھے لیکن ایک دن ایک بڑا لنگور غرّا کر ڈرانے لگا۔ جب وہ ہماری طرف بڑھنے لگا تو مجبوراً قریبی زینے سے نیچے اترنا پڑا یہ ان امین صاحب کا گھر تھا۔ جہاں ایک ادھیڑ عمر کی مسلمان عورت گھر کا کام کر رہی تھی امین صاحب برہمن تھے مجھے تعجب ہوا انسپکٹر صاحب کی بیوی نے بتایا کہ ان کے والدین نے گنیل سے آئے وقت اس عورت کو ساتھ کر دیا تھا بہت عرصے سے ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ سارا کام یہ کر لیتی ہے میں صرف کھانا پکاتی ہوں......

دادی اماں کے انتقال کے دو تین ماہ بعد ابیّ نے اپنے باپ بہن بھائی سب کو اجنتا آنے کی دعوت دی اپنے کمرے سے ملے دو کمرے اور لے لیے تاکہ سب آرام سے رہ سکیں سبھی لوگ آ گئے تھوڑے دنوں بہت چہل پہل رہی مگر ہمیشہ کی طرح اعتراضات اور نکتہ چینی بھی باز ور والی صاحب سے میرا اتنا زیادہ ملنا جلنا ناپسند تھا مگر میں اسی طرح ملتی رہتی کچھ دنوں بعد انسپکٹر صاحب کا تبادلہ پھر گیل ہو گیا۔ وہ لوگ بہت سویرے روانہ ہونے والے تھے میں اپنی دوست کو خدا حافظ کہنے بہت سویرے اوپر گئی اس پر کہا گیا کہ نماز کے لیے تو سویرے اٹھا نہیں جاتا وغیرہ۔ رضیہ بھی امر چنتہ سے ان سب لوگوں کے ساتھ واپس آئی مگر اب وہ پہلی جیسی ہنستی کھیلتی نقلیں اُتارنے والی باتونی رضیہ نہ تھی چپ چُپ سی بے حد سنجیدہ دادی امّاں اُسے بہت چاہتی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ چھوٹی سی عمر میں اپنی نظروں کے سامنے ان کے سانحہ ارتحال کا اس پر بہت اثر ہوا تھا۔ دادی امّاں نے جو گویا بنا کر دی تھی وہ اسے بہت عزیز تھی مجھ سے اس کے لیے نئے نئے کپڑے سلواتی اور بہت بنا سنوار کر رکھا کرتی۔ سلائی کی مشین بہت پہلے آ گئی تھی۔ ابیّ اور ہم سب کے کپڑے امیّ گھر ہی میں سی لیا کرتیں میں نے بھی کبھی کپڑے قطع کرنا اور سینا سیکھ لیا تھا اورنگ آباد میں بارہ دری کے احاطہ میں ہی ایک پارسی خاندان رہتا تھا ان کی بڑی لڑکی نرگس کوئی ڈھائی تین برس کی ذکیہ کی ہم عمر کھیلنے آتی رہتی تھی اس کے کپڑے دیکھ کر میں نے ذکیہ کے لیے فراکیں سینا شروع کر دیں تھیں۔ سلیم چچا کے آنے کی وجہ سے مجھے کتابیں پڑھنے کو ملنے لگیں وہ نہ جانے کہاں کہاں سے کتابیں اُٹھا لاتے خود پڑھتے اور مجھے بھی دیتے پتا نہیں کیا ہوا کہ آپا نے واپسی کا تقاضہ شروع کیا امیّ نے بہت سمجھایا کہ پورے دن میں اتنا لمبا سفر مناسب نہیں مگر وہ نہ مانیں آخر واپسی کی تاریخ مقرر ہو گئی ابیّ ان سب کے ساتھ منماڑ اسٹیشن تک جانا طے کیا کہ وہاں گاڑی بدلا کر واپس ہو جائیں گے پاچورہ پر دوسری ٹرین کے انتظار میں چار گھنٹے ٹھہرنا پڑتا تھا یہاں کچھ دیر کے بعد آپا کی طبیعت بگڑنے لگی تو ابیّ نے فوراً انھیں جلگاؤں لے جانے کا فیصلہ کیا اُدھر

جانے والی گاڑی کچھ دیر میں ہی آنے والی تھی وہاں پہنچ کر سیدھے اسی مشن ہاسپٹل میں پہنچے جہاں پہلے امی کو رکھا گیا تھا۔ چند گھنٹوں بعد ہی آپا کے یہاں دوسرے فرزند دنیا میں تشریف لائے یوں سب کو بہ خیریت وہاں پہنچا اور ٹھہرا کر ابی واپس آئے۔ اب ہمارا اصرار کہ بچے کو دیکھنے جلگاؤں جائیں گے کتنے اچھے تھے ہمارے ابی یہ خواہش بھی پوری کر دی ہم سب نے وہاں جا کر سب سے پہلے نومولود کو دیکھا۔ اور پھر وہ لوگ حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور ہم واپس اجنتا آ گئے چچی امّاں، چچا میاں اور چھوٹے چچا ابھی ہمارے ساتھ ہی تھے چچی اماں جس کمرے میں رہتی تھیں انھوں نے بتایا کہ ایک مخصوص گز بھر کی چوکور جگہ پر زور سے پاؤں مارو تو چھن چھن کی آواز آتی ہے یقیناً وہاں خزانہ ہوگا ہم سب نے پیر پٹکے واقعی چھن چھن کی آواز تو سنائی دیتی تھی شوق ہوا کہ اس جگہ کو کھود کر دیکھا جائے چچا میاں نے ہمارا ساتھ دیا اور ایک دن ہم نے چپکے چپکے کوئی ہاتھ بھر کھدائی کی تو نیچے گز بھر چوکور جگہ پر برابر سے کافی موٹی گول گول لکڑیاں بچھی نظر آئیں جو اتنی خستہ تھیں کہ ہاتھ لگاتے ہی چورہ ہو جاتیں۔ اب اور یقین ہوا کہ ضرور خزانہ ہوگا نشانی کے طور پر ہی یہ لکڑیاں رکھی گئی ہوں گی بہت احتیاط سے انھیں نکال کر پھر کھدائی شروع کی لیکن اب گچی سے جُڑے ہوئے پتھر تھے جن کا کھودنا کافی مشکل لگ رہا تھا ایک چھوٹے چچا نے مُوہان جانے کا ارادہ کیا چچی اماں برسوں سے اپنی امّاں سے نہیں ملی تھیں وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ اختر آئے ہوئے تھے چھوٹے چچا نے ابی سے یہ کہہ کر اختر کو وہاں ندوے میں شریک کرا دیں گے اپنے ساتھ لے لیا اور تین چار دن کے اندر ہی وہ لوگ مُوہان کے لیے راوانہ ہو گئے اب کھدائی کا سوال ہی کیا تھا لہذا گڑھا بھر دیا گیا کہ جب چھوٹے چچا آئیں گے تب دیکھا جائے گا تین ماہ بعد دادا میاں کی بیماری کی خبر ملی ابی نے دو ماہ کی رخصت لی اور ہم سب تھوڑے سے ضروری سامان کے ساتھ امرچنہ پہنچ گئے۔ اجنتا میں ایک پٹیل سردار خاں نامی بہت شریف اور ابی کی بہت عزت کرنے والے فرد تھے ابی کو بھی ان پر بہت اعتماد تھا تو بقیہ سارا

سامان جس میں ابی کی لکھی ہوئی ناول کا مسودہ جوانھوں نے کلیانی کے زمانے قیام میں لکھی تھی۔ اور میں نے پڑھی بھی تھی جس کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ انھوں نے شکار سے واپس ہوتے ہوئے کسی غارت گر ہوش کو دیکھ کر گھوڑے سے گرنے کا واقعہ بیان کیا تھا۔ یہ مسودۂ بیاض قاضی صاحب کے گھر سے ملی کتابیں اجنتا غار سے چرائی ہوئی مورتی بھی کچھ سامان وغیرہ ان کے یہاں رکھوادیا تھا۔ حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ پھر واپس جانا ہی نہ ہوا کچھ ماہ بعد ان صاحب نے وہاں چھوڑا ہوا سامان برتن بھانڈے وغیرہ سب لا کر دیے لیکن کتابیں اور مورتی وغیرہ کی شاید ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی انھیں نہیں لائے۔ یوں ہم اس قیمتی سرمایہ سے محروم ہوگئے۔ دادامیاں کے پاؤں میں نارو ہوگیا تھا یہ موذی بیماری امرچنتہ میں عام تھی جو غالبًا پانی کی خرابی سے ہوتی ہے ابیّ علاج کے لیے حیدرآباد لائے پھوپھی اماں کے ساتھ آپا وغیرہ بھی ایک دن ابی کی عدم موجودگی میں امین الحسن صاحب عیادت کو آئے اور انھیں ہاسپٹل میں شریک کروادیا۔ ابیّ جراح کا علاج کروانا چاہتے تھے لیکن اب خاموش رہ گئے ہاسپٹل میں اس وقت کے کوئی مشہور سرجن خورشید حسین صاحب نے ان کا آپریشن کیا جس میں ایک رگ کاٹ دی جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے معذور ہوگئے۔ ابیّ کو رخصت بڑھانی پڑی کچھ دنوں بعد چھوٹے چچا بھی اختر اور اپنی بیوی کے ساتھ موہان سے واپس آگئے کیوں کہ ان کے خسر کا انتقال ہو چکا تھا اختر ایک سال ضائع کر کے ویسے کے ویسے ہی واپس۔ چھوٹے چچا وہاں جاتے ہی بیمار پڑ گئے تھے اور حسرت چچا نے ندوے میں داخلہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا تمھارے یہاں کالج اور یونیورسٹی ہے وہیں پڑھاؤ رلجہ صاحب کو منصف صاحب کی بیماری کا علم ہوا تو وہ دیکھنے چلے آئے اور یہ جان کر کہ وہ اب کام نہ کر پائیں گے بہت افسوس کرتے ہوئے ابیّ سے ان کی جگہ کام کرنے پر اصرار کیا ابیّ نے اس پیش کش کو قبول کرلیا اور پہلی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا آمدنی اور ترقی کے پیش نظر یہ اقدام فائدہ بخش نہ تھا مگر دوسرے بہت سارے مسائل

تھے شہر سے قریب اور معذور باپ کے ساتھ رہنا زیادہ مناسب معلوم ہوا سب سے بڑا مسئلہ تو اختر کی
تعلیم کا تھا کافی وقت ضائع ہو چکا تھا انھوں نے اشرف علی صاحب کے قائم کیے ہوئے ایک مڈل
اسکول میں جس میں رہائش کا بھی انتظام تھا شریک کروادیا۔ یہ اشرف علی صاحب سنا بچوں کو بہت
مارتے تھے اختر کو اس بات پر ناز تھا کہ دو سال اپنے دورانِ قیام میں انھوں نے کبھی انکی مار نہیں کھائی
اب ہم دادامیاں کے ساتھ تھے یوں مجھے اپنے فارسی سیکھنے کے شوق کو پورا کرنے کا موقع ملا رضیہ نے
بھی ان سے فارسی پڑھنا شروع کردی۔ میں نے معارف کو بند کردیا تھا اب سلیم چچا کے مشورہ سے
نگار کی خریدار بن گئی سن 28ء سے 47ء تک مستقل طور پر خریدار رہی نہ صرف میرے بلکہ سبھی بھائی
بہنوں کی فکری تربیت و تعمیر میں اس رسالہ نیاز فتح پوری کی نگارشات کا بہت حصہ ہے بعد میں ان کی
تقریباً سب ہی تحریریں حتیٰ کہ "فراستِ الید" تک خرید لیں اجنتا ہی میں تحریک آزادی سے متاثر ہو کر
اور تو کچھ نہ کرسکتی تھی۔ بس سودیشی پہننے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ ابیؔ سے کہا تو انھوں نے مخالفت نہیں کی
حالاں کہ وہ بہت نفاست پسند اور نفیس کپڑے پہننے کے عادی تھے ان کو میرے لیے سودیشی کپڑے کی
تلاش میں کافی دقت ہوئی تھی میں اب تقریباً سولہ سال کی ہو رہی تھی تو امّی ابیؔ سے زیادہ چچی پھوپھی
وغیرہ کو مجھے جلد سے جلد گھر سے نکالنے کی فکر تھی میرے لیے شادی کا تصور بھی سوہانِ روح تھا۔ میرا اپنا
ایک ذہن بن چکا تھا کچھ مخصوص تصورات اور عزائم تھے ملک کی آزادی کے لیے کام کرنے کی خواہش
دل میں جڑ پکڑ چکی تھی اس کے لیے ہر طرح کی سختیاں جھیلنے کو تیار زندگی بھر کے ساتھی کا موہوم سا تصور
کسی شاعر، ادیب، مجاہد آزادی جیسا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہاں تو صرف گھر کی چار
دیواری تھی نہ کوئی رہبر نہ کوئی ہمدرد سوائے کتابوں کے امّی ابی کو ایسی جلدی نہ تھی ابیؔ کہتے تھے کہ
اٹھارہ بیس سال سے پہلے لڑکی کی شادی نہیں کرنی چاہیے اور جو شرطیں انھوں نے لگا رکھی تھیں ان کا
مجھے علم تھا کہ عزیزوں میں نہیں کریں گے لین دین کی بات کرنے والوں کو منہ نہیں لگائیں گے لڑکا کم

سے کم گریجویٹ اور برسرِ روزگار ہو خالص دکنی بھی نہیں سیّد' شیخ وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ شہر میں رہنے والے ہمارے بہی خواہ رشتہ داروں نے کئی پیام بھجوائے۔ ایک صاحب کی تو بے انتہا تعریف لکھی کہ گو کہ صرف میٹرک پاس ہیں مگر ملازمت اچھی' خاندان بھی اچھا' نمازی' پرہیز گار لوگ ہیں ابّی کو داڑھی والوں سے چڑھ تھی سو یہ بات بھی رد ہو گئی۔ آخر سب خیر خواہ تھک ہار کر خاموش ہو گئے ابّی دادا میاں کی جگہ کام کر رہے تھے چچا میاں اور چچی اماں شہر میں رہ رہے تھے تقریباً سال بھر بعد پھوپھی اماں اور آپا وغیرہ بھی پھوپھا میاں کے پاس چلے گئے۔ چھوٹی چچی کو ہم نے پہلی بار دیکھا تھا گورا رنگ' چھوٹا سا قد' بڑی بڑی مگر پھٹی پھٹی سی آنکھیں' سیدھی سادھی ہنس مکھ بچے کئی ایک ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔ چوتھے بھائی مظہر کی پیدائش کے سلسلے میں ہم کو حیدرآباد جانا پڑا۔ چھوٹے چچا ساتھ تھے۔ اب مع بیوی وہ شہر ہی میں رہ گئے انھوں نے تھوڑے سے سرمائے سے تجارت شروع کی کیوں کہ نوکری کو وہ غلامی سمجھتے تھے۔ بمبئی سے چھوٹی چھوٹی خوب صورت چیزیں لاتے۔ ان کا سارا تجارتی سامان بس ایک ہینڈ بیگ میں سما جاتا۔ اور بہت تیزی سے فروخت ہو جاتا۔ سنجیدگی سے کام کرتے تو خاصہ کما سکتے تھے۔ مگر ایک تو سدا کے لاابالی دوسرے اکثر لوگوں کو اِمروز و فردا کے وعدہ پر ادھار دیا کرتے بعد میں کبھی کوئی دینے آجاتا تو یہ اس سے پیسے لیتے شرماتے تھے کہتے جلدی کیا ہے رہنے دیجیے کبھی لے لیں گے۔ بس ایسی تھی ان کی تجارت! اس سے بہ مشکل گذر بسر ہو جاتی۔ دادا میاں سے فارسی تو ہم تقریباً پڑھ ہی چکے تھے رضیہ اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ عربی بھی پڑھ لی جائے دادا میاں سے جو عربی کے عالم تھے ہم نے خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے ہماری ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اک شعر پڑھ دیا۔

عُرفیاں را مغز باید چُوں سگاں نحویاں را مغز باید چوں شہاں

شعر کے ردعمل سے قطع نظر ہم نے دادا میاں سے اصرار کیا بڑے اصرار کے بعد آمادہ ہو گئے۔ ستّر کے قریب ہو رہے تھے مگر یادداشت اتنی اچھی کہ ہمیں زبانی لکھوا لکھوا کر پوری کتاب ''میزان'' پڑھا دی۔

اور جب شہر سے کتاب آئی تو حرف بہ حرف ویسی ہی تھی جیسے لکھوایا تھا۔ عربی زبان ادق ہوتی ہے اس میں رٹنا بہت پڑتا ہے۔ بہر حال میزان منشعب زبدہ صرف میر وغیرہ کتابیں تو ہم نے پڑھ ہی لیں۔ اب وہ نحو شروع کرنے والے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یوں ہی محنت کروگے تو سال بھر کے اندر اتنی عربی آجائے گی کہ قرآن پڑھ کر سمجھ سکوگی۔ (فہم قرآن ہماری بہت بڑی خواہش تھی) مگر افسوس کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ دادا میاں کا پڑھانا بہت اچھا لگتا۔ جی چاہتا بس پڑھتے ہی رہیں۔ وہ سبق کے دوران کتنے ہی مزاحیہ دلچسپ قصے واقعات، لطیفے وغیرہ سناتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا پھر بھی اب تک کتنے ہی یاد ہیں۔ ایک بہت اچھا لگا تھا تو آپ بھی سن لیجئے۔

ایک بادشاہ تھا باغ میں تفریح کرتے اور بلبل کو مسلسل چہچہاتے سن کر جہاں پناہ کے دل میں دو تین سوال آگئے۔ چنانچہ عالیجناب نے یوں گوہر افشانی کی،

"بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرو؟" دوسرا مصرعہ نہ کہہ سکے۔

جواب کی زحمت اوروں کو دی۔ بہتوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ انہیں اپنے سوالات کا جواب نہ ملنا برا لگا سوچا پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ایک لاکھ کا ڈھیر لگا کر اعلان کرایا کہ جو ٹھیک جواب دے گا یہ اُس کی نذر۔

ایک دن کوئی پھٹے حالوں صاحب آکر رقم سمیٹنے لگے۔ سوال ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ رقم سمیٹنے والے صاحب نے بڑی بے پرواہی سے کہا،

"اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں"

"بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرو؟"

عالی جاہ قائل ہوگئے کہ ہاں اس کا جواب تو غالباً باغباں ہی دے سکتا ہے۔ لیکن کون باعزت شخص ایسے معمولی انسان سے کچھ پوچھ سکتا ہے، لہٰذا وہ رقم تو لے جانے دی اور اپنے سوالوں کا

جواب نہ ملنے پر صبر کرلیا۔ اور یوں یہ سوالات اب تک بلا جواب ہی ہیں۔

بیٹی کے مسلسل اصرار پر وہ چھوٹے چچا کے ساتھ بسمت چلے گئے۔ اب صرف سلیم چچا ہمارے ساتھ رہ گئے۔ رضیہ ان سے حساب اور ابتدائی انگریزی سیکھتی رہی۔ امر چنتہ بڑا اسمستان تھا۔ وہاں منصفی کے علاوہ تحصیل داری اور تعلقہ داری بھی تھی۔ نئے تحصیل دار آئے تھے تو ان کے ساتھ ان کے داماد بھی تھے۔ سلیم چچا سے ان کی بہت دوستی ہوگئی پھر کیا تھا مجھے پڑھنے کو ڈھیر ساری کتابیں ملنے لگیں۔ تحصیل دار اور ان کی بیوی سے امی کی دوستی بھی خوب ہوگئی دونوں کا آپس میں آنا جانا ہو گیا ان کی چھوٹی لڑکی تقریباً میری ہم عمر تھی میں نے کوشش کی مگر ان سے میل جول نہ بڑھا سکی انھیں زیور اور کپڑوں کا شوق تھا ہر ایک پر نکتہ چینی اس طرح کی باتیں اُن کا مزاج تھا۔ اور میں ٹھہری موٹا جھوٹا سودیشی پہننے والی............خیر..........!

چمن لگانے کا ہمارا شوق ختم نہ ہوا۔ صحن اگر چہ کہ بہت بڑا تھا اس میں مرغیاں بھی تھیں لہٰذا بانس کی جعفری سے ایک چوکور حصّہ گھیر کر ہم نے چمن لگایا۔ دیوار پر گُل چاندنی اور جعفری پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھائیں۔ موتیا' موگرا' گُل مہندی وغیرہ ایک کیاری میں۔ رات کی رانی اور دن کا راجا بھی۔ چمن کا نام ہم نے گُل فشاں رکھ دیا۔ اپنی دانست میں اس کی تاریخ بھی کہی۔ تاریخ کیسے کہی سُن لیں۔ اور بتائیں کہ اس میں تاریخ کہاں نکلتی ہے؟ ۔

یکے گُلشن بنا کر دم بنام گلفشاں نمی دانم چہ میگویم بہار زاں گُلستاں

بخواہم تا بگویم حرفے از تاریخ آں کہ تکمیلِ ایں گلشن بہ ماہ پاکِ زماں

دادا میاں کو یہ قطعہ تاریخ سُنایا تو وہ ہنس کر چپ ہوگئے۔ جب اختر آئے تو ہم نے اُن سے جلی حروف میں تختی پر لکھوا کر بڑی شان سے درِ چمن پر آویزاں کر دی۔ اب ہنسی آتی ہے اس بات کو یاد کر کے اس قطعہ میں تاریخ کہاں تھی۔ دادا میاں کے جانے کے کچھ عرصے بعد سلیم چچا نے محبوب

نگر جا کر وکالت شروع کر دی۔ گھنٹے بھر کا راستہ ہی تو تھا ایک دو دن کی چھٹی ہوتی تو آ جاتے۔
تمدّنِ عرب' تمدن ہند جیسی موٹی موٹی کتابیں اور سفرنامے وغیرہ کتنی ہی چیزیں ان کے ذریعہ پڑھنے کو ملتی رہیں۔ بہت ہی پُر سکون زندگی گذر رہی تھی کہ ایک دن معلوم ہوا کہ راجا صاحب کے ماموں کا قتل ہو گیا غالباً کچھ آپسی جھگڑے تھے۔ ابتدائی تحقیقات مقامی عدالت ہی میں ہوتی۔ راجا صاحب نے کئی ذرائع سے مجسٹریٹ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی بڑی سی رقم کی پیش کش بھی کی۔ مگر ابّی نے انکار کر دیا۔ اور ہر پیش کش کو مسترد کر دیا۔ راجا صاحب ناراض ہو گئے اور ان کی برطرفی کا حکم دے ڈالا۔ ابّی کے تقریباً سبھی اعلیٰ حکام سے روابط تھے۔ انھوں نے حقائق سے حکام کو واقف کروایا وہ صرف انصاف کے خواہاں تھے معاملہ وزیر اعلیٰ کشن پرشاد تک پہنچا۔ انھوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ راجا کو اپنے کسی ملازم کو خدمت سے برطرف کرنے کا حق تو ہے مگر بلا نوٹس ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم سال بھر کی مہلت دی جانی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ملازمت سے ہٹانا ہو تو سال بھر کا نوٹس دیا جائے یا سال بھر کا مشاہرہ یک مشت دیا جائے۔ راجا صاحب نے دوسری شرط قبول کر کے یکمشت رقم دے کر ابّی کو نوکری سے برخواست کر دیا۔ یہاں ابّی کو کام کرتے تین ساڑھے تین سال ہوئے مگر امرچنتہ سے ہمارا تعلق چودہ سال کا رہا تھا یہاں ہم نے زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔ اس جگہ کو چھوڑتے ہوئے دکھ تو ہوا مگر اب یہاں وہ پہلی ہما ہمی نہیں رہی تھی۔ کنبے کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ دادا میاں بیٹی کے پاس' چھوٹے چچا اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں اور سلیم چچا بھی بالآخر اپنی بیوی بچوں کے پاس بسمت چلے گئے۔ امرچنتہ کے قیام کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ لکھنا رہ گیا تھا۔ وہ بھی سُن لیں۔ .... یہاں اس گھر میں جو باولی تھی اس کا پانی قدرے نمکین تھا اور گرمیوں میں کم ہو جاتا تھا۔ پانی کی خاطر اسے تین چار بار گہرا کیا گیا تھا۔ وہاں ہمارے رہنے کے ایک سال بعد ہمیں ایسی ہی ضرورت در پیش ہوئی تو اس کے بعد جو کھدوائی

ہوئی۔اس سے نکلی ہوئی مٹی ایک چبوترے پر ڈال دی گئی تھی یہ کافی کالی کمزور سے سنگریزوں کی شکل میں تھی جسے توڑا جاتا تو اس کے بیچ سے سنہرے سنہرے ذرّے نکل آتے۔امّی نے دیکھا تو کہا یہ سونے کے ذرّے ہیں۔میں رائچور کی سونے کی کان کے ایسے پتھر دیکھ چکی ہوں لیکن سبھوں نے امّی کا مذاق اڑایا۔بات تو ختم ہوگئی لیکن تقریباً تین سال بعد تک اس چبوترے پر مٹی کے وہ سنہرے سنگریزے چمکتے نظر آتے رہے۔ان تین سالوں میں پھر سے کھدوانے کی ضرورت اس لیے نہ ہوئی کہ باولی میں خاصہ پانی جمع ہوگیا تھا خیر تو اب ہم نے ایک تختی پر جلی حروف میں یہ شعر لکھ کر سامنے کی دیوار پر آویزاں کردیا۔

بلبل نے آشیاں کو چمن سے اُٹھا لیا اس کی بلا سے بوُم رہے یا ہُما رہے

اس کے بعد ہم شہر لوٹ آئے۔سنا کہ نئے آنے والے مجسٹریٹ صاحب اس شعر کو دیکھ کر بہت بگڑے تھے دس بارہ سال بعد اتفاقاً امرچنتہ جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ ہمارے بعد اس گھر میں کوئی نہیں رہا گھر کھنڈر بن چکا تھا۔

امرچنتہ سے واپسی کے بعد

ابّی کوئی آٹھ نو مہینے بے کار رہے میں اٹھارہ سال کی ہو رہی تھی اب تو ابّی کو بھی ذرا میری فکر سی ہونے لگی تھی مجھے نہ تو زیور اور کپڑوں کی خواہش اور نہ گھر بسانے کا شوق۔میرے نہاں خانۂ دل میں آزادیٔ وطن کے لیے کام کرنے کی جو تمنا تھی وہ بڑھتی جا رہی تھی شریکِ زندگی کا جو تصور تھا وہی پرانا یعنی شاعر ادیب اور مجاہد آزادی والا۔جنگِ آزادی میں جان دینے کے لیے تیار قدم سے قدم ملا کر راستہ طے کریں گے ایسا کچھ سوچ رکھا تھا۔مگر اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔رشتے بہت آئے مگر ابّی کی شرطوں پر پورا اُترنا مشکل تھا۔آخر کار ایک ایسا رشتہ بھی

آ گیا جوان کی ساری شرطوں پر پورا اُترتا تھا۔ ابّی نے بالواسطہ میری رائے بھی جاننی چاہی۔ مگر جسے نہ کبھی دیکھا نہ کوئی واقفیت ہو بھلا ایسے کے بارے میں کیا رائے دے سکتی۔ اتنی ہمت نہ ہوئی کہ انکار کر دیتی کیوں کہ جانتی تھی کہ آج نہیں تو کل ہونا تو یہی ہے۔ پھر ابّی کو پریشان کرنے سے حاصل بھی کیا بہر طور پر میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ابّی کا ہاتھ بالکل خالی تھا وہ کوشش میں تھے کہ کہیں کام مل جائے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں ابّی کو خانخانان اسٹیٹ پری تال میں مجسٹریٹ و تحصیل دار کی مشترکہ منصرمانہ ملازمت مل گئی۔ یہ مقام آندھرا میں بجواڑہ سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر تھا جو بہت گرم اور سیاہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا۔ نہ درخت نہ سبزہ، لوگ بھی سیاہ فام تلگو بولنے والے۔ یہاں ہیرے کی کانیں تھیں۔ برٹش حکومت نے انھیں ٹھیکے پر لیا تھا۔ ٹھیکہ کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ یہ کوری کہلاتی تھیں، کانوں میں پانی بھر گیا تھا، پینے کے لیے وہیں کا پانی استعمال ہوتا تھا۔ ان کے کنارے خاص کر گرما میں پانی کم ہونے پر چھوٹے چھوٹے بہت سارے پتھر نظر آنے لگتے تھے۔ اوپر سے میلے میلے مگر انھیں توڑو تو اندر سے بہت چمک دار۔ ایک دفعہ بھائی انور چپراسی کے ساتھ وہاں سے بہت سارے پتھر لے آئے ہم نے سنا تھا کہ یہاں کئی لوگوں کو ان ہی پتھروں میں ہیرے بھی مل چکے ہیں۔ ان پتھروں میں ایک پتھر ایسا بھی نظر آیا اگر ہتھیلی پر رکھ کر روشنی کے سامنے لاؤ تو شعاعیں سی نکلتی نظر آتیں۔ یقین ہو گیا کہ ضرور یہ ہیرا ہی ہے مگر تصدیق کیسے ہو۔ سنا تھا کہ ہیرا کھانے سے موت ہو جاتی ہے لہٰذا ہم نے اس پتھر کو کوٹ کر آٹے میں ملا کر گولیاں بنائیں اور صحن میں بکھیر دیں کچھ دیر بعد جب بہت سارے کوّے کائیں کائیں کا شور مچانے لگے تو یقین ہو گیا کہ یہ ہیرا تھا۔ جسے کھا کر کوّا مر گیا ہو گا تبھی تو اتنا شور ہو رہا ہے، اس گاؤں کے چاروں طرف ندیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ کرشنا، گوداوری کے چوڑے چوڑے پاٹ اور ان میں بادبانی کشتیاں تیرتی ہوئی۔ یہاں کی سربرآوردہ شخصیتوں میں شاستری صاحب پکارے جانے والے ایک فرد تھے۔ ایک بار انھوں نے قریب ہی کسی قابلِ دید مقام

کا نام بتایا اور یہ کہ کشتی کے ذریعہ اس مقام تک دو گھنٹوں میں رسائی ممکن ہے۔

کھودا پہاڑ نکلا چوہا

شاستری صاحب کی باتوں کو سُن کر ہمیں اس مقام کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ دفتر میں دو بادبانی کشتیاں بھی تھیں وہ نکلوائی گئیں ابی امّی پانی سے گھبراتے لیکن ہمارے شوق کو دیکھ کر آمادہ ہو گئے۔ شاستری صاحب نے پتہ وغیرہ بتا کر کہا میں پہلے سے وہاں جا کر کھانے کا انتظام کروا دیتا ہوں اور پھر ہم سب بہت سویرے ان کشتیوں پر روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ نو بجنے تک پہنچ جائیں گے مگر اب ایسا لگتا چلے ہی جا رہے ہیں آٹھ نو دس گیارہ نہ آبادی نہ کوئی کنارہ۔ دو بجنے کے قریب ایک جگہ کنارہ نظر آیا اور ہم اُتر گئے۔ یہاں چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک دیہات تھا۔ یہاں تھوڑے موٹے چاول اور تھوڑا سا دودھ دستیاب ہو گیا ہانڈی میں چاول اُبالے گئے چھوٹا بھائی قمر حسن سات آٹھ ماہ کا تھا۔ اس کے لیے دودھ کے ساتھ شکر بھی رکھ لی گئی تھی تو یہ چاول دودھ میں ڈال کر بھوک مٹائی گئی اور واپسی کا قصد کیا کیوں کہ یہ وہ مقام ہرگز نہیں تھا جہاں کے لیے ہم روانہ ہوئے تھے بہر حال یوں مایوس و بدحال واپس مستقر پہنچے یہاں موجود شاستری صاحب کچھ پریشان سے ملے انھوں نے کہا آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے میں نے کھانا وغیرہ تیار کر کے آپ کا بہت انتظار کیا۔ پتہ نہ چل سکا کہ یہ گڑبڑ کیوں اور کیسے ہو گئی...... خیر!

میری آزادی کے دن قریب الختم تھے دوبارہ پھر سے کوئی پروگرام نہ بن سکا مگر حیدرآباد روانگی کی تاریخ طے ہو گئی تو ہم نے کشتیوں پر بجواڑہ ہو کر وہاں سے مسولی پٹنم (مچھلی پٹنم) سلطان ٹیپو کا مقبرہ دیکھتے ہوئے حیدرآباد جانے کا منصوبہ بنایا یہاں سب نے بتایا تھا کہ یہاں سے بذریعہ کشتی دو گھنٹوں میں بجواڑہ پہنچ سکتے ہیں چناں چہ سامان ایک کشتی میں چپراسی وغیرہ اور دوسری کشتی

میں ہم سارے افرادِ کشتیوں کی رفتار بہت سست تھی مگر ہم میں سے اس کی کسی نے پروانہ کی ہم تو اس آہستہ خرامی سے لطف اُٹھانے لگ گئے تھے۔ کبھی اختر شیرانی کی نظمیں پڑھی جارہی ہیں تو کبھی اقبال کا ترانہ اور شکوہ کھلی فضا میں گونج اُٹھا۔ اسی میں دوپہر ہونے کو آئی معلوم ہوا ابھی کافی دُور جانا باقی ہے۔ ندی کے بیچ کہیں خشکی کا حصّہ نظر آ گیا ہم نے وہاں کھانے کے لیے توقف کیا۔ ہاں ایک بات یاد آئی اُس چھوٹے پتھر کو کوؤں کو کھلانے کے بعد پتھر جمع کرنے کا شوق سا ہو گیا تھا۔ روانگی کے پہلے ہی خوبانی کے برابر ایک چمک دار پتھر دستیاب ہوا تھا ویسا ہی شعاعیں نکلتا ہوا، میں نے کہا۔! یہ یقیناً ہیرا ہے اور اسے اپنے ڈوپٹے کے آنچل میں باندھ لیا کھانے وغیرہ سے فراغت ہوئی تو سفر جاری ہو گیا۔ قریب سرِ شام بجواڑہ پہنچ گئے۔ سارا پروگرام ختم امی یہاں ایک دن اور ٹھہرنے پر راضی نہ ہوئیں۔ وہاں سے حیدرآباد پہنچے۔ یہاں دادا میاں، پھوپھی امّاں وغیرہ سب ہی آ چکے تھے بس اب سات دن رہ گئے تھے میرے "گرفتارِ قفس" ہونے میں۔ بھیانک مستقبل کے تصوّر اور ذہنی کوفت کے سبب سے میری طبعیت بگڑ گئی بخار آ گیا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا بس روتی ہی رہی۔ ایسے رونے کو شاید اہمیت نہ دی جاتی تھی کہ کسی نے نوٹس نہیں لی کہ میکے سے رخصتی کے موقع پر اکثر لڑکیاں اسی طرح رویا کرتی ہیں۔ وقت کم کام زیادہ سب کے سب مصروف، غالباً رجب کا مہینہ تھا صبح تا نصف النہار لوگ بریانی اُڑاتے رہے اور میں خونِ دل پیتی رہی مہربان ماں باپ اور پیارے بھائی بہن کا اٹھارہ سال کا ساتھ گویا ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ یہ یاد نہیں کہ کس سے کیسے ملی بس اتنا یاد ہے کہ کار میں جو صاحبہ میرے ساتھ بیٹھی تھیں وہ میرے رونے سے پریشان ہو گئیں اور بڑے پیار سے گلے لگا لیا اور تسلی دینے لگیں۔ نئے گھر پہنچ کر بھی اوپر کیسے پہنچی ساتھ کون لوگ تھے کچھ یاد نہیں۔ ایک بے پناہ شور کے درمیان مختلف باتیں آوازیں ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون کے احکامات صدقے بلائیں لینے والے وغیرہ اور نہ جانے کیا کیا میں نے وہ رات کیسے گذاری اور کیا ہوا یاد نہیں صبح ہوتے

ہی خود کو جس کمرے میں پایا وہ رات والا کمرا نہیں تھا۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ اختر وغیرہ آئے مجھے
لینے اور میں ان کے ساتھ ہو لی۔ گھر آئی تو بہن بھائی سب ایسے ملے جیسے برسوں سے جُدا رہی۔
آج کی رات دولھا سسرال ہی میں گذارتا ہے۔ اور ایسا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن کریم بی نے جو
ساتھ آئی تھی کہا کہ جاگنے کی رات ہے نماز پڑھنے کو جانا ہوگا۔ تو ابّی نے روکا نہیں۔ البتہ کریم بی کے
ذریعہ کہلوایا کہ واپسی کے تین چار دن رہ گئے ہیں۔ تب تک لڑکی کو ہمارے پاس رہنے دیں
دوسرے دن جواب انکار میں ملا سرِ شام کریم بی لینے آ پہنچی۔ میں سب سے مل کر رخصت ہو رہی تھی
کہ چھوٹے چچا مجھے گلے لگا کر بے اختیار رونے لگے میں حیران رہ گئی کبھی سوچا نہ تھا کہ وہ مجھے اتنا
چاہتے ہیں۔ میرے آنسو اور بھی اُبل پڑے تیسرے دن ابّیؔ، امّی سب پری تال، واپس چلے گئے۔
اختر یہیں رہ گئے۔ وہ قریب ہی چھوٹے چچا کے ہاں رہتے تھے۔ دسویں میں زیرِ تعلیم تھے شادی سے
پہلے جو کچھ باتیں مرے کان میں پڑی تھیں ان سے بس اتنا پتہ چلا کہ کوئی دتی کا خاندان ہے اک
بڑے بھائی ہیں تحصیل داری سے وظیفہ لے چکے ہیں۔ افضل گنج میں ان کا ذاتی مکان ہے اور
دوسرے چھوٹے بھائی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ہیں۔ مال گزاری میں برسرِ خدمت ہیں بہت
شریف گھرانا ہے مجھے کچھ زیادہ جاننے کی خواہش بھی نہ تھی کوئی دل چسپی جو نہ تھی۔ اب جب آنکھ
کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تو دیکھا گھر خاصا بڑا ہے مگر اس میں رہنے والے صرف چار۔ ایک
بڑے بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی نصیر الدین ان کی بیوی اور لڑکی کریم بی۔ یہ پرانی انا تھی اور اب اس
کشتی کی چھٹویں سوار خود میں ہوئی۔ معلوم ہوا یہ لوگ دلی کے قریب ہاپوڑ کے رہنے والے تھے۔ تین
بھائی تین بہنوں پر مشتمل خاندان تھا۔ باپ گذر چکے تھے البتہ بوڑھی ماں حیات تھیں جو وہیں ہاپوڑ
میں رہا کرتی تھیں۔ وہاں ان کا اپنا بڑا اچھا خاصا گھر تھا۔ آم کا باغ اور کھیتی بھی تھی۔ منجھلے بھائی اور
ان کی بیوی وہیں رہا کرتے تھے۔ نصیر الدین صاحب سب سے بڑے وہ جوانی کے دنوں میں تلاشِ

معاش میں حیدرآباد آئے تھے۔ انھوں نے اردو فارسی پڑھی تھی جیسا کہ اس زمانے میں عام رواج تھا۔ یہاں کسی وکیل صاحب نے جو یو پی کے تھے انھیں از راہ ہمدردی اپنے یہاں ٹھیرالیا۔ اور کوشش کرکے انھیں مال گزاری میں نوکر کروادیا زیادہ تر باہر سے آنے والوں کی طرح ان وکیل صاحب کا گھر افضل گنج ہی میں تھا۔ ذاتی اور کافی بڑا مکان تھا نیچے کے حصے میں ملگیاں تھیں سب کی سب کرائے پر اٹھی ہوئی۔ انھوں نے یہیں حیدرآباد میں شادی کی تھی۔ جن سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ نصیرالدین صاحب کی پہلی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی مگر بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب وکیل صاحب نے ان کا عقد اپنی بڑی لڑکی سے کردیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد وکیل صاحب گذر گئے۔ چوں کہ مکان بڑا تھا ملگیوں سے خاصی آمدنی ہوا کرتی تھی۔ 1908ء کی طغیانی میں اس مکان کا تقریباً آدھا حصہ تباہ ہوگیا۔ کریم بی بتاتی تھی کہ اس وقت نصیرالدین صاحب کی لڑکی کی عمر چار پانچ سال اور لڑکے کی ڈھائی تین سال تھی۔ ساس کے کہنے پر نصیرالدین صاحب نے باقی ماندہ حصے کی مرمت کروائی۔ اور وہیں مقیم ہوگئے۔ اب وہ اس مکان کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے تھے۔ میری جٹھانی دبلی پتلی' نازک اندام' گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں خاصی خوب صورت' بہت نیک اور نرم مزاج تھیں۔ نصیرالدین صاحب تو خاصے موٹے پستہ قد اور سانولے رنگ کے تھے۔ نصیرالدین صاحب کی ساس اپنی دو لڑکیوں اور چھوٹے لڑکے کو لے کر الگ ہوگئیں اور داماد نے بیوی کو ان سے ملنے سے منع کردیا۔ گھر کے اوقات کچھ اس طرح مقرر تھے صبح آٹھ بجے ناشتہ' ڈیڑھ بجے دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا آٹھ بجے۔ اب پکانے کی ذمہ داری میری ہوگئی۔ کھانا تو انگیٹھیوں پر پکایا جاتا اور چپاتی میری طرف جو لکڑی کے چولھے بنے تھے اس پر پکتی۔ پورے دن کا کھانا ایک ہی ساتھ پکالیا جاتا تھا۔ میں سویرے اُٹھ کر روٹی بنالیا کرتی۔ صبح و شام کی چائے کا رواج بھی تھا مگر عزیزالدین صاحب ان اوقات کی پابندی سے مستثنیٰ تھے۔ اس لیے کہ ان کا دفتر دس بجے

سے چار بجے ہوا کرتا تھا تو وہ دس بجے کے قریب کھانا کھا کر چلے جاتے۔ شام میں پانچ بجے واپس آ کر رات کا کھانا کھالیا کرتے۔ شروع میں کریم بی میرے لیے کمرے پر چائے لے آتی تھی انھوں نے مجھے چائے نوشی سے روکنا چاہا۔ چائے کی خرابیاں گنوائیں۔ مگر کریم بی نے انھیں ڈانٹ دیا تو چُپ رہ گئے۔ اس کو معلوم تھا کہ میرے میکے میں دو وقت چائے پینے کا معمول تھا۔ وہ میری جٹھانی کی پُرانی انا تھی ہر ایک کو اس کی بات ماننا پڑتی تھی۔ وہ بہت ہمدرد' ہر ایک کا خیال رکھنے والی' خاص طور سے اسے میرا بہت خیال ہوتا تھا۔ شروع ہی میں اس نے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ میں اصل نسل سیدانی ہوں۔ جیٹھ صاحب تو ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ بس یہ دونوں ماں بیٹیاں رہ جاتیں۔ مجھے اخبار پڑھ کر سنانے کو کہا جاتا۔ عزیز الدین صاحب سویرے اُٹھتے نماز پڑھ کر کچھ دیر آواز سے تلاوتِ قرآن کرتے۔ میری آنکھ اسی وقت کھل جاتی۔ اور مجھے بے اختیار سعدیؔ کا یہ مصرعہ یاد آ جاتا۔ ع۔ گر لو قرآں بدیں نمط خوانی اس کے بعد مقدمے کی مثلیں وغیرہ دیکھنا کبھی کرایہ وصول کرنا یہ روز کا معمول ہوتا دس بجے کے قریب کھانے کے لیے آ جاتے اور پھر دفتر چلے جاتے۔ رسالہ ''نگار'' میرے پاس باقاعدگی سے آ رہا۔ مطالعہ پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ جٹھانی صاحبہ اور ان کی صاحب زادی اقبال بیگم جو بیگم جانی پکاری جاتی تھیں' کو پڑھنے سے زیادہ پڑھوا کر سُننے کا شوق تھا۔ اختر روز شام ساڑھے پانچ بجے ملنے چلے آتے۔ جیسے ہی معلوم ہوتا کہ وہ آ گئے جٹھانی صاحبہ مجھ سے کہتیں، جایئے آپ کے بھائی آ گئے۔ اگر شام کی چائے نہ پی گئی ہوتی تو ہم دونوں کے لیے چائے' وہیں بھجوا دیتیں۔ اختر عموماً آٹھ بجے تک رہتے۔ اس قفس میں جو تھوڑا سا وقت ان کے ساتھ گذرتا۔ وہی میرا سہارا اور باہر کی دنیا سے ربط کا واحد ذریعہ تھا۔ تیسرے چوتھے دن وہ کوئی نہ کوئی اچھی کتاب ضرور لے آتے۔ اس دوران عزیز الدین صاحب دفتر سے آ کر کھانا کھاتے۔ بڑے بھائی چائے پی گاؤ تکیے سے لگ نیم دراز ہو جاتے۔ اور چھوٹے بھائی صاحب

دست بستہ گردن جھکائے برابر بیٹھے ان کے بار بار دُہرائے ہوئے کارنامے سنتے رہتے۔ اختر کی واپسی کے بعد میں پھر ان ہی لوگوں کی طرف رات کا کھانا کھانے آجاتی۔ چھوٹے بھائی کو جوں ہی نجات ملتی وہ جاکر عشاء کی نماز پڑھتے اور سو جاتے۔ بڑے بھائی بھی اپنے کمرے میں چلے جاتے مجھے ماں اور بیٹی کے ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذارنا پڑتا۔ پھر اپنے کمرے میں آکر چراغ کی لو کم کرکے کسی کتاب میں گم ہوجاتی۔ جلدی سونے کی عادت نہیں تھی مگر چوں کہ صبح جلد اٹھنا ہوتا تھا اس لیے رات دیر گئے پڑھنے کا موقع نہ ملتا یہ تھے میرے لیل و نہار اس صورت حال سے یُوں لگتا ہے کوئی تغیر ہونے والا نہیں۔ مگر اقبالؔ کی بات یاد آجاتی۔

ع۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اقبالؔ کے الفاظ سے ڈھارس ہوجاتی اور دُور کہیں اُمید کی ایک کرن نظر آتی کہ شاید، کبھی، کہیں، کوئی......

چھوٹے بھائی صاحب پڑھائی کی خاطر بڑے بھائی کے گھر آکر رہے تھے۔ اور کوئی چھوٹی سی نوکری کرلی۔ اس آمدنی کو پس انداز کرکے پڑھائی جاری رکھی۔ اور اس طرح بی اے ال ال بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ چھوٹے قد کے دُبلے پتلے کلین شیو، شاید اسی لیے اصلی عمر سے کچھ کم لگتے تھے۔ بہر حال سسرال کا جو ہوّا کھڑا کیا جاتا تھا مجھے اس سے سابقہ نہیں پڑا۔ بے کار رہنے کی میری عادت تھی نہیں شادی کے سانحے سے کچھ قبل ہی میں نے طے کرلیا تھا کہ اب خود کو زندہ باور نہیں کروں گی۔ نہ کوئی خواہش نہ تمنا۔ جیسی بھی گذرے خاموشی سے برداشت کرلینا تاکہ کہنے والوں کو یہ موقعہ نہ ملے کہ ماں نے ٹھیک سے تربیت نہیں کی۔ پھر یہ بھی کہ ابّا نے سب کے مشوروں کو رد کرکے اپنی سی کی تھی یہاں چندہی روز بعد مجھے ایک تعویذ دیا گیا۔ میں نے خاموشی سے لے لیا اور میز پر رکھ دیا۔ اس طرح کے ٹونے ٹوٹکے بہت ہوا کرتے تھے مگر اتنا ہوا کہ مجھ پر لادے نہیں گئے۔ دوسرے روز مرّہ کے جو اُصول قاعدے تھے وہ بھی کچھ تکلیف دہ نہیں تھے۔ پھر بھی یہ خیال اکثر ضرور آتا کہ اپنے پیروں پر

کھڑے ہو کر زندگی بسر کرنے کی قابل ہوتی تو چاہے کچھ بھی ہو جاتا مگر ایک دن اس گھر میں نہ
گذارتی۔ ابی، وہم، جادو ٹونے، تعویذ، بھوت پریت اور آسیب جیسی ساری باتوں کو بے کار سمجھتے
تھے۔ وہ جہاں بھی رہے ہم سب کو پرانی چیزیں دیکھنے سے کبھی منع نہیں کیا۔ خود ساتھ ساتھ ہوتے لیکن
کبھی کسی درگاہ پر خود گئے نہ ہم لوگوں کو لے گئے۔ میری شادی کے موقعہ پر کہہ دیا تھا کہ کوئی رسم نہیں
ہوگی۔ میں ان کی پکی ہم خیال کوئی بھی معمولی سی رسم ہی کفر کے برابر سمجھا کرتی۔ اپنے ان خیالات کا
اظہار میں برملا کیا کرتی تھی شاید اسی لیے میرے تعویذ نہ پہننے پر کسی نے نہ صرف کچھ کہا نہیں بلکہ آئندہ
کبھی ایسی بات سے سابقہ پڑنے کی صورت پیدا نہیں کی۔ وقت کا کام گذرنا ہے گذرتا رہا۔ دست
کاری میں میری واقفیت کا علم ہوا تو جٹھانی صاحبہ نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے کارچوب، کامدانی،
ایمبرائڈری وغیرہ میں کتنی ہی چیزیں بنوا ڈالیں۔ ان کے لیے ضروری سامان اختر لارڈ بازار سے لا
دیتے۔ تو انھیں وہ بہت پسند کرنے لگی تھیں۔ عید رمضان میں اختر کے ساتھ کئی رشتے کے بھائی ملنے
چلے آئے۔ میں سب سے ملی بعد میں بڑے بھائی صاحب بیوی پر بہت خفا ہوئے کہ لڑکوں سے ملنے
کی اجازت کیوں دی۔ یہ صاحب تو سُوئی پوت والیوں تک کو بھی گھر میں داخل ہونے دینے کے
روادار نہ تھے۔ اور نہ بیوی کو کہیں جانے کی اجازت دیتے۔ پتہ نہیں بے چاری خالی اوقات کیسے کاٹ
لیا کرتی تھیں۔ لڑکی پر بھی ایسی ہی قید تھی۔ یہ دونوں اکثر بالکنی میں بیٹھی نیچے سڑک پر گذرنے والوں
اور خریداروں کا تماشہ دیکھا کرتیں۔ گھر کے سامنے سڑک کے اُس پار اخبار ''رہبر دکن'' کا آفس، نیچے
میووں کی دوکانیں، سڑک بے حد مصروف، ہمارے اکثر عزیز محبوب گنج، بیڑی عنبر بازار وغیرہ محلوں
میں رہتے تھے۔ وہ سب کو پہچانتی تھیں۔ میں اپنا کام کرتی رہتی میرے پاس روزمرہ پہننے کے لیے
کپڑے نہیں رہے تھے۔ عید پر بھی کوئی نئے کپڑے نہیں بنے تھے۔ چند ساڑیاں جو شادی میں ملی تھیں
ان میں سے تین چار کا گوٹا، لچکا نکال کر استعمال کر رہی تھی۔ کسی سے کچھ کہنے سننے یا فرمائش کرنے کی

قسم کھا رکھی تھی۔ جٹھانی صاحبہ نے اس کمی کو محسوس کیا۔ اوران کے کہنے پر چھوٹے صاحب نے کورے ململ کے بیس بیس گز کے دو تھان لا کر ڈال دیئے کہ ساری کرتے بنالیں اور پہنیں۔ (جاپانی مال آنے لگا تھا کپڑا بہت سستا ہو گیا تھا) یہ ایک تھان سات روپے آجاتا۔ اسی کے ساتھ برقعہ کا موٹا آٹھ دس گز ہرک بھی آگیا تھا کہ میں اپنا "کفن" سی لوں۔ مجھے ہاپوڑ جا کر اپنی معذور ماں سے ملنا تھا اس لیے ان تین چار مہینوں میں چچا میاں مجھے لینے آئے بڑے بھائی صاحب نے بہ مشکل دو دن کی اجازت دے دی کریم بی کو ساتھ کر دیا۔ یوں تو میری خالہ زاد بہن اور ایک خالہ بھی شہر رہتی تھیں مگر مجھے کہیں جانے کی اجازت مانگنا پسند نہ تھا۔ ابیؔ اور رضیہ کے خطوط برابر آتے رہے۔ وہ میری تنہائیوں کے ساتھی تھے۔ اب ہاپوڑ جانے کا پروگرام بن گیا۔ اور دو مہینے کی چھٹی لی گئی۔ طے پایا کہ چھوٹے بھائی خواتین کو ساتھ لے کر جائیں۔ دو مہینے بعد ان کی واپسی پر بڑے بھائی صاحب جائیں گے۔ کیوں کہ گھر کو اکیلا کیسے چھوڑا جاسکتا تھا پتہ نہیں کیا خزانہ رکھ لیا تھا۔ ابی کو علم ہوا تو انھوں نے داماد صاحب کو لکھا۔ روانگی کی ٹھیک تاریخ سے مطلع کریں تاکہ وہ قاضی پیٹھ پر آکر مجھ سے مل سکیں۔ جہاں گاڑی بدلنے کے لیے تین چار گھنٹے رکنا پڑتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب نے کہا لکھ دیا جائے کہ اُدھر سے نہیں جارہے ہیں۔ دل پر جو گذری سو گذری تن بہ تقدیر دس گز کے لمبے چوڑے برقعے میں ملفوف دو جگہ ٹرین بدلتے گرمی میں جُھلستے اور پگھلتے تیسرے دن ہاپوڑ پہنچے۔ یہاں بوڑھی ماں کے علاوہ ان کی بڑی لڑکی کے، جن کا انتقال ہو چکا تھا دو لڑکے بھی تھے بڑے اختر علی اور چھوٹے تصور علی نامی۔ اختر علی کچھ پڑھے لکھے تھے اور چھوٹے بھائی بالکل ان پڑھ جیٹھ صاحب کو اپنے علاوہ کسی کی فکر نہ تھی مگر عزیز الدین صاحب کم از کم اپنے عزیز و اقارب کے لیے جو کچھ بن پڑتا وہ کرتے۔ میں نے سُنا تھا کہ منجھلے بھائی بھی تھے جن کا نام بشیر الدین تھا وہ اور ان کی بیوی اکلوتی لڑکی یہیں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ نصیر الدین صاحب کی پہلی بیوی کے لڑکے سے یہ لڑکی منسوب تھی۔ باپ

نے بیٹے کو تاکید کر دی تھی کہ بی۔ اے سے پہلے عقد نہیں ہوگا۔ مگر پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ منجھلے بھائی نے ایف اے کرنے کے بعد ہی عقد کر دیا۔ یہاں باپ نے بیٹے پر غصہ اُتارا اور انھیں عاق کر دیا۔ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں بس اتنا معلوم ہوا کہ یہ ماں باپ اور بیٹی تینوں ختم ہو گئے۔ لڑکی کی رخصتی سے پہلے ہی بوڑھی ماں اکیلی رہ گئیں تو چھوٹے بیٹے نے تصوّر علی کی شادی وہیں کسی بیوہ کی لڑکی سے کر کے انھیں ماں کے ساتھ گھر میں رکھا۔ بڑے بھائی اختر علی بھی وہیں رہنے لگے۔ تصوّر علی کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے۔ تصوّر علی کے دو لڑکے بڑا پانچ یا چھ سال کا دوسرا ڈھائی سال کا۔ ہمارے ہاپوڑ پہنچنے کی خبر سُن کر چھوٹی نند اپنے چار بچوں اور میاں کے ساتھ ملنے چلی آئیں۔ ان کی بڑی لڑکی مجھ سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی رہی ہوگی دوسری سعیدہ بھی جوان تھی تیسری توحید فاطمہ نو دس سال کی۔ لڑکا عاصم علی کوئی چھ سال کا۔ چند دنوں بعد بیگم جانی کے چھوٹے بھائی بھی دِلّی سے تشریف لائے۔ یہ دلّی میں حکمت پڑھ رہے تھے اور گھر میں پندرہ دن رہے گرمیوں کا موسم' کھانا پکانا سب میرے ذمّے۔ یہاں پڑوس میں زیادہ تر پنجابی تھے جو چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے محلّہ کا نام ''محلّہ قانون گویاں'' تھا۔ دس گیارہ بجے تک مرد تو سب اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے اس عرصے میں عورتیں بھی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر برقعے اوڑھے ایک دوسرے سے ملنے نکل پڑتیں۔ ہم سے ملنے بھی کبھی آتیں سب بڑی ملنسار خوش مزاج اور ہماری جٹھانی صاحبہ بھی بہت ملنسار اور ہنس مکھ خاتون تھیں چوں کہ وہ پہلے یہاں آچکی تھیں۔ ان کی بہتوں سے شناسائی تھی مگر ملنا جُلنا تو دوطرفہ ہوتا ہے وہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم بھی اُن کے گھر جائیں دو ایک نے خاص طور پر اپنے پاس بُلایا بھی۔ مگر یہاں تو بڑے صاحب کا نادری حکم برقعہ میں بھی گھر کی چہار دیواری سے قدم باہر نکالنا منع تھا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے بھی آنا جانا کم کر دیا۔

ایک صاحبہ نے عید میلاد پر بلایا تو ان کے ہاں جانے کی اجازت ملی تھی۔ وہ بھی یوں کہ۔

یہاں شہر میں عزیزیہ کمپنی کے نام سے جو ہوٹل چل رہا تھا اس کے مالک کی بیوی سے میری جیٹھانی صاحبہ کی ملاقات تھی۔ یہ لوگ ہاپوڑ کے ہی تھے۔ اس ہوٹل کے باعث کافی پیسے والے ہو گئے تھے۔ ہاپوڑ میں بھی اچھا دو منزلہ مکان بنوالیا تھا۔ تین چار لڑکے تین لڑکیاں۔ مگر تعلیم کسی کو نہ دلوائی۔ انہیں کے ہاں باتوں باتوں میں علم ہوا کہ بابائے اردو کہلانے والے عبدالحق صاحب کا گھر ان کے قریب ہی ہے۔ نیز یہ کہ وہ شادی کے لئے تیار نہ تھے زبردستی کر کے کی گئی۔ تو۔ شب عروسی کو ہی گھر چھوڑ کہیں چلے گئے ۔ اور پھر واپس نہ آئے۔ مجھے یہ سب جان کر اُن پر ذرا غصہ بھی آیا تھا کہ ایک زندگی کو پابند کر کے بھاگنا۔ پہلے ہی چلے جاتے۔ وہی جو کچھ نہ پوچھنے کی عادت۔ ورنہ معلوم کر سکتی تھی کہ۔ ان کی منکوحہ کا کیا ہوا۔ عبدالحق صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس واقعہ کے تعلق یا ان کی جائے پیدائش کے بارے میں کہیں کوئی بات میری نظر سے نہ گزری۔ یہاں اس دن کی باتیں یاد آ گئیں تو لکھ دیں۔ اس گھر والے بعد میں حیدر آباد آ گئے تو ان لوگوں سے کبھی کبھار یہاں بھی ملنا ہوتا رہا۔ کمپنی یا ہوٹل کے مالک کی اچانک وفات سے سارا کام ٹھپ ہو گیا۔ لڑکے کوئی اس قابل نہ تھے۔

ایک دن پردے کے خاص اہتمام کے ساتھ باغ اور کھیت دکھانے لے جایا گیا جو میل دو میل کے فاصلے پر ہی تھا وہاں دو چھوٹی کوٹھریاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ چارا رکھنے اور وقتِ ضرورت سر چھپانے کے لیے۔ باغ تو برائے نام تھا صرف چار پانچ آم کے درخت' باقی سب کھیت۔ ملنے آنے والے واپس ہو گئے۔ ان کی بڑی لڑکی امت الرشید' بیگم جانی کے اصرار پر چھوڑ دی گئی۔ وہ بیگم جانی سے زیادہ میرے پاس گھسی رہتی۔ رسالہ ''نگار'' تو آ ہی رہا تھا۔ اختر شیرانی نے ''خیالستان'' نامی رسالہ نکالا تھا۔ رضیہ نے اسے بھی میرے نام جاری کروا دیا تھا۔ کچھ پرانی کتابیں' میں اپنے ساتھ لیتی آئی تھی خالی وقت میں کچھ پڑھنے بیٹھ جاتی تو یہ لڑکی مجھے پڑھنے نہ دیتی خود بالکل ان پڑھ تھی مگر اچھی صورت شکل کی اور خوش مزاج' چند ہی دنوں بعد جیٹھانی صاحبہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ بیگم جانی کے ہاتھ

میں بھی کچھ تکلیف۔اب گھر کے کام کے ساتھ تیمارداری بھی۔ایک دو بجے رات تک پاس بیٹھی رہتی دوا علاج کے ساتھ نذر و نیاز بھی کچھ ہوتا۔تقریباً ایک مہینہ لگ گیا ان کو ٹھیک ہوتے۔میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ ان کی اتنی خدمت کی۔یوں دو مہینے گذر گئے چھوٹے صاحب واپس چلے گئے۔بڑے بھائی تشریف لائے گھر کی فضا میں جو تھوڑا بہت کھلا پن تھا وہ جاتا رہا۔میں نے محسوس کیا کہ وہاں کوئی ان کو پسند نہیں کرتا۔اس کے برعکس چھوٹے بھائی سے سب بہت خوش دکھائی دیتے۔ماں بھی اُن سے بہت خوش رہتیں ان بڑے صاحب سے تو ماں بھی ناخوش تھیں۔گرمیوں میں سبھی پلنگ آنگن میں بچھائے جاتے تھے۔ماں کا پلنگ صحن کے سامنے دلان میں، ان صاحب نے آتے ہی ان کا پلنگ وہاں سے اُٹھوا کر صحن کی دوسری طرف جو ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جس کے کونے میں ایک بھینس بندھی رہتی تھی وہاں ڈلوا دیا تو انھیں بہت ناگوار گذرا۔انھیں ہی کیا یہ طرزِ عمل سبھی کو بُرا لگا وہ بے چاری معذور کیا کرتیں بھلا۔بُرا بھلا کہہ کر خاموش ہو رہیں پھر پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ تصور علی کی بیوی بھی بچوں کو لے کر ماں کے پاس چلی گئیں۔اوپر کا کام کرنے والی جو ایک عورت تھی اسے بھی نکلوا دیا بھنگن روز آکر صفائی کر جاتی کبھی اس سے تھے بھی صاف کرائے جاتے مگر صاحب موصوف کے آتے ہی بھنگن کا دلان وغیرہ میں قدم رکھنا بھی ممنوع ہو گیا۔بے چاری میری جٹھانی کو اب جھاڑو جھٹکا کرنا پڑتا۔میں سمجھتی تھی کہ نوّے فی صد مرد اب بھی وہی صدیوں پرانی ذہنیت رکھتے ہیں یہ صاحب بھی ویسے ہی ہوں گے مگر یہاں ماں، بہنوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل اور باتیں انتہائی فضول قسم کی ہوتیں۔مثلاً کہتے میں تو چار کو کھلا کر کھاتا ہوں وغیرہ تب میں نے جانا کہ وہ کتنے کمینہ فطرت تھے۔کبھی تو اپنی پھوپھی کے بارے میں دون کی لیتے ہوئے یہ کہنا کہ وہ قلعہ میں بیاہی گئی تھیں بہت پردہ نشین تھیں وغیرہ وغیرہ۔اور اب یہاں ہاپوڑ کے گھر میں ان پر یہ کہتے ہوئے لعنت بھیجنا کہ انھوں نے اپنا حصہ باپ کے گھر میں سے لے لیا تھا ورنہ گھر اتنا چھوٹا ہرگز نہ رہتا۔غرض ایسی ہی باتیں کیا کرتے۔گرمی گئی تو برسات کا

عذاب شروع ہو گیا۔ صحن میں سو نہیں سکتے۔ اندر جگہ تنگ اور بلا کی اُمس تھی۔ واپسی کا کوئی ذکر نہیں۔ ابیّ کے خطوط آتے رہتے پتہ چلا کہ ان کی منصری قریب الختم ہے انھیں شہر جا کر پھر سے نوکری تلاش کرنی ہوگی۔ تو داماد صاحب کو وہاں کرایہ کا کوئی مکان تلاش کرنے کو لکھا۔ مکان تو تلاش کیا نہیں اپنی طرف کا آدھا حصہ مکان کا جو خالی پڑا تھا اسی میں سب کو ٹھیرا دیا۔ ابیّ تو ہمیشہ ہی ہر کسی سے اچھی طرح ملتے تھے۔ امّی، رضیہ، رابعہ سب نے اُن کے ساتھ جس خلوص و محبت کا سلوک کیا اس سے شاید وہ کبھی واقف تھے ہی نہیں، بہت متاثر ہوئے اور جب مجھ سے ملنے کے لیے سب کی بے صبری دیکھی تو ابیّ سے کہا کہ میں تو ابھی رخصت لے نہیں سکتا آپ چاہیں تو جا کر اپنی بیٹی کو لے آئیں اور بھائی کو خط لکھا کہ منصف صاحب آئیں گے۔ اُن کے ساتھ مجھے روانہ کر دیا جائے۔ اب روک تو نہ سکتے تھے تاہم بھائی کو جو جواب انھوں نے لکھا وہ مجھے بھی پڑھ کر سُنایا۔ (ٹھیک تو ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمھاری بیوی ماں باپ کے گھر جا کر رہے۔) انھیں صرف اپنے ساتھ رکھا تھا۔ شادی کے بعد لڑکی کا گھر سسرال ہی ہوتا ہے ابیّ مجھ سے ملنے کے لیے اتنے بے چین تھے کہ فوراً روانگی کا ارادہ کر لیا۔ ان کے حاکم بالا نے کہا ابھی اس وقت آپ نہ جائیں نوکری کا معاملہ ہے موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مگر ابیّ فیصلہ کر چکے تھے یہ کہہ کر خدا رزّاق وہاں سے فوراً چل پڑے۔ ہاپوڑ آ کر صرف ایک دن ٹھیرے اور مجھے لے کر واپس دہلی میں ایک دن قیام کیا۔ جامع مسجد دکھائی۔ جیولری کی دوکان پر جا کر میری پسند سے ایک خوب صورت جڑاؤ نکلس اور نازک دو بُندے رضیہ اور رابعہ کے لیے خریدے۔ اب پورے ایک سال بعد میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ تھی۔ حال یہ ہے کہ بہنیں مجھے ہل کر پانی بھی نہ پینے دیں کسی کام کا تو کیا ذکر۔ بہنوئی کا اتنا خیال کہ صبح ناشتے کے بعد دوپہر کا ٹفن ساتھ جاتا۔ رات سب مل بیٹھ کر ساتھ کھانا کھاتے۔ رضیہ نے انگریزی پڑھنے کی خواہش کی فوراً آمادہ ہو گئے۔

کوئی چھ سات ماہ بعد ابّی کو کام مل گیا۔ بہت دور اجنتہ سے بھی دُور دھاوڑے نامی گاؤں میں، وہی تحصیل داری اور منصفی کا مشترکہ عہدہ۔ ابّی سب کو ساتھ لیے چلے گئے۔ بڑی خالہ اور اختر میرے پاس ہی رہے۔ اختر اب کالج میں تھے۔ چھٹیاں ہوئیں تو انھوں نے دھاوڑے جانے کا پروگرام بنایا۔ نصیر الدین صاحب ابھی تک ہاپوڑ ہی میں تھے البتہ ان کا بیٹا یہاں آیا ہوا تھا۔ باپ سے دو ہاتھ آگے نیم پاگل سا۔ چناں چہ عزیز الدین نے میرا یہاں اکیلا رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور مجھے بھی اختر کے ساتھ جانے کو کہہ دیا۔ اور اس طرح پانچ چھ ماہ بعد ہم سب پھر یکجا ہو گئے۔

دھاوڑا ایک چھوٹا سا پہاڑی مقام کئی مرحلوں کا طویل سفر حیدر آباد سے اورنگ آباد تک ٹرین اور وہاں سے اجنتہ تک بس پر، اجنتہ سے پانچ چھ کوس آگے بیل گاڑی سے چڑھائی پر چڑھتے چلو مگر بڑا ہی پُر فضا راستہ، ساگوان اور لوبان کے گھنے جنگل، جگہ جگہ جنگلی چمبیلی کی بیلیں اور چھوٹے چھوٹے چشمے، فضا ساری، دھیمی دھیمی خوشبو سے معمور۔ یہاں قیام کے لیے جو مکان ملا تھا وہ گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ کھلا کھلا روشن اور ہوادار اس کے چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیتوں کے سلسلے۔ گھر سے ملا ہوا ایک طرف جام کا باغ مراٹھواڑے کا یہ زرخیز علاقہ جس کی سیاہ مٹی میں زیادہ تر گیہوں کی پیداوار۔ ہرا کیلا بہ کثرت، گوشت ہفتہ میں صرف ایک بار بازار کے دن ملتا۔ ترکاریاں بھی کچھ خاص نہیں مگر ابّی نے آتے ہی دو بھینسیں خرید لی تھیں۔ اور مرغیاں بھی پلی ہوئی۔ گھر کا دودھ، دہی، گھی، انڈے اور کیا چاہیے۔ یہاں دیکھنے کو تو کوئی خاص تاریخی چیز نہ تھی۔ مگر اونچے اونچے پہاڑ اور جنگل خود قدرت کی تاریخ۔ سیر کا اکثر پروگرام بن جاتا۔ ابّی، امّی بھی اس میں شریک ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک اونچے پہاڑ پر پہنچے وہاں دوسری طرف وادی دور تک پھیلا ہوا خاندیس کا علاقہ۔ اتنی بلندی سے مکانات ایسے نظر آتے جیسے کارڈ کی ڈبیاں جمائی گئی ہوں۔ ندی، نالے اور دریا سے چاندی کی پتلی پتلی چمکتی لکیریں اجنتہ کی طرح پہاڑی راستوں پر یہاں بھی ہلکی پھلکی چھوٹی گاڑیاں جو دمنیاں کہلاتی تھیں۔ ایک

دنی میں تین آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ایک بار جب ہم ایسی کسی پہاڑی پر پہنچے اور شام سے پہلے لوٹنے کو کہا گیا تو ہم نے کہا۔ابھی نہیں، غروبِ آفتاب کا منظر دیکھ کر چلتے ہیں۔چپراسی وغیرہ نے ڈرایا کہ یہاں جنگل بہت گھنے ہیں۔جنگلی جانور بہت ہیں۔مگر ہم تو غروب آفتاب کا منظر دیکھنے پر تلے ہوئے تھے اور پھر وہ دل کش نظارہ دیکھ کر لوٹے۔واقعی گھنے جنگلوں کے بیچ اندھیرا راستہ اور اونچی اونچی گھاس قندیل بردار قندیلیں روشن کیے آگے آگے چل رہے تھے ایک جگہ معاً رک گئے معلوم ہوا کہ بور بچہ سڑک پار کر کے دوسرے طرف نکل گیا ہے۔ہمارے بیل اسی کو دیکھ کر سہم کر رک گئے تھے۔چند منٹ بعد قریب ہی سے اس کے دہاڑنے کی آواز آئی۔گاڑی ہانکنے والے نے کہا اماں بور بچہ سامنے سے ہو کر گذر گیا اور پہاڑ پر سے دہاڑ رہا ہے۔امی کے تو ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اور ہمیں خوشی ہوئی کہ بور بچہ یوں سامنے سے ہو کر گذر گیا۔ساتھ ہی ساتھ یہ افسوس ہوا کہ ہم اسے دیکھ نہ سکے۔ایک بار تو بور بچے صاحب گھر کے ورانڈے میں آ کر بیٹھ گئے بارش ہو رہی تھی۔رات کا ایک بج رہا تھا۔ہم سب نے سونے کا ارادہ کیا تھا۔ابیؔ نے حاجت کے لیے دروازہ کھولا تو قندیل کی روشنی میں دیکھا کہ وہاں بور بچے صاحب دراز ہیں۔ابیؔ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔اور چپراسی کو جو وہیں چار پائی پر پڑا سو رہا تھا آواز دی۔وزیر خان وزیر خان ادھر سے جواب نہیں آیا۔لیکن بور بچے صاحب اُٹھ کر وہاں سے چل دیے اور کچھ دُور جا کر بہت زور سے دہاڑے۔بعد میں چپراسی نے جواب نہ دینے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ جاگ تو گیا تھا مگر آواز دیتا تو بور بچہ اس پر حملہ کر دیتا۔اس لیے چپ سادھے پڑا رہا۔بور بچے کو زندہ اور قریب سے دیکھنے کی ہماری خواہش اس بار بھی پوری نہ ہو سکی۔البتہ اختر نے جنگل کے بادشاہ کو شاہانہ چال چلتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ایک بار وہ (اختر) اپنے دوست کے ساتھ شکاری کے ہمراہ گئے تھے ایک چٹان پر کھڑے ہوئے تھے کہ چٹان کے نشیب میں سے معاشیر صاحب برآمد ہو گئے۔دوست صاحب نے جھٹ سے بندوق تان لی تو شکاری نے فوراً

ان کے ہاتھ سختی سے تھام لیے کہا حضور! ایسا غضب مت کیجیے۔ وہ پلٹ پڑا تو ہم تینوں کی خیر نہیں۔
اختر بتاتے تھے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑے شاہانہ انداز میں چلتا ہوا چند ہی منٹوں میں سامنے
کی پہاڑی پر چڑھ کر غائب ہو گیا.........!

سیر و تفریح کے ساتھ پڑھنا پڑھانا بھی جاری رہا۔ رضیہ اور رابعہ نے دو ڈکشنریاں منگوالی
تھیں۔ وہ ان کی مدد سے انگریزی کتابیں پڑھتیں۔ اردو میں تو وہ اب کہانیاں بھی لکھنے لگی تھیں۔ رابعہ
کو شعر و شاعری سے دل چسپی زیادہ تھی۔ ایک دن ہمیں شب ماہ منانے کی سوجھی۔ اور طے پایا کہ
چودھویں کی رات کو سفید پھولوں سے چاروں دِشائیں سجالیں۔ سفید کپڑے پہنیں۔ کھانے کی چیزیں
بھی سب سفید بنائی جائیں۔ رات بھر جاگا جائے۔ پھر اس کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سفید کاغذ کے
پھول کاٹے گئے۔ جھاڑو کی کاڑیوں کے ڈنٹھل بنا کر انھیں پُرو دیا گیا ان ہاروں سے چھت اور
دیواروں کو سجایا گیا پھر اس اہتمام کے ساتھ پہلی شب ماہ منائی گئی۔ مختلف کھیلوں اور بیت بازی میں
ابّی، امّی بھی ہمارے ساتھ سب ہی باتوں میں شریک۔ ایک دن ابّی نے ذکر کیا کہ گاؤں کی آبادی
شروع ہونے سے کچھ پہلے کوئی دو ایکڑ کا قطعۂ زمین فروخت ہونے والا ہے۔ جس کے دونوں جانب
باولیاں ہیں۔ ہم سب ابّی کے سر ہو گئے کہ وہ قطعۂ زمین خرید لیں۔ ہم وہاں ایک چھپر ڈال کر ہی
رہیں گے۔ کُھلی فضا میں بہت اچھا لگے گا۔ شاید ابّی کی سوچ بھی ایسی ہی کچھ تھی۔ مگر امّی ایسی باتوں
کی مخالفت کرنے لگیں کہ پتہ نہیں کب واپس جانا پڑے پھر یہ سارا جھنجھٹ کیوں مول لیں۔ مگر
ہمارے اصرار نے انھیں خاموش کر دیا۔ ابّی نے وہ زمین خرید لی۔ اس کے بعد ہم نے سب سے پہلے
ایک تیس گز لمبی اور پانچ چھ فٹ اونچی دیوار اُٹھوالی۔ اس سے ملحقہ ایک چبوترا بنایا گیا۔ پھر اس پر چھپر
ڈلوایا گیا۔ اندر بانس کی جعفری سے پارٹیشن کر کے کمرے بنا لیے گئے سامنے کافی بڑا احاطہ سن کی
کاڑیوں سے دیواری بنا کر گھیر لیا گیا۔ اور ہم اپنے اس آشیانے میں منتقل ہو گئے۔ باقی تین طرف جو

خالی زمین تھی۔اس کے ایک قطعہ میں دوسو کے لگ بھگ کیلے کے درخت لگوائے گئے۔بقیہ دو حصوں میں مرچ' پیاز' لہسن وغیرہ ایسی ہی چیزیں باولی پر رہٹ لگا ہوا تھا پانی کھینچنے کے لیے بیل خرید لیے۔ اندر کے صحن میں چمن بندی کا نقشہ بنایا گیا۔کاڑیوں کی دیوار کے ساتھ دیسی گلابوں کی باڑ لگائی باقی پورے حصے کو تقسیم کر کے روشیں بنائی گئیں۔بیچ میں جہاں وہ ایک دوسرے کو کاٹیں بانس کی جالی سے گھیر کر ایک کمرا سا بنالیا۔روشوں کے اطراف کیاریوں میں موسمی پھول اور ترکاریوں وغیرہ کے پودے۔ایک طرف کی روش پر جوہی اور چنبیلی بیچ کے کمرے کا نام "بیت المقدس" رکھا گیا۔یہ سارا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہی تھا کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ہمیں واپس ہونا پڑا۔تب تک یہاں سب لوگ ہاپوڑ سے واپس آچکے تھے۔

بیگم جانی کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔لڑکا تعلیمات میں نوکر تھا۔ادھر سے کافی رقم دینے کی بات ہوئی تو رشتہ طے ہو گیا۔پھر میری مصروفیت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔اختر اب بورڈنگ میں رہنے لگے تھے۔چھوٹے چچا موہان چلے گئے تھے مگر اختر اب بھی ہر شام پابندی سے مجھ سے ملنے آجایا کرتے تھے۔دھاوڑے کے دوران قیام ہم نے خط و کتابت کے لیے ایک کوڈ زبان وضع کر لی تھی۔جو میرے اور اختر کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا۔رضیہ اور رابعہ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ چمن بندی میں بھی مصروف رہیں چھوٹے چچا کو لکھ کر پھولوں' ترکاریوں کے بیج اور باغ بانی سے متعلق کتابچے بھی منگوا لیے تھے بیگم جانی کی شادی تو ہو گئی مگر وہ رہیں میکے میں ہی۔کیوں کہ میاں کسی ضلع پر رہتے تھے اور والدین لڑکی کو دور بھیجنا نہیں چاہتے تھے اب وہ سارے اُصول قاعدے کہ لڑکی کو شادی کے بعد شوہر کے گھر رہنا چاہیے۔اُنھوں نے بھلا دیے تھے۔حافظ نے کیا خوب پوچھا ہے۔ع۔

توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتری کنند۔

خیر آٹھ نو ماہ گذر گئے اختر کو چھٹیاں ہونے والی تھیں رضیہ اور رابعہ نے بہت اصرار سے عزیز

الدین صاحب کو لکھا کہ باجی کے ساتھ آپ ضرور آ جائیں۔ اور ابّی نے لکھا کہ ایک مہینے کی چھٹی کا حق
تو ہے کم از کم اُتنے ہی عرصے کے لیے آ جائیں۔ چھٹیاں جوں ہی ہوگئیں ہم تینوں اورنگ آباد پہنچے۔
وہاں سے انور کو ساتھ لیا (جن کو پڑھائی کی غرض سے سلیم چچا کے پاس رکھا گیا تھا)۔ سلیم چچا نے
بسمت سے اورنگ آباد آ کر وکالت شروع کی تھی اور بہت جلد ان کا شمار اچھے وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔
بیوی بچے بسمت میں رہے وہ یہاں اکیلے ہی رہتے تھے۔ دھاوڑا پہنچے تو لگا کہ جنت میں آ گئے ہیں۔
نو دس مہینوں میں ہی دونوں بہنوں نے خالی زمین کو بڑے خوب صورت چمن زار میں تبدیل کر دیا تھا۔
کیاریوں میں رنگ برنگی موسمی پھول ہر طرح کی ترکاریاں چاروں طرف کدو، تُرئی وغیرہ کی بیلیں،
گلابوں سے لدی جھاڑیاں، رضیہ نے بتایا کہ اب تو ذرا کم ہو گئے ہیں ان کی اتنی کثرت تھی امّی نے کئی
شیشے گُل قند کے بنا رکھے ہیں۔ چنبیلی کے پھول بھی ٹوکریوں سے نکلتے ہیں۔ تل کو پسا کر تیل بھی نکلوایا
گیا۔ یہ گھریلو چنبیلی کا تیل بازاری تیل سے کہیں زیادہ خوشبودار تھا۔ شام ہوتے ہی ساری فضا رات کی
رانی کی خوشبو سے مہک اُٹھتی چاندنی راتوں میں گُل چاندنی کی بہار قابلِ دید ہوتی۔ بیت المقدس پر
پھولوں کی بیل چڑھ کر چھت سی بن گئی تھی موز کا جو تختہ لگایا گیا تھا اس میں بڑی بڑی گودیں لٹک رہی
تھیں، ایک تختے میں لٹکتی سرخ سرخ مرچیں جو ہمارے انتظار میں تھیں کہ ہم ان کا حسن دیکھ لیں تب
توڑی جائیں۔ پچھلے سال میری موجودگی ہی میں ایک بڑے قطعۂ زمین کو خریدنے کی بات چل رہی
تھی۔ ایک بارہ ایکڑ کا یہ قطعہ اب خریدا جا چکا تھا۔ اور اس میں کیلے کے پانچ ہزار درخت لگائے گئے
تھے حساب لگایا کہ فائدہ کتنا ہو سکے گا۔ مگر سردیوں میں پالا مار گیا اور پوری فصل تباہ ہوگئی۔ اب اس
میں گیہوں کا کھیت لہلہا رہا تھا۔ اور کٹائی ہونے والی تھی۔ عزیز الدین صاحب کو اپنی پسند کا مشغلہ مل گیا
تھا۔ وہ تقریباً دن بھر کھیت پر گذار دیتے۔ اس فصل سے کوئی سولہ پلّے گیہوں نکلا۔ (پلّا ایک سو بیس سیر
کا ہوتا ہے) بازار کا بھاؤ دس بارہ روپے پلّہ تھا۔ تحصیل دار صاحب کا گیہوں گیارہ روپے پلّے سے

فروخت ہوا۔ اب کیا تھا سوچنے لگ گئے کہ اس طرح پیداوار ہوتی رہی تو جلد ہی لکھ پتی بن جائیں گے چناں چہ لاکھوں میں آنے والی متوقع رقم کے استعمال کا پروگرام بنانے لگے۔ پروگرام کی تین اہم باتیں یہ تھیں پہلی پوری دنیا کی سیر' دوسرے پہاڑی پر ایک مکان' تیسرے اس مکان میں ایک بڑی سی لائبریری (سیاحت میں میری ترجیح اسپین تھی اور رضیہ وغیرہ کی یونان اور اٹلی)۔ مکان ایسے ٹیلے پر ہو جس کے نشیب میں اپنی زمینوں پر پھیلے ہوئے کھیت' سامنے ایک ورانڈا ایسا ہو جس میں شیشے کی کھڑکیاں ہوں۔ جن سے بارش کا نظارہ کرتے ہوئے اپنے کھیتوں پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ کبھی ذہن میں آیا ہی نہیں کہ ہم سب الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ''شب ماہ'' اس بار بڑی خواب ناک رہی ایک پوری روش کو پھولوں سے سجایا گیا تھا کھلے آسمان کے نیچے چودھویں شب کی دودھیا چاندنی میں ہر شخص سفید کپڑے پہنے میز پر کھانے پینے کی ساری چیزیں سفید اور ہم حسب دستور صبح تک جاگتے رہے اور کئی گھنٹے بیت بازی ہوتی رہی مگر ہار جیت کسی کی نہیں۔ مجھے اور اختر کو بے شمار شعر یاد تھے ایک طرف میں ہوتی اور دوسری طرف اختر۔ ہم نے ایک اور مشغلہ بھی نکال رکھا تھا وہ یہ کہ ہر روز رات کو ہم میں سے کوئی ایک دو شعر اچھے نئے سنائے گا جو دوسروں کو یاد نہ ہوں اگر دوسروں کی یاد نکل آئے تو شعر القط ہو جائے گا۔ اور دوسرا سنانا پڑے گا۔ اس کھیل کا نام ''شبینہ'' رکھا تھا۔ دن میں دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ایک دوسرے سے چُھپ چُھپ کر نئے اشعار یاد کیے جانے لگے ابّی کی کوئی بیاض ہاتھ لگ گئی تھی اور گھر میں کئی شعراء کے دیوان بھی موجود تھے۔ ان ساری مصروفیات اور دل چسپی کے بیچ بھی رضیہ پڑھائی نہیں بھولی۔ اور اپنے عزیز بھائی سے پابندی سے انگریزی پڑھتی رہی۔ اب تو وہ ترجمے بھی کرنے لگی تھی۔ ادورڈ کارپینٹر کی کچھ نظموں کا ترجمہ اردو میں کر کے مجنوں گورکھ پوری کو بھجوایا تھا اور انھوں نے اپنے رسالے ایوان میں اسے چھاپا بھی۔ مجنوں صاحب سے رضیہ کی خط و کتابت رہنے لگی تھی اس کے پاس شاید اب بھی اُن کے بہت سارے خطوط محفوظ ہیں۔ عزیز الدین صاحب کی

چھٹی کا ایک مہینہ ختم ہوگیا۔ اور وہ حیدرآباد لوٹ گئے۔ لیکن مجھے یہیں رہنے دیا۔ اس سال ایک اور بات یہ ہوئی تھی کہ ابّی نے دادا میاں، پھوپھی اماں، سلیم چچا وغیرہ سب کو دھاوڑ آنے کی دعوت دی۔ اور وہ سب دھاروڑ پہنچ گئے۔ آپا اس وقت تک پانچ یا چھ بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ سب اکٹھا ہوئے تو چہل پہل خوب ہوگئی۔ آموں کا موسم تھا ویسے بازار سے بہ کثرت آم آتا رہا تھا مگر ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین جوابّی نے ہم سب کے اصرار پر خرید لیا تھا۔ اس میں ایک بہت بڑا آم کا درخت تھا۔ اس کے آم زیادہ اچھے تو نہ ہوتے مگر اس سال اس درخت سے بہت آم آگئے پھوپھا میاں کو آموں کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر درخت کے نیچے بیٹھے ان کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ سینکڑوں آم ____ اور سب نے مل کر خوب کھائے۔ دادا میاں کو درخت کے قریب ایک کرسی پر بٹھا کر ایک تصویر بھی کھنچوائی تھی ان دنوں میری طبیعت کچھ مضمحل رہنے لگی تھی آپا کے اشاروں کنایوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ میں ایک اور سانحے سے دوچار ہونے والی ہوں۔ جس کے تصور سے میری روح کانپ اُٹھتی تھی۔ میری جیسی کچھ گذر رہی تھی اس میں کسی نئی زندگی کی آمد کوئی خوش گوار اضافہ نہیں ہوسکتی۔ وہاں حیدرآباد کے اس زِندان میں ان سب کو ایک بچے کی بڑی خواہش تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی پرورش میں ان ہی لوگوں کو زیادہ دخل رہے گا۔ میرا وہاں اختیار تھا ہی کتنا۔ شوہر صاحب کیا کماتے تھے کیا خرچ کرتے تھے نہ میں نے کبھی پوچھا اور نہ ہی انھوں نے کبھی بتایا۔ چار سال ہونے کو آئے تھے ان چار سالوں میں چار پیسے بھی نہیں دیے اب جو یہ علم ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو مجھے بڑی پریشانی لاحق ہوگئی۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی اپنی اور اس کی دونوں کی زندگیوں کو ختم کرلوں۔ میرا بچّہ دوسروں کے رحم و کرم اور خیرات پر پلے یہ مجھے ہرگز گوارہ نہیں تھا وہاں نہ جانے کتنے تعویذ پہنائے جائیں گے۔ ٹونے ٹوٹکے ہوں گے عجیب اُلجھن نے گھیر رکھا تھا اختر کی چھٹیاں ختم ہورہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ مجھے واپس ہونا تھا۔

ایک عجیب اتفاق

روانگی کے دو چار دن پہلے ہی خط ملا آپ اختر کے ساتھ نہ آئیں میں یہاں مکان تلاش کر رہا ہوں۔ اگر مل جائے تو لکھوں گا۔ رضیہ کو ساتھ لانے کی کوشش کریں کہ یہاں تنہا رہنا مشکل ہوگا۔ دو ہفتے بعد خط ملا کہ یہاں پہنچنے کی ٹھیک تاریخ اور وقت سے مطلع کریں کہ میں آ کر نئے گھر لے جاؤں۔ رضیہ پڑھائی کی خاطر ساتھ آنے کے لیے خوشی سے تیار ہوگئی۔ امّی اور ابّی کو بھی عذر نہ ہوا۔ اس خبر سے کہ پھر اس گھر میں جانا نہ پڑے گا بڑا سکون ہوا۔ اس وقت تک مجھے اس گھر میں زندگی بتاتے پانچ سال ہو رہے تھے۔

نیا مکان

یہ مکان ملک پیٹھ میں تھا مختصر سا وہی قدیم وضع کا۔ دلان کے بازو میں کمرے، مکان الگ ہونے پر سہولت یہ ہوئی کہ اختر اور انور دونوں ساتھ رہیں گے اس طرح سے رضیہ کو ملا کر پانچ افراد ہوئے۔ کام کرنے والیاں آسانی سے مل جاتیں اوپر کے کام کے لیے ایک عورت کو رکھ لیا تھا۔ کھانا میں اور رضیہ مل کر پکا لیتے، افضل گنج سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ میں نے بھی حسب عادت کچھ پوچھا نہیں مگر عزیز الدین صاحب کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ مجھے ماں باپ کے گھر چھوڑ آئے تھے یہ بات بڑے بھائی صاحب کو بہت کھل گئی اور کہا کہ یہاں ان کے کون بیٹھے ہیں۔ جو پکا پکا کر کھلائیں گے۔ یہ بات ان کو بہت بُری لگی اور اس کے بعد سے میرے آنے تک وہ ہوٹل میں کھاتے رہے گھر میں کسی نے یہ نہ پوچھا کہ کہاں کھاتے ہیں۔ اس طرح یہ الگ گھر ہوگیا۔ بس کہنے کو "اپنا گھر" تھا ویسے اپنے گھر کا تصور میرا کچھ الگ تھا۔ میں جب کہ اپنے گھر والے کو کبھی اپنا محسوس نہ کر سکی تو گھر اپنا کیسے ہو جاتا۔

خیر جملہ اخراجات کا حساب لگایا گیا اور اس کا نصف حصہ اپنے ذمے رکھ لیا۔ جو جملہ چالیس روپے ہوتا۔ اسی نپی تلی رقم میں مجھے گھر چلانا تھا۔ تین چار ماہ بعد امی بھی بچوں کے ساتھ آ گئیں اور تقریباً چھ سات ماہ میرے ساتھ رہیں۔ پچیس ڈسمبر 1938ء مطابق 21/ رمضان رات ایک بجے جاوید صاحب دنیا میں تشریف لائے۔ اب نئے مسائل کھڑے ہو گئے۔ بچے کی پرورش اور میں بے مایہ۔ ذہنی سکون مفقود۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔ مسئلہ کا حل تو نکالنا ہی تھا۔ چنانچہ قریب ہی کسی پان فروخت کرنے والی عورت تھی اسے دن میں چار بار آ کر بچے کو دودھ پلا کر جانے کے لیے رکھا گیا لیکن پتہ نہیں کیسے صرف پانچ منٹ پلا کر چلی جاتی۔ اور بچہ تھوڑی دیر بعد ہی بھوک سے رونے لگ جاتا۔ دو مہینے بعد اس عورت کو نکال کر دوسری کو رکھا گیا۔ نواسے کی پیدائش کی خوش خبری ابی کو ملی تو وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر دیکھنے چلے آئے۔ اس کا عقیقہ وہ بڑے اہتمام سے کرنا چاہتے تھے۔ سبھی رشتہ داروں کو دعوت دی گئی میں نے ابی سے کہا کہ بکرا ذبح کرنے کی ضرورت کیا ہے حسب ضرورت گوشت منگوالیا جائے ۔ابی اس پر تیار ہو گئے۔ میری جٹھانی اور اُن کی لڑکی نہ جانے کیسے اجازت لے کر بچے کو دیکھنے آئیں تھیں۔ اور اب دعوت میں بھی شریک رہیں۔ بڑے بھائی صاحب نہ ہی دیکھنے آئے اور نہ ہی دعوت میں شرکت کی البتہ نام تجویز کر کے ضرور بھجوایا تھا۔ ظہیر الدین احمد یہاں اختر نے پہلے جاوید اقبال نام تجویز کر رکھا تھا۔ جو سب کو پسند آیا۔ ابی تو ایک ماہ رہ کر چلے گئے لیکن اور سب ٹھہرے رہے۔ چند ہفتوں بعد بچہ بہت بیمار ہو گیا۔ امی یہیں تھیں انھوں نے فوراً اختر کے ساتھ اسے کسی بچوں کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے بتایا کہ بچے کو دودھ موافق نہیں آ رہا ہے یہ دودھ چھڑا کر اسے بکری کا دودھ پلایا جائے۔

کالجوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں امی اختر کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں میں بھی۔ یوں تین چار مہینے کے بچے کو لے کر ان لوگوں کے ساتھ ہو لی۔ وہاں فوراً ایک بکری خریدی گئی اور تازہ خالص دودھ دستیاب ہونے لگا۔ بہت جلد جاوید تندرست و توانا ہو گیا۔ مجھے اپنے نام نہاد گھر سے کوئی

دل چسپی نہیں تھی۔ لیکن اب جب کہ شادی ہو چکی ہے تو ماں باپ کے گھر پڑا رہنا پسند نہ تھا۔ اس لیے خاموشی سے سب کچھ سہتی رہی۔ امی' ابی پر اپنی حالت کا اظہار کبھی نہ ہونے دیا۔ تاہم انھیں کچھ انداز ہو گیا تھا کہ جتنے دن ان کے پاس رہی ہر دم میری خاطر داری اور دل جوئی کرتے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ مجھے ان سے نہ کوئی گلہ تھا نہ شکایت میں تو اب صرف یہ چاہتی تھی کہ جو حشر میرا ہوا وہ میری بہنوں کا نہ ہونے پائے۔ رضیہ' رابعہ کے شوقِ علم اور ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر یہی دعا کرتی کہ ان کی بہتر تعلیم کا انتظام بھی اچھا ہو اور وہ اپنی زندگی آپ بنانے کے قابل بن جائیں۔ کسی اسکول وغیرہ میں پڑھے بغیر ہی گھر بیٹھے ان دونوں نے تھوڑی بہت علمی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ چناں چہ ہاتھ سے لکھ کر ایک ہفتہ وار ''پریم گزٹ'' جس میں ہفتے بھر کی مشاغل کی تفصیلات ہوتیں' نکالنے لگیں۔ ساتھ ہی تعمیر کے نام سے ماہ نامہ بھی تھا۔ جس میں سماجی' سیاسی' ادبی اور ہر طرح کے مضامین' کہانیاں' شعر و شاعری' تبصرے وغیرہ سب مختلف ناموں سے یہ دونوں خود لکھ لیا کرتی تھیں۔ اختر نظم کے حصے میں شریک رہتے۔ مجھ سے بھی لکھنے کے لیے بہت اصرار کرتے دو مضامین تو انھوں نے لکھوا ہی لیے۔ پتہ نہیں کیا لکھا تھا یاد نہیں رہا۔ البتہ اب صرف ان کے عنوانات یاد رہ گئے ہیں مثلاً ''مجبوریاں' صبر اور صبر کے بعد قبر'' مجھے لکھنے کی کوئی مشق تھی نہیں البتہ رضیہ انگریزی مضامین کا ترجمہ کر کے لکھتیں۔ اگر کوئی دیکھتا تو ضرور کہتا کہ یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے اس رسالے کے سات آٹھ نمبر نکلے۔ کچھ عرصے پہلے تک بھی یہ میرے پاس محفوظ تھے ایک دن اس میں شامل ایک مضمون ''عورتوں کی آزادی'' غالباً رضیہ کا لکھا میں نے کسی کو پڑھ کر سنایا تھا انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ اب سے چالیس بیالیس سال پہلے ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی نے لکھا ہے۔ انھوں نے مجھ سے وہ سارے رسالے مانگ لیے کہ پڑھ کر واپس کر دیں گی لیکن اب تک وہ رسالے واپس نہیں آئے۔ اور اس طرح یہ وقیع قلمی کاوشیں ضائع ہو گئیں۔ ان دونوں نے مل کر ایک ناول بھی لکھا تھا وہ

بھی احتیاط سے رکھا نہیں تھا گم ہو گیا۔ ہاں اس زمانے کی رضیہ کی تحریر کردہ چند کہانیاں "مجلۂ عثمانیہ" میں شائع ہوئیں۔ ابی رضیہ اور رابعہ کو حیدر آباد روانہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور مجھے بے حد خوشی ہوئی میں نے جاوید کو امی کے پاس چھوڑ دیا اور دونوں بہنوں کے ساتھ حیدر آباد واپس ہوئی۔ ان کو میٹرک کے پہلے سال میں داخلہ مل گیا لیکن تین چار ماہ کے اندر ہی ترقی دے کر انھیں نویں میں لے لیا گیا۔ اس طرح انھوں نے صرف دو سال کے اندر میٹرک کر لیا۔ شروع ہی سے ان کو غالباً ان کی قابلیت کی بنیاد پر وظیفہ بارہ روپے ماہ وار ملنے لگا۔ اور عزیز الدین صاحب نے ماہانہ کچھ تعلیمی قرض بھی دلوایا تھا۔ اب گھر بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ اختر نے قریب ہی ایک دوسرا گھر تلاش کر لیا۔ جس کی خصوصیت انھوں نے یہ بتائی کہ اس میں کبھی جوشؔ صاحب رہا کرتے تھے۔ یہ چار پانچ کمروں کا پختہ گھر تھا۔ داخلہ فیسوں ماہانہ فیسوں اور کتابوں کے اخراجات کے لیے ابی ذرا فکر مند تھے۔ تو رضیہ نے کہا کہ آپ میرے زیور میں سے کوئی چیز بیچ دیں ان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی مگر کوئی چارۂ کار تھا بھی نہیں۔ زیور کا قصہ یہ کہ ابی نے اجنتہ میں جو سونا خریدا تھا اسے میرے اور رضیہ کے لیے برابر میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب وہ اس وقت کام آیا۔ امی جو ہمارے ساتھ آئی تھیں ان دونوں کو شریک مدرسہ کروا کر لوٹ گئیں۔ گھر میں یوں تو چھ لوگ تھے مگر دن بھر پھر بھی اکیلی۔ ان ہی دنوں ہم نے سوچا کہ یوں دنیا سے کٹ کر الگ تھلگ رہنا ٹھیک نہیں۔ پاس پڑوس خواتین اور عزیزوں سے میل جول بڑھایا جائے۔ ابی ہر سال میلاد کی محفل ضرور کرتے تھے۔ روایتوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے طور پر سیرتؐ وغیرہ کا بیان لکھ کر پڑھتے۔ ہم نے بھی اسی روایت پر عمل کرنے کا سوچا۔ اختر کے ایک شاعر دوست جن کا نام ماہرؔ القادری تھا قریب ہی رہتے تھے۔ ان کی بیگم کو مدعو کیا ہمارے گھر سے دیوار بیچ بازو کے گھر میں مخدومؔ اور ان کی فیملی رہتی تھی۔ مخدومؔ کی دو تین نظمیں نگار اور ایوان میں پڑھ چکی تھیں۔ سوچا شاعروں سے تو ملاقات مشکل ہے ان کی بیویوں سے کیوں نہ ملا جائے۔ چناں چہ مخدوم کی اہلیہ کو بھی بلوایا۔ اور

اعزا کی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی بلایا تھا۔ اختر کے ایک کالج کے ساتھی دوست جو قریب ہی رہتے تھے ان کے گھر والوں کو بھی مدعو کرلیا۔ پروگرام یوں بنا کر رضیہ سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر مضمون پڑھیں گی۔ میں عرفی کا نعتیہ قصیدہ اور رابعہ جوش کی نعتیہ نظم پڑھ کر سنائیں گی۔ ہماری یہ محفل میلاد جس میں صرف خواتین مدعو تھیں بہت کامیاب رہی عزیزوں وغیرہ سبھوں نے شرکت کی تھی۔ ماہر القادری کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ آئیں۔ اختر کے دوست کی بہن (عمرہ پندرہ سولہ سال) اپنے ہاں رہنے والی ایک اور لڑکی ریحانہ کو ساتھ لے آئی تھیں۔ مگر مخدوم کی بیوی نہیں آئیں۔ حالاں کہ ان کے گھر کا دروازہ ہمارے گھر سے ملا ہوا ہی تھا۔ اُن سے ملنے کا مجھے نہ جانے کیوں اشتیاق تھا۔ بہر حال برسوں بعد عزیزوں وغیرہ سے ملاقات ہوگئی۔ مگر ہمارا سوشیل حلقہ بڑھانے کا مقصد کامیاب نہ رہا۔ کچھ فضول سے اعتراضات بھی سننے پڑے خاص کر چچا میاں جن کا خیال تھا کہ ہم شعیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ محض اسی بناء پر کہ جوش کی جو نظم پڑھی تھی۔ اس میں ملّت بے امام کا جملہ آگیا تھا۔ چچا میاں تو پہلے ہی سے بھائی سے ناراض تھے کہ بچوں کو اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ایک دن ملنے آگئے رضیہ رابعہ کو ایک ہندو نوجوان طالب علم سے حساب وغیرہ سیکھتے دیکھ کر زور سے انّ للہ پڑھا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ اور پھر برسوں ہم سے کُجا اپنے بڑے بھائی سے بھی نہیں ملے۔ اور نہ صرف وہ بلکہ خاندان کے کئی اور لوگ بھی بہت خفا رہے کہ لڑکیوں کو پڑھایا جا رہا ہے۔ فجّی چاچا تو ایک دن آستین چڑھا کر ابّا سے لڑنے ہی آگئے۔ تم یہ کیا بے ہودہ حرکت کر رہے ہو لڑکیوں کو اسکول کیوں بھیج رہے ہو رضیہ ریڈیو پر مضمون پڑھتی ہے نامحرم اس کی آواز سنتے ہیں وغیرہ الزامات کی طومار۔ ابّا حسب عادت خاموشی سے ان کی باتیں سنتے اور مسکراتے رہے۔ آخر وہ خوب بک جھک کے بعد غصے سے تن تناتے ہوئے چلے گئے۔ ایک صرف دادا میاں تھے کہ جب ان کو خبر ملی کہ رضیہ اور رابعہ کو اسکول میں شریک کر دیا گیا ہے تو انھوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے بیٹے کو خط لکھا کہ تم نے بہت

اچھا کیا۔ آج کل کے زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے۔ اور ہمت دلائی کہ اچھے اور نیک کاموں میں لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اور ابّی نے واقعی کبھی ایسی فضول باتوں کی پرواہ نہ کی۔ اور اب تو انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی مرضی سے وہ کسی کی شادی نہیں کریں گے اولاد تعلیم حاصل کر کے جس طرح چاہے اپنی زندگی بنائے اور اپنی مرضی سے شادی بیاہ کرے۔

فضی چچا کے ذکر پر یاد آیا کہ اُن کے گھر میں ''جن'' آنے لگے تھے۔ یہ عجیب وغریب جن تھے کہ چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیتے، یا ان کے اوپری حصوں کو جلا دیتے مثلاً، چھپر کی اوپری اوپری گھاس جل گئی۔ صندوق میں کپڑے رکھے ہیں، دھواں نکلتا دکھائی دیا، دیکھا کہ اوپر اوپر کے کپڑے جل گئے۔ اُن دنوں چھوٹے چچا ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھی اُن کے گھر جاتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بتایا کہ شام کے قریب صحن میں بیٹھے تھے، وقت دیکھنے کیلئے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا، گھڑی ندارد۔ بہت تلاش کی، ایسے ہی قریبی امردو کے پیڑ پر جو نظر پڑی تو دیکھا گھڑی ایک ڈالی پر لٹک رہی تھی۔

اُن دنوں کے یہ کارنامے رسالہ ''جن'' کے اوراق کی زینت بھی بنے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم لوگ تو اجنتا چلے گئے۔ یہ سلسلہ کیسے ختم ہوا اور کب، معلوم نہیں۔

خوش گوار انقلاب

عزیز الدین صاحب میں ایک اچھی بات یہ تھی کہ اگر ان کی جیب پر اثر نہ پڑے تو وہ ہمارے کسی معاملے میں دخل نہ دیتے۔ خاص طور پر تعلیم کے سلسلے میں چاہے وہ لڑکوں کی ہو یا لڑکیوں کی انھوں نے ہمیشہ ممکنہ مدد کی۔ ہمارے ادبی مشاغل اور مصروفیتوں کی کبھی مخالفت نہ کی اختر کا حلقۂ احباب خاصہ وسیع تھا۔ اور ان کو شروع سے بڑی سمجھی جانے والی شخصیتوں سے ملنے اور ان سے خط و

کتابت کرنے کا بھی شوق تھا۔ وہ کسی کو گھر بلاتے ہم اندر سے ان کی شاعری کو سنتے تو اس پر بھی عزیز الدین صاحب کو اعتراض نہ ہوتا۔ جب کسی قدر مجھ پر عزیز الدین صاحب کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تو میری ذات کے نہاں خانے میں کچھ کرنے کا جو جذبہ دبا ہوا تھا ابھرنے لگا۔ اپنے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں کو گھر بلانے انھیں دیکھنے، سننے اور ان سے استفادہ کرنے کے شوق کو مہمیز ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے بلائے جانے والی شخصیت نیاز فتح پوری کی تھی۔ ہم نے انھیں چائے پر مدعو کیا۔ اس کے بعد صدق جائسی صاحب کو مدعو کیا جو اختر کے اسکول دارالعلوم میں اردو کے ٹیچر تھے ماہر القادری صاحب سے تو اختر کی دوستی ہوگئی تھی انھیں بھی سُنا گیا۔ اور اب یہ ہونے لگا کہ جوں ہی کوئی پسندیدہ شاعر یا ادیب باہر سے آجاتا تو اسے چائے یا کھانے پر مدعو کیا جاتا۔ رضیہ کا پردہ تو ابتدا ہی سے ختم ہوگیا تھا۔ میرا بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا گو پوری طرح ختم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ سرمایہ ادب سے کتنے ہی رسالے اور کتابیں آنے لگی تھیں۔ اس طرح نئے نئے لکھنے والوں سے تعارف ہونے لگا۔ جانکاری بڑھنے لگی۔ اسی دوران اختر نے "حلقہ احباب" کی بنیاد رکھی ہر ہفتہ ایک میٹنگ ہونے لگی تھی ان میں اختر کے چند مخصوص اور ہم خیال احباب شریک ہوتے تھے۔ میری بہنیں رضیہ اور رابعہ ان میٹنگوں میں شریک رہتی تھیں یہ اپنے لکھے ہوئے مضامین پڑھتیں۔ ان مضامین پر اظہار خیال اور تنقیدیں بھی ہوا کرتی تھیں اختر کے دوست غفور کی بہن جو بے چاری میلاد میں آئی تھیں ان کے ہاں رہنے والی رانی صاحبہ اکثر آنے لگیں معلوم ہوا کہ کسی تعلقہ دار صاحب کی صاحب زادی ہیں۔ ان کے والد نے کسی انگریز خاتون سے شادی کی تھی۔ بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرلی اور بیٹی کو اپنے دوست غفور صاحب کے والد کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ ان کا نام ریحانہ تھا یہ بہت جلد ہم سب سے بے تکلف ہوگئیں خاص طور پر اختر سے۔ پڑھی لکھی بالکل نہ تھیں لیکن انگریزی اچھی بول لیتی تھیں۔

اختر ان سے بہت متاثر ہوئے اور بہت جلد دونوں کا باہمی ربط بڑھ گیا۔ اختر نے میرے

توسط سے ابیؔ سے شادی کی اجازت چاہی۔ ابیؔ کو یہ رشتہ بالکل پسند نہ تھا۔ انھوں نے نہیں تو نہیں کہا مگر اپنی ناراضگی کا اظہار ضرور کردیا۔ رضیہ اور رابعہ کو بھی یہ رشتہ بالکل پسند نہ تھا۔ وہ میری دونوں بہنوں کے ساتھ زیادہ گھلی ملی رہتیں۔ شاید اس بناء پر انھیں ان کے مزاج کا کچھ انداز ہوگیا تھا مگر دونوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ البتہ اختر کے دوست یونس سلیم نے بہت مخالفت کی اور اختر کو سمجھایا ابیؔ نے بھی کہا کہ یہ رشتہ بہت غلط ہے۔ مگر اختر نہ مانے۔ ابیؔ نے اختر کی خاطر بادلِ ناخواستہ اجازت دیدی۔ اور بہت ہی سادگی سے شادی ہوگئی۔ ساتھ رہنے پر انداز ہوا کہ بڑی بدمزاج، غصیلی اور بدفطرت خاتون ہیں۔ میں ان دنوں ان کی طرف دھیان نہ دے سکی مگر رضیہ اور رابعہ ان کی خرافات سے بہت ناخوش رہتیں۔ شادی کے بعد اور بھی کھلنے لگیں۔ ابیؔ، امیؔ سے ہر بات پر بدتمیزی سے پیش آتیں۔ ہر وقت ایک ہنگامہ کھڑا کیے دیتیں اختر کا نشہ بھی جلد اتر گیا۔ مگر اپنی کرنی کو بھگت رہے تھے۔

ابیؔ کو محبوب نگر کے قریب ہمناباد میں مستقل "مجسٹریٹی معہ تحصیل داری" پرانا کام مل گیا۔ جاوید ان ہی کے ساتھ۔ ہمایوں چھ سات ماہ کا بہت پیاری صورت کا صحت مند لڑکا۔ یہ شروع ہی سے بکری کے دودھ پر پل رہا تھا۔ عمر کے ساتھ زیادہ دودھ کی ضرورت تھی جو نہ مل سکا۔ مجبوراً کہنا پڑا کہ کچھ دن کے لیے ایک بکری رکھ لی جائے۔ ان دنوں تو کتنے ہی گھروں میں بکریاں پلی رہتی تھی۔ چار پانچ ماہ کی بات تو تھی ہی؟ لیکن اسے قابلِ عمل نہ سمجھا گیا۔ قریب ہی کوئی فارم تھا وہاں سے گائے کا دودھ آنے لگا۔ جو اسے موافق نہ آیا۔ مسلسل پیٹ میں تکلیف، گھر کے سامنے ہی کوئی "نیم طبیب خطرۂ جان" کے جیسے ایک حکیم رہتے تھے۔ ان کا علاج شروع۔ یہاں مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُن ہی دنوں سروجنی نائیڈو کے لڑکے کئی سال جرمنی میں گذار ایلوپیتھی، ڈاکٹری کے ساتھ ہومیوپیتھی میں بھی ماہر ہوکر اپنی جرمن بیوی کے ساتھ واپس آگئے تھے۔ اختر کا ان سے نہ جانے کیسے

کافی ملنا جلنا ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ بچے کو لے جا کر دکھایا۔ کہا بہت کمزور ہو گیا ہے۔ روز صبح سویرے
کی دھوپ میں زیتون کا تیل مل کر لٹائیں۔ عزیز الدین صاحب کو جب یہ بات بتائی گئی تو بجائے تیل
لانے کے بچے کو عثمانیہ دواخانے لے گئے۔ وہاں بجلی سے گرمی دینا تجویز کیا گیا اس پر عمل شروع
ہو گیا۔ پتہ نہیں اُس گرمی سے یا کیا اس بچے کے ہاتھوں میں کہنی کے پاس سے نیچے تک اور سر میں بیر
میں ساری جگہ پک سی گئی۔ اس سے پانی سا ٹپکتا۔ کھجلی بھی ہوتی۔ ہاتھوں کو تھامے رات دن گود میں
لیے بیٹھے رہنا پڑتا۔ دکیہ بھی ان دنوں پڑھائی کے لیے میرے پاس آ گئی تھی۔ دن کو تھوڑا بہت وہ بھی
دیکھ لیتی۔ اس حالت میں جس نے جو بتایا سب ہی کیا لیکن بے کار۔ دو چار دن ذرا فائدہ سا لگتا پھر
وہی حال۔ دودھ ہضم ہی نہ ہوتا۔ تھوڑا بہت پھل وغیرہ کا عرق دودھ کا بدل تو نہ ہو سکتا تھا۔ اور کوئی
معقول علاج نہ ہوا۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ میری گود میں لیٹا لیٹا ہی ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ اگر بروقت
اچھا علاج ہوتا تو یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ وہ ننھا سا جسم پیوندِ خاک ہو گیا۔ مگر اس کی معصوم آنکھیں لگتا
ہے کہ آج بھی مجھ سے کچھ مانگ رہی ہیں۔ اس سانحہ کے دو چار ماہ بعد ہی اختر نے ملک پیٹ میں
ایک بہت بڑا مکان 50 روپے ماہانہ کرایہ پر طے کیا۔ جس کا باہر کا حصہ ہی تین چار کمروں، نل، فلش،
باتھ روم اور بڑے صحن پر مشتمل تھا۔ اندر کے حصے میں بہت گنجائش۔ کتنے ہی کمرے اور دالان اور کافی
اونچی چھت۔ اختر کے ہاں اس وقت تک ایک لڑکی ہو چکی تھی۔ لڑکی کی پیدائش سے دو ماہ قبل ریحانہ
بیگم کہیں چلی گئیں۔ چار ماہ بعد دو ماہ کی لڑکی کو لے آئیں۔ بتایا کہ بلاری گئیں تھیں۔ وہ خود کو کہتی تھیں
کہ مسلم ہیں۔ لیکن مجھے یوں لگتا کہ کٹر عیسائی ہیں۔ یہاں بھی کانونٹ برابر جاتی رہیں۔ کوئی کچھ نہ کہتا
پھر بھی شاید سوچا ہو کہ یہاں اپنی سی نہ کر سکیں گی۔ پتہ نہیں وہاں کون تھا ہم میں سے کسی نے پوچھ نہ
پوچھا۔ دوسری دفعہ بھی زچگی سے قبل ہی چلی گئی تھیں اور دوسری لڑکی کے ساتھ واپس آئیں۔ بڑی
زرینہ بہت اچھے ناک نقشہ کی تھی۔ لیکن رنگ سانولہ اور مزاج ماں کا' غصہ ناک پر۔ دوسری صبیحہ

صاف رنگ معمولی ناک نقشہ اور بے حد خاموش، بہر حال ان کی یہ حرکتیں تو جاری ہی رہیں۔ اس گھر میں بزم احباب کے جلسے پابندی سے ہوتے رہے۔ ایک دفعہ فینسی ڈریس شو بھی کیا گیا۔ باہر کا ایک بڑا کمرہ اور ورانڈہ اور چبوترا اختر کے قبضہ میں تھا۔ اس کے مقابل کے ایک کمرے میں مسلم ضیائی صاحب پے اِنگ گیسٹ کی حیثیت سے مقیم رہے۔ کرایہ کی زیادتی کا بوجھ بھائی بہنوں نے لے لیا۔ لطیف الحسن صاحب کی آمد و رفت اس درمیان کافی بڑھ گئی تھی۔ ان کی ترغیب پر ہم چاروں بہنیں مع امی اور جاوید کے "جو چار سال کا ہو رہا تھا"۔ آٹھ دن کے لیے بمبئی کی سیر کو گئے۔ وہاں ان کے ایک بھائی ملازم تھے۔ ان کے وہاں ٹھہرے۔ صرف دو کمروں کا گھر۔ وہ میاں بیوی اور تین لڑکے۔ دن بھر تو ہم سب باہر ہی رہتے مگر رات گھر پر۔ وہ سب لوگ صرف ایک کمرے میں۔ لیکن میاں بیوی دونوں ہی بہت متواضع اور بہت شریف۔ اب خیال آتا ہے کہ برنی شاید ہم لوگوں کو اپنے کسی فردِ خاندان سے ملانا چاہتے تھے۔ ان کی ماں اور چار بھائی دلی ہی میں رہتے۔ یہ ایک بمبئی میں۔ دوسرے ایک شریف الحسن صاحب تعلیمات کے شعبہ میں بیدر میں مقیم۔ برنی تعلیم کے لیے ان ہی کے پاس رہے۔ وہاں سے واپسی کے کچھ ہی دن بعد رابعہ کی شادی ان سے ہوگئی۔ شریف بھائی بیوی بچوں کے ساتھ کچھ دن کے لیے حیدرآباد آگئے تھے۔ یہاں ان کے دو چچازاد بھائی الیاس برنی اور ادریس برنی بھی رہتے تھے۔ رابعہ رخصت ہو کر الیاس برنی کے گھر ہی لے جائی گئی تھی۔ شریف بھائی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ کافی روشن خیال اچھے آدمی اور ان کی بیوی بھی بہت ملنسار۔ رابعہ ان کے ساتھ کچھ دنوں بیدر بھی جا کر رہیں۔ بی اے کا آخری سال۔ واپس آ کر پھر پڑھائی میں مصروف۔ برنی بی ایس سی کر چکے تھے۔ مگر ابھی بے کار تھے۔ رابعہ پڑھتی تو رہی مگر امتحان نہ دے سکی۔ پہلے پرچہ کے دن ان کے ہاں لڑکی تولد ہوگئی۔ اختر نے اس کا نام شہلا تجویز کیا۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی تیز تر مگر ہمارا شہر نظام

شاہی کے شکنجے میں جکڑا گم سم۔ نہ کوئی حرکت نہ تحریک اختر قاضی صاحب کے اخبار پیام میں کچھ کام کرتے رہتے۔ بزم احباب کے ایک جلسے میں قاضی صاحب کو بھی بلایا گیا۔ اس میں رضیہ نے اپنا ایک افسانہ دادی اماں پڑھا۔ جو مجلہ عثمانیہ میں چھپا بھی۔ رابعہ نے اقبال کے تصورِ نسواں پر مضمون سنایا جو قاضی صاحب کو بہت پسند آیا۔ اور پیام کے سنڈے ایڈیشن میں چھپا بھی۔ ذکیہ نے ایک مزاحیہ کہانی ٹیڑھی کھیر بھی سنائی۔ ایک شب ماہ بھی بہت زور و شور سے منائی گئی۔ جس میں برنی اور اختر کے ایک کائست دوست بھی شریک تھے۔ جس کی شادی میں اختر و برنی ڈلھا وغیرہ کے ساتھ بریلی تک گئے تھے۔ میں اس ہنگامے کی خاموش تماشائی۔ جاوید کا پانچواں سال شروع۔ باقاعدہ پڑھائی ضروری۔ ابیّ نے اردو تو خاصی پڑھا دی تھی۔ یہاں گھر کے سامنے ہی ایک اسکول جہاں دوسری جماعت میں لے لیا گیا۔ اب پھر دوسری دفعہ اپنی قسم توڑنی پڑی اور کہا کسی اچھے اسکول یا کانونٹ میں شریک کروائیں۔ کانونٹ کا خیال یوں آیا کہ ریحانہ بہت اصرار کر کے مجھے وہاں لے گئی تھیں۔ بہت صاف، ستھرا اور بہت اچھا مگر نتیجہ میں نے اس کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دی۔

جنگ کا زور، لوگوں کی اس تعلق سے باتیں، بہتوں کو ہٹلر کی کامیابی کا یقین۔ میں سب کی مخالف۔ خاص کر رشیا کی شرکت کے بعد سے ہی اس کی کامیابی پر پورا بھروسہ۔ بعض دفعہ تو میری رائے کا مذاق بھی اڑایا جاتا لیکن مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی تو بہتوں نے ایسا ہی سوچا تھا۔ پر ہوا کیا؟............ ان دنوں نگار کے علاوہ کتنے ہی اور رسالے آنے لگے تھے۔ دونوں فریقین کی مخالفت اور موافقت میں ہر طرح کے مضامین۔

XX XX XX

باہر سے آنے والوں کو مدعو کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں تک یاد ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب یہاں آئے ہوئے تھے تو انھیں بلانا طے پایا۔ علی گڑھ کے اردو کے پروفیسر رشید احمد صدیقی

صاحب کا ایک مضمون ''مرشد'' کے نام سے شائع ہوا تھا ''نگار میں''۔ اُس کو پڑھ کر ان کا جو کردار سامنے آیا وہ مجھے تو بہت اچھا لگا تھا۔ بلا تو لیا مگر کچھ ان کی دل چسپی کا بھی تو سامان ہونا چاہیے۔ چناں چہ دو شاعروں مخدوم اور نظر کو بھی بلایا گیا۔ مجھے تو اس وقت چلمن کے پیچھے ہی رہنا ہوتا۔ رضیہ اور رابعہ بھی میرے ساتھ ہی رہیں۔ نظر تو سامنے ہی بیٹھے تھے مگر مخدوم کچھ ایسی جگہ پر تھے کہ دکھائی نہ دیے۔ انھوں نے اپنی نظم ''اندھیر'' سنائی۔ ہم جوش اور اختر شیرانی کے شیدائی۔............ باڑھ کے تار ....ان میں الجھے انسانوں کے جسم...... گِدھ یہ کیسی نظم......؟ لیکن جب یہ مصرعہ دُہرائے گئے تو یوں لگا کہ یہ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ کتنی ہی نظموں پر بھاری۔ جنگ کی ہولناکیوں کی یہ تصویر تو شاید ایک تفصیلی کتاب پڑھ کر بھی سامنے نہ آئے اور نہ اتنا اثر کرے اور پھر آواز کا جادو۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے بہت پہلے کہیں میں نے سنی ہے۔ ابتدائی دو شعر تو اسی وقت یاد ہوگئے مگر پوری نظم پڑھنے اور اس کے لکھنے والے کو دیکھنے اور ملنے اور پھر سننے کا اشتیاق۔ ہر خواہش کی طرح اسے بھی دل ہی میں دبا دینے کے علاوہ کیا چارۂ کار۔ نظم تو دوبارہ تقریباً چار سال بعد سرخ سویرا کی اشاعت پر پڑھنے کو ملی۔ لکھنے والے کو دیکھنے کے لیے دو سال اور انتظار کرنا پڑا۔...... یہاں گھر میں ملنے جلنے والوں کا حلقہ کچھ بڑھ رہا تھا۔ دو نئے خاندانوں سے ربط ہوگیا۔ ایک یحیٰی خان صاحب دلی کے قریب لوہارو کے کسی قصبے کے رہنے والے۔ غالباً بہ سلسلہ روزگار ہی ان کے باپ دادا بھی یہاں آئے تھے۔ یہ اور ان کے کئی عزیز محکمہ آب کاری میں اچھے عہدوں پر تھے۔ ان کی دو بڑی لڑکیاں لیاقت خانم اور ریاست خانم، رضیہ اور رابعہ کی ہم کلاس تھیں۔ اور یوں یہ میل جول پیدا ہوا اور ربط ضبط بڑھتا گیا۔ چند ہی دن میں یہ لوگ بالکل عزیزوں جیسے لگنے لگے۔ پردہ وردہ سب ختم۔ یحیٰی خان صاحب کافی روشن خیال غالباً علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان لوگوں کو ڈراموں اور گانے وغیرہ سے بھی دل چسپی تھی۔ تیسری بہن شوکت خانم کم عمر مگر بنجاروں کی نقل کرنے اور گانوں میں مشاق رابعہ کی شادی میں ان سب کی وجہ

سے کافی ہنگامہ رہا۔......

اُن ہی دنوں ایک بنگالی ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہوگیا۔ چھوٹے قد، گداز جسم، سانولے رنگ اور دھیمی آواز میں بات کرنے والے۔ ابوالفضل نامی یہ ڈاکٹر دس بارہ برس جرمنی میں رہ کر ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک دونوں کے ماہر ہوکر اِدھر اُدھر گھومتے گھامتے اب حیدرآباد آئے اور اکیلے رہتے تھے۔ عربی کے بھی اچھے عالم تھے۔ یہاں ساگر ٹاکیز کے سامنے دواخانہ کھولا تھا۔ بہت کم آمیز اور کسی کے ہاں جاتے آتے نہ تھے مگر ہم لوگوں پر بہت مہربان۔ رضیہ کو تو خاص کر اچھی خاصی ہومیو پیتھی کی تعلیم دی تھی' بعد میں رضیہ کے علاج سے کئی لوگوں کو فائدہ بھی ہوا۔ قرآن کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ اور بہت ترقی پسندانہ۔ اس کی تشہیر ہوتی تو شاید کفر کا فتویٰ لگ جاتا۔ ہم لوگ اصرار کرتے تو کبھی کبھار دو تین دن رہ بھی جاتے تھے۔ یوں جے سوریہ کے بعد پھر ایک ڈاکٹر سے سابقہ پڑا۔

XX XX XX

اس درمیان اختر کو ورنگل میں لکچراری مل گئی۔ یہاں لوگوں کو بلانے اور محفلیں سجانے والا کوئی نہ رہا۔ اور وہاں ان کا جی نہ لگتا۔ ریحانہ صاحبہ کا برتاؤ دن بہ دن ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ بڑی لڑکی کو وہ بہت چاہتی تھی۔ لیکن صبیحہ سے نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر۔ بری طرح مارتی رہتی۔ بے چاری تین سال کی بچی وہ گھر کے دروازے پر بیٹھی رہتی۔ اختر کے انتظار میں۔ سال بھر کے اندر ہی وہ ایک دن بڑی بچی کو لے کر حیدرآباد کانونٹ میں آ گئی۔ اختر دو تین دن کی چھٹیوں میں دوسری کو لے کر ہمارے پاس آئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن کوئی رات آٹھ بجے کے قریب میں بچی کو کھانا کھلا رہی تھی کہ ریحانہ صاحبہ تیز تیز چلتی آئیں اور بچی کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتی ہوئی اسی تیزی سے واپس۔ کچھ دیر بعد اختر آئے اور سن کر چپ رہ گئے۔ آخر تصفیہ یہ ہوا کہ وہ الگ ہوکر کانونٹ میں رہے گی۔ اختر جب چاہیں لڑکیوں سے ملنے آسکتے ہیں۔ دوبارہ جب اختر آئے اور ملنے گئے تو وہاں کسی کا پتہ نہ تھا۔ بہت

کوشش کی کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ کہاں گئیں۔ یوں ان سے جان چھوٹی۔ لڑکیاں یاد آتیں پر کیا کرسکتے۔..........

مجھے یوں لگتا کہ ریاست اختر کو پسند کرتی ہیں۔ اب رفتہ رفتہ یہ پسندیدگی دوطرفہ ہوگئی۔ ریاست کے والدین نے پہلے تو اسے ٹھیک نہ سمجھا مگر پھر راضی ہوگئے۔ اور یوں ہم سب کی مرضی اور خوشی سے یہ تقریب بہت سادگی سے ہوگئی۔ دونوں ورنگل روانہ۔ گھر میں پھر سناٹا۔ مگر جلد ہی میری ذمہ داری میں اضافہ ہوا یوں کہ ہماری مقطہ والی خالہ بہت بیمار ہوکر میرے ہاں آگئیں۔ ان کے ساتھ بڑے لڑکے جو پاشا بھائی پکارے جاتے۔ میں ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی سردار نامی اور اس سے چھوٹے دو بھائیوں محمود اور حفیظ کے ساتھ۔ ماں تو دو تین ہفتوں ہی میں رخصت ہوگئیں اور یہ چاروں مستقلاً یہیں گھر بڑا کمرا خالی رہنے میں کوئی دقت نہیں۔ مگر..............؟ ظفر اُن دِنوں سٹی کالج کے اسکول میں شاید چھٹی کلاس میں تھا۔ حفیظ کو بھی وہیں شریک کروایا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مخدوم کچھ دنوں کے لیے وہاں پڑھانے لگے تھے۔ یہ بات ان ہی بچوں سے معلوم ہوئی تھی کہ کس طرح وہ اپنی نظمیں بھی سنایا کرتے تھے۔..........

XX XX XX

ابی ان دنوں بھالکی میں برسر کار تھے۔ اس بار چھٹیوں میں شب ماہ وہیں منائی گئی۔ تب تک اس تقریب میں یہ اضافہ ہوچکا تھا کہ باقاعدہ جگہ گھیری جاتی اور کسی کو چاند کی دیوی بنا کر ایسی جگہ بٹھاتے کہ چاند کے ذرا اُبھرتے ہی اس کی روشنی دیوی پر پڑے۔ اور ہم چند افراد ہار و ہاتھوں میں شمع لیے نکلتے۔ چاند کی روشنی پڑتے ہی شمع بجھا کر دیوی کو ہار پہنچائے جاتے اور پھر.......... صبح غروب قمر کے موقع پر سب ہار پھول کسی ندی نالے پر جاکر بہادیتے۔ کہنا یہ کہ اس دن جب دیوی کے درشن کو چلے تو گاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ......مخدوم کا ترانہ جنگ آزادی..........

برنی کے بڑے بھائی شریف الحسن صاحب ان دنوں بیدر میں مقیم تھے۔ ابی نے ان سب کو بلا رکھا تھا تو یہ ان کی بیوی پانچ چھ بچے سب ہی ہمارے اس کھیل میں شریک۔ دس پندرہ دن خوب گڑبڑ رہی۔ چھٹیوں میں اختر وریاست وغیرہ سب ہی جمع ہو جاتے۔

پاشا بھائی نوکری کی تلاش میں تھے۔ وہ تو ملی نہیں ہاں ان کے تایازاد بھائی کی بیوی نے ایک جگہ رشتہ طے کر دیا۔ مجھے اور امی کو ساتھ لے جا دلھن بیاہ لائیں۔ میرے پاس ایک اور فرد کا اضافہ۔ آمدنی میں تو کہیں سے ایک پیسہ کا اضافہ بھی نہ ہوا۔ سردار ہوشیار لڑکی تھی۔ مجھ سے دست کاری سیکھتی اور اردو پڑھتی رہی۔ مقطعہ میں صرف ایک منجھلے بھائی ''جو نواب جانی کہلاتے تھے'' رہ گئے تھے۔ سال بھر بعد ہی پاشا بھائی کے ہاں ایک لڑکی ہوئی۔ اس کی پیدائش کے تین چار ماہ بعد ابیؔ نے انھیں اپنے آفس میں نقل نویسی وغیرہ پر رکھ لیا تھا۔ سو یہ دونوں وہاں چلے گئے۔ محمود لمبا اور بہت بے وقوف سا یہاں دو تین تایازاد بھائی جو رہتے تھے کبھی ان کے اور کبھی میرے ہاں رہنے لگا۔ سردار اور حفیظ مستقلاً میرے ساتھ۔

گھر بہت بڑا تھا رہنے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ منجھلے بھائی نواب جانی وہ مقطعہ ہی میں کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بڑے بھائی کو کچھ بھیج بھی دیتے۔ اوپری اخراجات کو چھوڑ کر کھانے پینے کی ذمہ داری میری تھی۔ چھوٹا بھائی حفیظ ظفر کی عمر کا تھا۔ سال ڈیڑھ سال بعد ڈاکٹر ابوالفضل صاحب نے سردار کو اپنے دواخانے میں کچھ کام پر لگا دیا۔ وہاں ایک اور صاحب بھی کام کرتے حضوری پکارے جاتے وہ سردار کے خواست گار ہوئے سردار بھی تیار تھیں یوں ان دونوں کی شادی ہوگئی حضوری کچھ دنوں بعد بس کنڈکٹر ہو گئے۔ اور بعد میں نظام آباد پھر گلبرگہ تبادلہ ہو گیا۔ سردار گلبرگہ کے فسادات میں ماری گئیں تب تک اس کے پانچ بچے ہو چکے تھے چار لڑکیاں ایک لڑکا۔ لڑکیوں کو بچپن ہی سے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ سردار کی موت کے بعد بڑی لڑکی نے تقریباً ماں

کے فرائض انجام دیے۔ خود تعلیم حاصل کی اور بھائی بہنوں کو بھی اچھی تعلیم دلوائی۔ اب صرف حفیظ مستقلاً ہمارے ساتھ رہا۔ اور سب تو یہاں حسبِ معمول چل رہا تھا۔ لیکن جنگ کی تباہ کاریوں کا اثر تقریباً ہر چیز پر ہوگیا تھا۔ جنگ آزادی میں شرکت کی خواہش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ مگر ہمارا شہر بڑے آرام سے تھا جیسے سو رہا ہو۔ میرا پردہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ گھر سے متصل کسی یار جنگ صاحب کا گھر تھا۔ ان کے ہاں سے کسی کی شادی کا رقعہ آگیا۔ میں کہاں جاتی اُن سے جان نہ پہچان۔ مگر عزیز الدین صاحب نے خاص طور پر شرکت کی تاکید کی تو چلی گئی۔ ان کا پھاٹک گھر سے لگا ہوا تھا۔ ایک دو ہفتے بعد پوچھا گیا کہ شادی میں کیسے گئی تھیں۔ کیا مطلب بازو ہی تو گھر ویسے ہی چلی گئی...... خاموش رہے۔

سرمایۂ ادب

اس نام سے ایک فنڈ قائم کیا گیا تھا۔ اور ہر فرد ماہانہ ایک مقررہ رقم جمع کروادیا کرتا۔ اس سے کتابیں اور رسائل وغیرہ خریدے جاتے۔ اب نگار کے علاوہ "ہمایوں"، "نیرنگِ خیال"، "ساقی" ادیب وغیرہ کتنے ہی رسائل آنے لگے۔ ہمایوں اور ساغر نظامی کا "ایشیا" کافی اچھے رسالے تھے۔ سوشلزم یا کمیونزم کے تعلق سے کوئی خاص معلومات تو نہ تھیں لیکن مختلف مضامین وغیرہ کے وسیلے جو بھی حاصل تھیں ان ہی کی بنا پر یہ اپنی پسند بن گیا۔ جنگ کی خبروں پر اکثر افراد جرمنی کی فتح کا خیال ظاہر کرتے مگر میں روس کی فتح پر یقین ظاہر کرتی۔ بہرحال اپنے ملک میں کمیونسٹ تحریک کے تعلق سے کوئی علم نہیں تھا۔ یہاں تو کانگریس ہی سب کچھ گاندھی جی سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی۔ جس کا غالباً ایک سبب یہ رہا ہوگا کہ سبھاش چندر بوس جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ کانگریس کے صدر چنے گئے تو گاندھی جی نے کسی طرح انھیں صدارت سے ہٹوادیا تھا اتنا ذہن میں تھا تفصیلات جاننے کی

خواہش رہی مگر وہ جو ایک بری عادت کچھ نہ پوچھنے کی تھی ہمیشہ آڑے آتی رہی۔ ہاں البتہ جواہر لعل نہرو اور حسرت موہانی واقعی روشن خیال روشن دماغ لیڈر تھے۔ ہم بہن بھائی تقریباً ہم خیال تھے۔ 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے تحت سارا ملک حرکت میں تھا۔ مگر ہمارے پڑھے لکھے لوگ...... رضیہ اور رابعہ کالج سے آکر بتاتیں کہ وہاں طالبات کو پتہ ہی نہیں تھا کہ دُنیا تو کُجا، ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ اسی نئی تحریک کے متعلق بات کی تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ اب پاکستان کی بات بھی کافی زور و شور سے شروع ہو گئی تھی۔ مجھے پاکستان کا نام تک پسند نہ تھا۔ یوں لگتا گویا صرف مسلمان ہی پاک ہیں۔ اور ساری دنیا ناپاک؟ اور پھر پاکستان کا کوئی واضح خاکہ بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی خیال ہوتا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہیں پاکستان بنے گا۔ جیسے پنجاب سندھ وغیرہ۔ اور مجھے اصلی ہندوستان شمالی ہندوستان لگتا اتر پر دیش وغیرہ۔ اپنی پرانی تہذیب اور ان کی نشانیاں، تاج محل، لال قلعہ، قطب صاحب کی الاٹ، جامع مسجد اور ایسی ہی کتنی یادگاروں کا حامل۔ تقریباً سارے ہی اچھے لکھنے والے شاعر و ادیب وغیرہ۔ بھی زیادہ تر شمال کے رہنے والے۔ یہاں دکن میں عام طور پر ہندوستانی کہنے کا مطلب شمالی ہندوستان کے لوگ ہی ہوتے یا پنجابی کو کہا جاتا۔ غرض اس پاکستان کے مطالبہ سے کبھی مجھے دل چسپی نہیں رہی۔ ہاں حسرت چچا کی فیڈریشن کی اسکیم ٹھیک لگتی تھی۔ اور اس پر عمل ہوتا تو شاید ناقابل بیان خون خرابہ نہ ہوتا۔ یہاں ''پیام'' کے نکلتے ہی ''رہبر'' کی جگہ اسے منگایا جانے لگا تھا۔ قاضی صاحب کا انداز تحریر ہم سب کو بہت پسند تھا۔ ان کی سبھی کتابیں خریدی گئیں۔ اپنی ساری بے عملی اور بے کاری کو مطالعۂ کتب کی نذر کر کے یا باہر سے آنے والوں کو کبھی کبھی مدعو کر کے وقت گذارا جاتا رہا۔ رشید احمد صدیقی کے مضمون ''مرشد کے نام سے'' جو ماہ نامہ نگار میں چھپا تھا۔ پڑھ کر ڈاکٹر ذاکر حسین بہت اچھے لگے تھے۔ ''نیاز'' اور ذاکر حسین صاحب ایسے بڑے لوگ ایک طالب علم کے بلانے پر بلاتکلف آ گئے تھے۔ بہت بڑی بات لگی تھی۔ یہ غالباً 1941ء42 کا واقعہ

ہے۔ جب ذاکر حسین صاحب کو بلایا تھا۔ تب تک مجھے پردے میں رہنا پڑتا۔ چلمن کے پیچھے۔ میری خاطر رضیہ اور رابعہ بھی آنے والے کی تواضع کیسے کی جائے یہ طے کرلیا۔ چناں چہ دو شاعروں، مخدوم اور نظر حیدر آبادی کو بھی بُلایا گیا۔ نظر تو لڑکے ہی سے لگے۔ مخدوم کچھ ایسی جگہ تھے کہ دکھائی نہ دئے۔ انھوں نے اپنی نظم ''اندھیرا'' سنائی۔ یہ نظم کتنی عجیب اور نئی فضا کی حامل۔ نظم میں باڑھ کے تاروں سے الجھے جسموں اور لاشوں کا ذکر۔۔۔۔ جوں جوں سنتی گئی یوں لگا اس تازہ اور توانا نظم کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُترنے لگا ہے۔ ذہن و دل پر جنگ کی تباہ کاریوں کا کبھی نہ مٹنے والا نقش پیش کرنے والی لافانی تخلیق تھی یہ نظم۔

جاوید کی تعلیم

جاوید چار سال کا ہوگیا تھا۔ اردو پڑھنے لگا تھا۔ ابیؑ کے پاس ان کے خوب ناز ونخرے ہوتے۔ تین سال کی عمر ہی سے گھوڑ سواری کا شوق، پٹیل پٹواریوں کے گھوڑوں پر گھومنا۔ ساتھ میں دو دو چپراسی ہوتے۔ اب یہاں اسکول میں شرکت کے لیے بلایا گیا تو ابیؑ نے اس کے ساتھ ایک ٹٹو بھی بھیج دیا۔ یہاں اُسے کون رکھتا یاد نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ بچے کی تعلیم کا معاملہ تھا پہلے بھی ایک وقت اپنا عہد توڑ کر میں نے بکری پالنے کو کہا تھا۔ اور نتیجہ بھی دیکھ لیا تھا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ گھر کے سامنے ہی کے ایک خانگی اسکول میں داخل کروایا جانے لگا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہہ بیٹھی کہ کانوینٹ یا کسی اچھے اسکول میں شریک کروائیں۔ نتیجہ وہی۔ اردو جاننے کی وجہ سے دوسری یا تیسری جماعت میں لے لیا گیا۔ اس کے والد صاحب کی غالباً صرف ایک خواہش تھی اپنے ذاتی مکان کی تعمیر جو پوری ہونے کو تھی۔ ملے پلی نامی ایک غیر آباد محلے میں ملازمین سرکار کی بنائی ہوئی کوآپریٹیو کے تحت مکان بن گیا تھا۔ یہاں ابھی لائٹ، نل، ڈرینیج وغیرہ کچھ نہ تھا۔ مگر انھیں اپنے مکان میں رہنے کی خواہش

تھی۔ چناں چہ نئے مکان میں آ گئے۔ یہ محلہ ملک پیٹھ سے بہت دور تھا۔ اسکول سے بچے کا آنا جانا
مشکل ہو گیا۔ اسکول میں رہائش کا انتظام بھی تھا۔ چناں چہ جاوید کو وہاں رکھ دیا گیا۔ مگر وہ جب بھی گھر
آتا روتا ہوا جاتا۔ اکثر دفتر سے اُٹھ کر اس سے ملنے چلے جاتے۔ ایک دن وہاں گئے تو دیکھا کہ لڑکا
غائب تب معلوم ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہی سے نہیں ہے۔ پریشان حال گھر لوٹے شام
ہو چکی تھی۔ وہ گھر ہی نہ آیا تھا۔ اسی سوچ میں تھے کہ کیا کیا جائے، دیکھا کہ بڑے بھائی کے داماد بچے کو
لیے چلے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی ٹیچر نے بُرا بھلا کہہ دیا۔ اُسے اور کسی گھر کا راستہ تو معلوم نہ تھا
چپکے سے نکل کر تایا صاحب کے گھر چلا گیا۔ بری حالت میلا کچیلا۔ اس کے بعد شاید کچھ سمجھ آئی کہ
اسے لے جا کر گرامر اسکول میں شریک کروایا مگر وہاں اسے دوسری جماعت میں لیا گیا اور اس طرح
اس کے تین سال خراب ہو گئے۔ ذہن اچھا تھا کبھی ٹیوٹر وغیرہ نہ رکھنا پڑا۔ ہمیشہ پاس ہوتا رہا۔ ملے
پلی کا محلہ اس وقت بالکل سنسان تھا کچھ مکانات تھے۔ تھوڑے سے فاصلہ پر ایک مسجد تھی رکشہ وغیرہ
بھی وہیں ملتے۔ یہاں ہم پیدل ہی باہر نکل پڑتے اب جہاں وجے نگر کالونی ہے یہاں گولف کا ایک
بہت بڑا کھلا میدان تھا۔ انوار العلوم کی صرف چار دیواری تھی سن 43ء کے آخر میں اس گھر میں منتقل
ہو گئے جہاں پینے کے پانی کی تکلیف اور دو ڈھائی سال تک قندیل کی روشنی میں آنکھیں پھوڑیں
نتیجہ ندارد۔ آج یہ محلہ جتنا گنجان اور پُر شور ہو گیا ہے اُس وقت اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔
پارک برائے نام مسجد تھوڑی دور اس کے آگے کم کرایہ کے آرائشِ بلدیہ کے مکانات A، B اور C
کلاس کے۔

جمال النساء اپنے والدین، بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ، بائیں جانب جمال النساء کے شوہر عزیز الدین احمد صاحب فرش پر جاوید اقبال (فرزند)

مخدوم محی الدین، کیف اعظمی، ریاست خانم، جمال النساء، اختر حسن، شاہینہ اختر و ایمن اختر
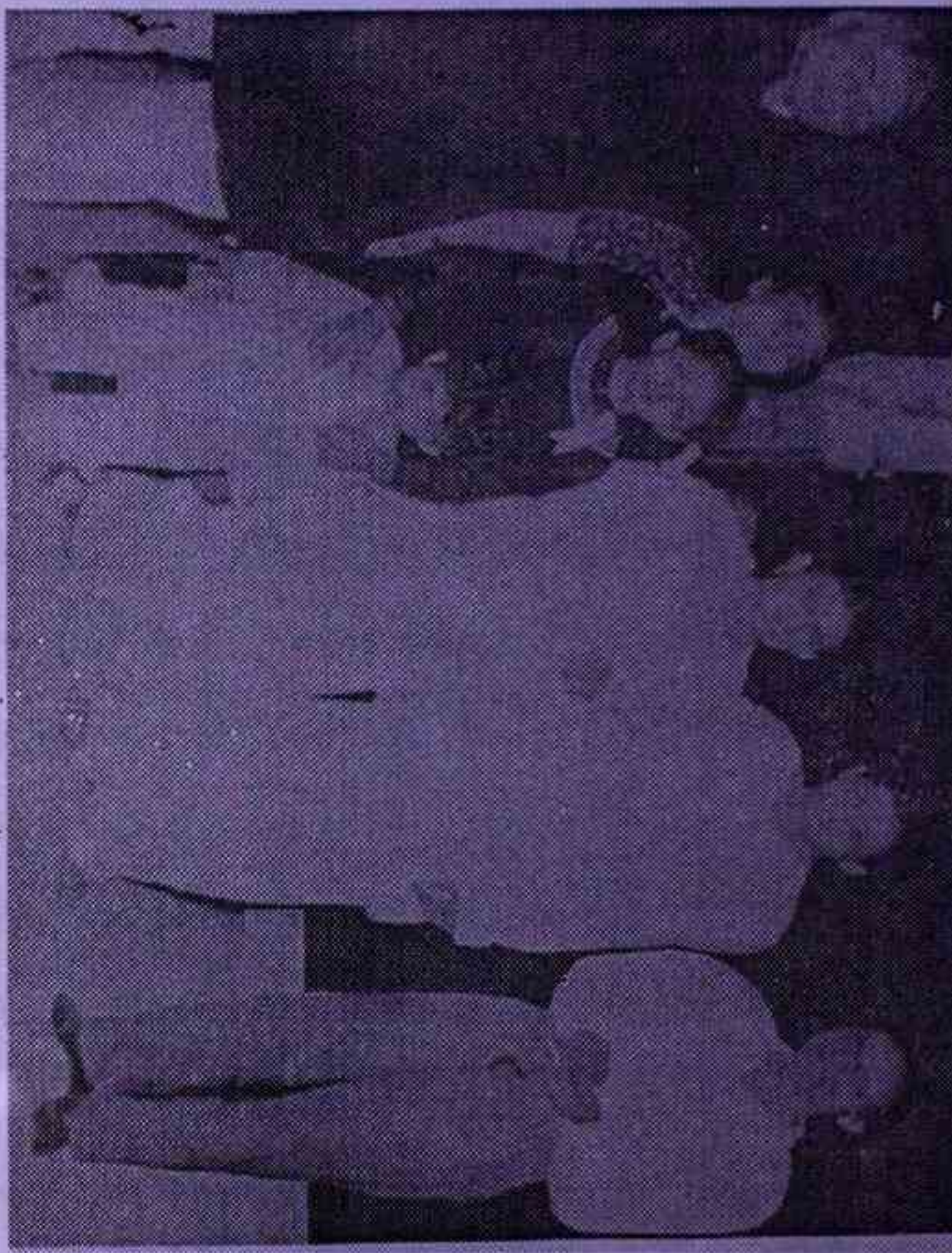
حسرت کا قیامِ حیدر آباد

نہ جانے کیوں حسرت چچا 41ء یا 42ء میں کچھ عرصہ کے لیے حیدر آباد آ گئے۔ یہاں بھی ان کے بہت چاہنے والے تھے جب انھوں نے پوچھا کہ اُنھیں کس چیز کی ضرورت ہے انھوں نے کہا کہ صرف ایک چھوٹا سا مکان رہنے کو مل جائے کافی ہے یہاں مسجد کے قریب سی کلاس کا ایک مکان الاٹ کر دیا گیا اور وہ اپنی بیوی حبیبہ بیگم اور بچوں کے ساتھ یہاں رہنے لگے یہ حبیبہ بیگم ابی کے سگے ماموں حکیم الیاس صاحب کی لڑکی تھیں جو اپنے تایا کے لڑکے محمد ادریس صاحب کے لڑکے سے بیاہی گئی تھیں۔ ان سے ان کے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو بیوی بچوں کا سہارا نہ رہا۔ حکیم ادریس صاحب تو بہت پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ حسرت چچا کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھیں۔ حسرت چچا نے ان سے عقد کر لیا ان صاحبہ سے بھی ان کے یہاں ایک لڑکی ہوئی جس کا نام خالدہ بیگم رکھا تھا۔ ہم سب ملنے کے لیے آئے تو دیکھا کہ ایک پلنگ کے نیچے لیٹے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ایک کمرے کا یہ گھر جس میں چھ سات افراد کی رہائش۔ دروازے کے سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ جہاں تین چار کرسیاں پڑیں ہوئیں اور جب دیکھو دو تین کاریں کھڑی ہوئی۔ بڑے بڑے سمجھے جانے والے یہ لوگ اس فقیر منش انسان سے ملنے آتے رہتے۔ نماز کا وقت ہوتا تو دو چار منٹ کے لئے ان سے اجازت لے کر نماز پڑھتے۔ ہمیں تعجب کہ اتنی جلدی کیسے پڑھ لیتے ہیں۔ چناں چہ ایک دن اختر نے پوچھ ہی لیا کہ آپ اتنی جلدی نماز کیسے پڑھ لیتے ہیں۔ جواب ملا کہ ہم نے ایک ترکیب نکالی ہے جس طرح سے بسم اللہ سے اعداد نکالے گئے ہیں۔ اسی طرح ہم نے کچھ سورتوں کے اعداد نکال لئے ہیں اور ضرورت کے وقت ان ہی سے کام لیتے ہیں۔ کوئی سال بھر کے قریب وہ یہاں اپنی سیاسی مصروفیتوں سے بالکل الگ رہے۔ جاتے وقت مکان میرے منجھلے چچا نظام الحسن صاحب کے نام کر دیا...... حسرت چچا مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ مجھے ان کے اکثر خیالات سے

اتفاق ہوتا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں آزادی کی تحریک تیز ہورہی تھی۔ اور ہر پارٹی کے سامنے ایک مقصد تھا ہندوستان کو انگریزوں سے نجات دلانا۔ اندازہ ہوا کہ انھیں آزادی کی لگن ادھر ادھر لے جاتی ہے۔

انگریزی کی پڑھائی

اختر نے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ شروع کیا۔ مگر آدھا کر کے چھوڑ دیا۔ میں کتاب شروع کرتی تو جب تک ختم نہ کرتی چین نہیں پڑتا۔ اب اِسے کیسے ختم کیا جائے؟ سوچا کہ انگریزی سیکھنی چاہیے۔ چناں رضیہ اور اختر استاد بنے۔ گرامر ختم ہونے پر پہلی کتاب پڑھی یا نہیں یاد نہیں ہاں یہ یاد ہے کہ پہلے اس ادھوری کتاب کو ختم کیا۔ پھر کافی بڑی بڑی کتابیں مثلاً وار اینڈ پیس (WAR & PEACE) انا کرینینا (ANNA KARENINA) وغیرہ پڑھیں۔ ایک عادت خراب تھی یہ کہ ڈکشنری سے مدد نہ لی۔ نہ جانے کیسے پڑھ لیتی کچھ معنی ربط عبارت سے سمجھ میں آجاتے اور کچھ رضیہ اور اختر سے۔ ختم کر کے دوبارہ پڑھنے سے زیادہ سمجھ میں آجاتی۔ اس طرح اُن ہی کتابوں کو دو دو تین تین بار پڑھا تلفظ اور لکھنے کی مشق بالکل نہیں۔ ملے پلی منتقلی ہونے پر سوچا تھا کہ لکھنے کی مشق ضرور کروں گی۔ یہاں پر میرا کوئی الگ کمرہ ہی نہیں تھا۔ ورانڈے میں ایک طرف دو پلنگ بیچ میں ایک تخت مشین اور سلائی وغیرہ کا سامان کوئی ملنے جلنے والا آجاتا تو وہیں بٹھا دیا جاتا۔

کچھ دنوں کی ملازمت

ذکیہ نے اسکول کی پڑھائی چھوڑ دی تھی حساب میں کمزور ہونے کی وجہ۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک خانگی ادارہ کھلا تھا اس میں منشی فاضل کے علاوہ علی گڑھ میٹرک تعلیم کا انتظام تھا۔ رضیہ نے یہاں ذکیہ کو شریک کروایا۔ نام پلی ہائی اسکول کی ریٹائرڈ پرنسپال یہاں کام کر رہی تھیں انھوں نے رضیہ سے اردو پڑھانے کو کہا۔ رضیہ ویمنس کالج میں لکچرار ہوگئی تھیں انھوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ اور میرا نام لے لیا۔ میں نے کبھی اسکول کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ انھوں نے اس تجویز کو قبول کرلیا۔ عزیز الدین صاحب نے بھی مخالفت نہ کی۔ یوں میں دوپہر کا کھانا کھا کر ذکیہ کے لیے ٹفن لے جاتی اور شام میں ذکیہ کے ساتھ واپس آجاتی۔ مجھے پڑھانا کچھ مشکل نہ لگا اور پڑھنے والے مطمئن رہے۔ مگر اپنی بے علمی پر افسوس تھا۔ رضیہ اور اختر نے کہا کہ منشی فاضل کرلوں اس کے بعد انگریزی کا پرچہ کرلوں تو بی اے کی ڈگری مل جائے گی۔ میں تیار ہوگئی کتابوں کی فہرست کافی لمبی چوڑی دو چار منگوالیں عربی کی مع ترجمہ ضرور منگوانی پڑی مضمون اختیاری میں نے تاریخ اسلام لے لیا پتہ چلا کہ اس تعلق سے کوئی خاص کتاب نہیں ہے۔ مجھے اپنے مطالعہ تاریخ پر بھروسا تھا۔ عربی کی کتاب ترجمے کے ساتھ پڑھی۔ اور کسی کتاب پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ صبح سے دوپہر تک گھر کے کام کاج، دوپہر سے سہ پہر تک اسکول میں پڑھانا۔ اس کے بعد گھر پہنچ کر تھوڑا بہت وقت پڑھنے میں پھر بھی ریاست بھر میں اول درجے سے پاس ہوگئی۔

دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ

کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اُٹھ چکی تھی۔ 1945ء میں حیدرآباد میں پروگریسیو رائٹرز (PROGRESSIVE WRITERS) کی کانفرنس ہونا طے پائی بڑی خوشی کہ سارے

نئے لکھنے والوں کو دیکھ اور سُن سکیں گے۔ اور اندھیرا کے خالق کو تو ضرور۔ رضیہ اور رابعہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پردہ میں نہیں بیٹھیں گی۔ میری خوشی ختم۔ ایک دن پوچھا کہ آپ کانفریس میں شریک نہیں ہوں گی تو جواب دیا کہ رضیہ اور رابعہ نے باہر مردانے میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تو کیا ہوا آپ بھی اُن ہی کے ساتھ بیٹھیئے۔ نا قابلِ یقین بات اتنا بڑا انقلاب کیسے ہوگیا؟ تو یوں ہم سب بہنیں باہر بیٹھیں۔ مگر ہمارے سوا اور کوئی خاتون وہاں نہ تھیں۔ دوسرے دن البتہ غلام پنجتن صاحب کی اکلوتی لڑکیصدق فاطمہ جو پڑھائی کے لیے انگلینڈ بھی جاچکی تھیں اب کالج میں لکچرار اور رضیہ، رابعہ کی دوست بھی تھیں ہمارے ساتھ بیٹھیں۔ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ سردار جعفری بہت اچھے مقرر لگے۔ سجاد ظہیرؔ (بنے بھائی)، ملک راج آنند، فراق گورکھ پوری، حسرتؔ موہانی، کرشن چندر اور سارے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو سنا اور گھر پر بھی بُلایا لیکن "اندھیرا" کے خالق کو دیکھنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔ گھر پر سب ہی آئے مگر وہ نہیں دیکھا بعد میں معلوم ہوا کہ اختر نے نئے مقام کا پتہ نہیں بتایا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی

بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی کے آفس کو جلایا اور تباہ کیا گیا۔ ہم بھی کو یہ عمل بہت برا لگا۔ اس وقت یہ پتہ نہ تھا کہ ہمارے شہر میں بھی پارٹی کا کوئی مرکز قائم ہے۔ ایک دن میں برآمدے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی چھوٹے سے قد والی ایک خاتون گھر کے دروازے پر کھڑی ہیں میں نے اندر بلایا معلوم ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہیں۔ ویمنس کالج میں کچھ لٹریچر لے جاتیں طالبات کو دیا کرتی ہیں ان طالبات میں سے کسی نے انھیں ہمارا پتہ بتایا کہ وہاں آپ کو اپنے مطلب کے لوگ ملیں گے۔ مجھے تو جیسے بہت بڑی نعمت مل گئی۔ دو چار دن بعد تائی پھر آئیں کچھ پمفلٹ وغیرہ لے کر۔ پھر چند ہی دنوں بعد وہ مجھے پارٹی آفس دکھانے لے گئیں۔ میں اور رضیہ دونوں گئیں۔ وہاں ایک نوجوان جو او

رضوی سے ملاقات ہوئی۔ دو ہفتے بعد ہی ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ جلسہ سلطان بازار میں
تھا تائی خود لے گئیں۔ جلسے کے میدان میں سڑک کے بازو ایک مکان میں اُترے۔ صاحب خانہ
یشودھا بہن پارٹی ممبر تھیں۔ اس جلسے میں امّی اور سارے بہن بھائی ساتھ تھے۔ ہم سب کمرے ہی
میں بیٹھے تھے کہ دوسری طرف سے ایک صاحب آئے۔ نہ جانے کیسے مجھے لگا کہ مخدوم ہیں۔ میں
کھڑی ہوگئی۔ تائی نے میرا تعارف اختر کی بہن کی حیثیت سے کروایا۔ چائے کے بعد جلسہ شروع ہوا
کافی مجمع تھا۔ یہ وہی جلسہ تھا جس کا ذکر اپنے رپورتاژ پودے میں کرشن چندر نے کیا ہے کہ پانی برستا
رہا اور سامعین بیٹھے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کے ہم سب چشم دید گواہ ہیں۔ جلسے میں ایک اور
صاحب نے بھی تقریر کی۔ پتہ چلا کہ راج بہادر گوڑ نام ہے واپسی پر تائی نے مجھے بتایا کہ چار دن بعد
پارٹی آفس میں گیارہ بجے نوجوانوں کی ایک میٹنگ ہے۔ مخدوم مخاطب کریں گے۔ میں وقت پر پہنچ
گئی وہاں سوائے مخدوم کے کوئی نہیں تھا وہ اس زمانے میں بھی پابند وقت تھے۔ دو چار باتیں ہوئیں
اختر کی خیر خبر پوچھی۔ بارہ بجے کے قریب میٹنگ شروع ہوئی چند ہی روز بعد کسی گاؤں میں ثمر یا نامی
کسان کا زمین دار کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ تائی نے آکر کہا کہ ہم سب حالات کی تحقیق کے لیے
جا رہے ہیں آپ بھی چلیں۔ لیکن اس وقت یہ ذرا مشکل تھا۔ اتنے مختصر عرصے میں ہی وہ ہم سب پر اتنا
بھروسا کرنے لگیں۔ گویا ہم پارٹی ممبر ہی ہیں۔ ایک دن آئیں گھڑی مانگ کر لے گئیں کہا کل واپس
کر دیں گی دوسرے دن کوئی گیارہ بجے کے قریب ایک کار پر دو صاحبین راج اور جواد آئے معلوم ہوا
کہ جیل سے دواخانے میں شریک کیے گئے تھے وہاں سے فرار کرایا گیا ہے۔ پٹرول بھروانے کے لیے
رُکے تھے۔ کچھ دن پہلے ہی یہاں پارٹی ممنوع قرار دی جا چکی تھی۔ بہتیرے کامریڈ گرفتار ہو چکے
تھے۔ مخدوم ٹریڈ یونین کے کام کے سلسلے میں شاہ آباد گئے ہوئے تھے۔ انھیں خبر دی گئی وہ وہیں سے
بمبئی چلے جائیں۔ یہاں سر مرزا اسماعیل وزیر بنکر آئے۔ انھوں نے قاضی عبدالغفار صاحب کا کسی

عہدے پر تقرر کرنا چاہا قاضی صاحب نے اختر کو لکھا کہ وہ "پیام" بند کر رہے ہیں اختر کو صحافت سے ہمیشہ دل چسپی تھی۔ نہ کسی سے کچھ کہا نہ مشورہ کیا۔ نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور شہر آئے۔ قاضی صاحب سے ملے اور کچھ شرائط پر اخبار لے لیا۔ اخبار کی مالی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ سر مرزا اسماعیل کی وزارت ختم ہوگئی قاضی صاحب کو کوئی کام نہ مل سکا۔ اختر کسی نہ کسی طرح اخبار چلاتے رہے۔ تھوڑے عرصے میں اس کی اشاعت کافی بڑھ گئی لیکن کچھ ہی دنوں میں اخبار کی پالیسی میں فرق آگیا اس کا بائیں بازو کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوگیا۔ کمیونسٹ پارٹی کو ممنوع ہوئے تقریباً چھ مہینے ہو رہے تھے تلنگانہ میں کُمریا کے قتل کے بعد ہتھیار بند لڑائی شروع ہوگئی تھی۔ تائی ایک دن ہمارے پاس آئیں اور رازدارانہ طور پر کامریڈ کو انڈر گراونڈ رکھنے کے بارے میں پوچھا نہ جانے بغیر کسی تجربے کے اتنا بھروسا ہم پر کیسے ہوگیا۔؟ بہرحال میں نے فوراً طے کیا کہ انھیں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ آدھے حصے کا کرایہ تو ابّی دیتے ہی ہیں وہ کسی کو بھی رکھ سکتے ہیں۔ ادھر دو دن بعد تائی نے آکر کہا کہ ایک بڑے لیڈر آج رات آئیں گے اس وقت تک ہماری نظر میں یہاں بڑا لیڈر صرف ایک تھا۔ آنے کا وقت رات بارہ سے دو تک بتایا گیا تھا۔ بھی جاگتے اور انتظار کرتے رہے۔ صبح تک کوئی نہیں آیا معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ آج ضرور آئیں گے پھر وہی انتظار۔ تو ڈیڑھ بجے رات ایک صاحب آئے اونکار پرشاد نام تھا۔ بھائیوں کے کمرے میں ان کو ٹھہرا دیا تھا۔ یہ اچھے پیسے والے آدمی تھے۔ کاچی گوڑہ میں دومنزلہ گھر' کار' بیوی اور ایک سال کا لڑکا وقفے وقفے سے وہ ہمارے یہاں کافی عرصہ رہے۔ بھی چھوٹے بھائی بہنوں کی انھوں نے کلاسیں لیں۔ پارٹی کے بارے میں بتایا۔ میں احتیاطاً اُدھر بہت کم جاتی مگر جب انڈر گراونڈ کامریڈ کی میٹنگیں بھی ہونے لگیں تو اُن میں شریک ہوجاتی۔ جو رات بارہ ایک بجے تک چلتی رہتیں۔ انہیں دنوں کسی کامریڈ نے مجھے ایک خط لاکر دیا کہ بمبئی سے بھیجا گیا ہے مخدوم کا اور اسے اِن کے گھر پہنچانا ہے۔ مخدوم کے گھر والوں نے مکان بدل دیا

ہے آپ ذرا پتہ لگا کر یہ خط پہنچا دیں۔ گھر کے کام کاج سے جو وقت بچا رہتا وہ میں اب پارٹی کے کاموں میں لگا دیتی اس ضمن میں کئی کامریڈوں سے ملنا ہوا۔ ان میں سے ایک صاحب کو نئے مکان کا پتہ معلوم تھا۔ انھوں نے مظہر کو لے جا کر دور سے دکھا دیا۔ پھر میں مظہر کو ساتھ لے کر وہاں گئی مکان بہت دور میر عالم منڈی کے قریب گلیوں کے اندر۔ خط کھلا ہوا چند سطور کا۔ اس کے ساتھ پاسپورٹ سائز کی ایک بہت اچھی سی فوٹو۔ خاتونِ خانہ سے ملی باتوں میں خود انھوں نے کئی سال پہلے کسی دعوت میلاد کا ذکر کیا۔ ''وہ آپ یچ تھے نا...... جو میلاد میں بُلائے تھے۔ اُنوں بولے تھے مکان بالکل بازو میں ہے۔ آپ یچ چلے جاو۔ میں گئی تو انوں بہت خفا بھی ہوئے تھے۔'' اس پر ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ بازو کے مکان میں جو شادی ہوئی تھی اس میں شرکت کے لیے میں پیدل چلی گئی تھی۔ ۔ بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

مخدوم کی لڑکی آساوری، جاوید سے کچھ بڑی ہی تھی۔ اور لڑکا نصرت کوئی ڈیڑھ سال کا تھا۔ وہیں ان کی پھوپھی سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ مخدوم کے والد کا انتقال ہو گیا تھا والدہ حیات تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد دوسرا عقد ہو گیا تھا۔ اُن کے دوسرے شوہر کا بھی جلد ہی انتقال ہو گیا۔ مخدومؔ کے حالات لکھنے والوں نے بس چچا کی مہربانی کے ہی گُن گائے ہیں۔ ماں کے بارے میں صرف یہ کہ دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کر لی تھی یا کر دی گئی تھی۔ لکھتے تو یہی ہیں کہ کر لی تھی، اتنی ہمت کہ ایسا بڑا گناہ کیا۔ اس کی سزا تو ملنی چاہیے تھی۔ چناں چہ ماں کو بیٹے کی دید سے ہی محروم کر دیا۔ دوسری شادی کرنے سے شاید ماں کی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ باپ کی شفقت سے محروم لڑکے کو ماں کی زندگی سے ہی ناواقف رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔ کیسی نیکی و بھلائی تھی۔ شاید یہ مقصد کہ گنہ گار کا سایہ بھی بچے پر نہ پڑنے پائے۔ لہٰذا نہ نام و نشان نہ کہیں ذکر۔ ایسے گنہ گاروں کی یہی سزا ہے کہ مرنے سے پہلے ہی ان کے نام و نشان کو مٹا دیا جائے کتنے منصف

ہیں یہ ہمارے سوانح نگار چچا تو مُلّا۔۔۔ بنانا چاہتے تھے کسی نے کبھی سوچا کہ سرکشی کر کے اپنی ہی کرنے کی صلاحیت کس کی دین تھی۔ اس زمانے میں ماحول اور حالات سے ایسا باغیانہ اقدام معمولی بات نہ تھی اور یہی صلاحیت انھوں نے اپنے لڑکے کو بخشی۔ ورنہ......؟ غالباً محبت کی اس بھوک نے ہی انھیں ساری دنیا کو اپنی بے پناہ محبت سے شرابور کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اور کیا لکھوں روشن خیال ترقی پسندوں کے ذہنی افلاس کے بارے میں۔

جہاں تک میرا خیال ہے۔ کانگریس وزراتوں کے قیام پر جناح صاحب نے۔ مسلمانوں کو اپنے گھروں پر سیاہ جھنڈیاں لہرانے کا حکم دیا تھا۔ مجھے یہ بات پسند نہ تھی۔ عزیز الدین صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی تو وہ اس دن آفس نہیں گئے تھے۔ ہمارے بھائیوں کے نزدیک تو۔ جناح صاحب کی بات۔ حکم قرآن۔ چنانچہ سوائے ہمارے دو تین گھروں کے سبھی پر سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پڑوسی گھر والوں کو جب میرے گھر پر نہ نظر آیا تو نہ جانے کیا سمجھ کر اپنی لڑکی کے پاجامے کا ایک پائنچا (ایک سے انہوں نے اپنے ہاں جھنڈے کا کام لیا تھا) مہربانی کر کے ہمارے پاس بھیج دیا۔ عزیز الدین صاحب اسے جھنڈا بنا کر لہرانے پر آمادہ۔ اُس وقت میں نے گھر چھوڑ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کچھ ہنر آتا ہے اس سے تھوڑا بہت کما سکتی ہوں۔ لہٰذا چودہ پندرہ سال میں پہلی بار کہا ٹھیک ہے۔ آپ جھنڈا چڑھائیں میں گھر سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے......! اس پر جھنجلا کر کپڑا پھینک دیا اُدھر جاوید اور مظہر نے یہ ستم کیا کہ میرے پاس ایک لال شال تھی اس کا جھنڈا بنایا اُوپر جا کر چڑھا دیا۔ اس بات کا پتہ ہمیں بعد میں چلا جب محلے والوں نے آ کر پوچھا کہ آپ کے گھر یہ لال جھنڈا کیوں لگا تھا۔ اختر اتفاق سے گھر ہی پر تھے۔ پتہ نہیں انھوں نے کیا جواب دے کر ٹال دیا۔

جو پہلی آل انڈیا پروگریسیو کانفرنس حیدر آباد میں ہوئی تھی اس کے بعد یہاں بھی ادیبوں نے

پروگریسو انجمن کو زندہ کیا۔ اس میں' میں شریک رہی۔ سروجنی نائیڈو نے تقریر کی تھی۔ فیکش سکریٹری بنائے گئے تھے۔ ان کے بعد اختر اس کے سکریٹری چنے گئے۔ ان کے گھر میں میٹنگیں ہونے لگیں۔ عالم خوندمیری' ابراہیم جلیس ادیب' نظر حیدرآبادی' امجد یوسف زئی وغیرہ وغیرہ اس وقت کے تقریباً سبھی نوجوان رائٹرز جمع ہوتے بحث و مباحثہ' شعروشاعری وغیرہ ہوا کرتی۔ 1946ء بہت مصروف سال رہا۔ اختر نے ہمارے گھر کے قریب ایک مکان لے لیا تھا۔ اسی سال کے آخر میں پارٹی پر پابندی لگ گئی۔ تلنگانہ تحریک شروع ہوئی۔

ایک دن بھائی مظہر نے آ کر کہا مخدوم صاحب اختر بھائی کے گھر آئے ہیں۔ تعجب ہوا کہ دن کے وقت کیسے آ گئے۔ شاید یہ اُن کی وہی لاپرواہی تھی کہ بمبئی کی گاڑی سے آئے جو غالباً نو بجے دن یہاں پہنچتی تھی۔ اور چوں کہ اسٹیشن سے اختر کا گھر قریب پڑتا تھا۔ سیدھے یہاں آ گئے۔ میں اختر کے گھر جا کر ان سے ملی وہیں یہ طے ہوا کہ وہ رات نو ساڑھے نو بجے آئیں گے۔ اور ہم سب کی کلاسیں لیں گے۔ یہاں انڈر گراونڈ لوگوں کے آنے کا وقت عموماً سکنڈ شو کے شروع ہونے پر اور جانے کا وقت اسی شو کے اختتام پر مقرر تھا۔ غرض ہم سب بہن بھائی حتیٰ کہ امّی تک جوان دنوں ہمارے پاس ہی تھیں وقت مقررہ پر اختر کے ہاں جمع ہوتے۔ اختر کام کی وجہ سے کافی دیر سے آتے۔ اُن کی بیوی ریاست خانم بہت جلد سونے کی عادی تھیں۔ شریک تو ہو جاتیں مگر اونگتی رہتیں۔ ہم سب بارہ ایک بجے سونے کے عادی۔ اطمینان سے سنتے رہتے۔ مخدوم عموماً ابتدائی اصولوں کی تشریح کرتے۔ لیکن میرے لیے یہ چیز کوئی زیادہ نئی اور معلوماتی نہ تھی۔ کیوں کہ ''نگار'' کے مضامین اور کچھ کتابوں، رسالوں کے مطالعہ سے اتنی واقفیت تو مجھے تھی ہی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے بعد یہ بیٹھکیں ختم ہو گئیں۔ پروگریسو رائٹرز کی میٹنگیں میرے گھر کے ہال میں ہونے لگیں۔ مخدوم زیادہ تر اب میرے گھر پر ہی آنے لگے تھے۔ کبھی کبھار رات زیادہ ہو جاتی تو ٹھہر جاتے۔ تھوڑے دنوں بعد راج صاحب ان کے ساتھ آنے لگے۔ معلوم ہوا

۔ وہ بھی حیدر آباد آ گئے ہیں۔ ایک نئے کامریڈ خوش بدن لال صاحب سے بھی ان ہی دنوں ملنا ہوا
۔ انھوں نے شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور آسن سول کے کوئلہ مزدوروں کی یونین کے
ریٹری تھے۔ بڑے بھائی کا گھر پرانے شہر میں تھا۔ ان کی بیماری کی خبر پا کر یہاں آئے تھے۔ بالکل
جوان خوب صورت آدمی۔ یہاں کامریڈ مہیندرا کے نام سے متعارف ہوئے تھے۔ اردو اچھی
نتے۔ چوں کہ نئے نئے آئے تھے کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے۔ لہٰذا بلا تکلف دن کو
ی آجاتے۔ مگر کچھ دنوں میں انھیں بھی انڈر گراونڈ ہونا پڑا۔ تب تک تائی اور یشودھا بین اور برج
نی بھی انڈر گراونڈ ہو چکی تھیں۔

برج رانی کے تعلق سے بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ لودھے واڑی کی رہنے والی دو بچوں کی ماں،
ہر کے برتاؤ سے ناخوش ہو کر پارٹی کی عورتوں میں کام کرنے والی خاتون سے ملنے آ گئی تھیں۔ اور
ر پارٹی ممبر بن گئیں۔ ادھر تلنگانہ کی ہتھیار بند لڑائی نے کافی زور پکڑ لیا تھا جس کی رہنمائی مخدوم
ر رہے تھے۔ اُن ہی دنوں چاری نامی ایک آرٹس کالج کا طالب علم ہمارے یہاں آنے لگا تھا۔ یہ
گانہ جدوجہد میں کسانوں کو ہتھیار مہیا کرنے کا کام کرتا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے ظفر اور
یظ کو انڈر گروانڈ ہو جانے کا مشورہ دیا۔ چاری بھی انڈر گراونڈ ہو چکا تھا۔ ظفر نے جو نئے ممبر بنائے
ے ان میں سے دو تین گرفتار ہو چکے تھے۔ غرض کافی پریشان کن زمانہ تھا۔ پارٹی کا کوئی خاص کام کرنا
شکل تھا لیکن گرفتار شدہ ممبرس کے گھر والوں کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کرنی تو بہت ضروری تھی۔ ان
ں سے دو تین کے گھر قریبی محلے آصف نگر میں تھے میں ان کے گھر گئی۔ چھوٹے گھر اور لوور مڈل
س کے لوگ تھے۔ دو ممبروں کے گھروں میں صرف بیویاں، کسی کا ایک بچہ اور کسی کے دو۔ باہر کی
یا سے ناواقف پردہ دار اور ان پڑھ خواتین، سوچا کہ ان کو کچھ باہر کی دنیا کا علم ہو جائے مگر یہ کیسے۔
ھ پڑھنا سکھائیں یہ خیال ظاہر کیا تو بہت شوق سے تیار ہو گئیں۔ چناں چہ روز آنہ شام دو ڈھائی

گھنٹوں کے لیے جا کر پڑھانا شروع کیا۔ وہاں قریب قریب کے چار پانچ گھروں کی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں جمع ہو جاتیں۔ دو ہفتے بعد ہی وہاں سے کچھ فاصلے پر رہنے والی خواتین نے بھی اشتیاق ظاہر کیا کہ ہم بھی پڑھنا چاہتی ہیں۔ لیکن بے پردہ یہاں تک آ نہیں پائیں گی۔ امّی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ کہ وہ انھیں پڑھائیں گی۔ پڑھانے کا یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ ہم رات دیر گئے گھر پہنچا کرتے بھی تو پرواہ نہ کرتے۔ جو لوگ گرفتار ہوئے وہ بغیر کسی الزام کے تھے چار ماہ بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔

یہاں عزیز الدین صاحب کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی تقریباً فریش تھے۔ لہٰذا اب کہیں جانا مشکل تھا۔ تو یہ مشغلہ ختم ہو گیا۔ مخدوم کو اپنی لڑکی کی پڑھائی کے چھوٹ جانے کا بہت افسوس تھا۔ ایک دن کہا کہ ان کی لڑکی آساوری آپ کے پاس رہ کر پڑھ لکھ سکے تو کتنا اچھا ہوگا۔ میں نے کہا بہت خوشی سے مگر ان کی والدہ میرے پاس چھوڑنے پر کیا تیار ہوں گی۔ کہا یہ مسئلہ تو ہے۔ نئے گھر کا پتہ انھیں بھی معلوم نہ تھا ایک رات مظہر کو ساتھ لے کر گئے۔ ہفتہ عشرہ بعد آئے۔ افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ لڑکی کو یہاں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ البتہ مدرسہ میں شریک کروانے پر تیار ہیں۔

دو چار دن بعد میں اُن کے گھر گئی کہ اسے کسی اسکول میں شریک کروا دوں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ بچی کے پاس پھٹے پرانے کپڑے ہیں کیا پہن کر جائے گی۔ میرا ہاتھ ہمیشہ تنگ، کپڑوں کا کیسے انتظام کروں۔! پارٹی کے کاموں میں ایک بڑا کام چندہ جمع کرنا بھی ہوتا تھا۔ جو مجھے سب سے زیادہ مشکل لگتا ہے۔ بہرحال ملنے جلنے والوں سے اور محلے میں گھوم کر کچھ نہ کچھ جمع کر ہی لیتی۔ دو تین روپے سے زیادہ شاید ہی کوئی دیتا۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں مخدوم کے کوئی پرانے جاننے والے دوست نے ایک دن پورے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے سوچا کہ اس رقم کو آساوری کے لیے کپڑے بنانے میں صرف کرنا ہی سب سے بہتر مصرف ہوگا۔ اور یوں چند جوڑے کپڑے بنا لیے اور

انھیں لے کر گئی۔ اب ان کے پاس اسکول نہ بھیجنے کا کوئی عذر نہ رہا۔ چناں چہ ایک قریبی اسکول میں شریک کروادیا۔ یہ پہلے چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ میں نے پانچویں میں شریک کروادیا۔ مخدوم کا نام ان دنوں تک شہر میں کافی مشہور ہو چکا تھا چناں چہ داخلے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ میں نے کہہ دیا کہ فیس وغیرہ لڑکی سے نہ مانگی جائے اگر دیر بھی ہو جائے۔ لانے اور لے جانے کو اسکول کی بیل گاڑی تھی ایک ماہ بعد جب فیس دینے گئی تو معلوم ہوا کہ لڑکی اسکول آ ہی نہیں رہی ہے۔ گھر جا کر وجہ دریافت کی ان کی ماں نے کہا کہ گاڑی گھر تک نہیں آتی۔ گلی پتلی ہے بچی کو پوری گلی پار کرنی پڑتی ہے اور اس میں بے پردگی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نہیں جاتی۔ بہت سمجھایا کہ باپ بچی کو پڑھانے کے بے حد خواہش مند ہیں زیادہ سے زیادہ چادر اوڑھ کر چلی جائے یوں بھی اس گلی میں کوئی آتا جاتا نہیں بہرحال کہہ سن کر ساتھ لے گئی۔ اور فیس وغیرہ داخل کر کے تاکید کی کہ اسکول برابر جاتی رہا کرو۔ مگر اُسے پڑھنے کا شوق نہ تھا۔ بہت ناغہ کرتی رہی نتیجہ یہ نکلا کہ امتحان میں فیل ہو گئی۔ یہ تھا اس گھر کا کچھ مختصر سا حال۔

یہ گھر مخدوم کے کسی چچازاد بھائی نے رہن پر لے رکھا تھا۔ وہ مخدوم کی بیوی کے بہنوی تھے۔ ملازم سرکار تین بچوں کے باپ بیوی کا عرصہ قبل انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال مخدوم کی بیوی ہی کر رہی تھیں یعنی ان کی چھوٹی سالی۔ جب میں پہلی بار ان کے گھر گئی تو ان کے بڑی لڑکی کی شادی دو ماہ قبل ہو چکی تھی۔ ان کے بعد کا لڑکا پندرہ سولہ سالہ جو غالباً نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اور اس سے چھوٹی لڑکی صفیہ پڑھنے کی بہت شوقین تھی۔ پابندی سے اسکول جاتی تھی انھیں بچوں کے ساتھ مخدوم کے بچے بھی انھیں باوا اور مخدوم کو چچا باوا کہنے لگے تھے۔ بچوں کو باقاعدہ سکھایا نہ جائے تو جو وہ سنتے ہیں کہنے لگتے ہیں۔ جاوید کا یہی حال تھا مجھے اور باپ کسی کو بھی رشتوں کے لحاظ سے مخاطب نہ کیا کرتا۔ چند دنوں بعد امن اپیل پر دستخط لینے کے لیے گئی نصرت کی

والدہ نے لڑکی سے دستخط کردینے کو کہا۔ وہ خود غالباً لکھ نہیں سکتی تھیں۔ اسی ملاقات میں میں نے اس تصویر کے بارے میں پوچھ لیا۔ جو خط کے ساتھ بھیجی گئی تھی جواب ملا وہ تو جیج جلا دی۔ بھائی صاحب بولے رکھنا ٹھیک نہیں۔ ایسی بات تو سوچی بھی نہ جاسکتی تھی۔ بیوی کے پاس شوہر کی تصویر کا ہونا بھی کیا کوئی جرم ہے۔

اگست 1947ء

ہندوستان کو آزادی ملی اور ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ لاکھوں کی جانیں گئیں۔ اور ریاستوں میں الحاق کی باتیں چلنے لگیں رضا کار تحریک کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ حیدرآباد کی خودمختاری کے نعرہ کی پشت پناہی قاسم رضوی کی قیادت کررہی تھی۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ اس جنون میں اس حد تک مبتلا رہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر بھی نظام کے سایہ عاطفت میں آزاد حیدرآباد اور اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگے ریڈیو پر تقریباً سارے شاعر وادیب ہمہ وقت جمع رہتے اور رات دن اپنی طاقت پر ناز اس حضور نظام اور قاسم رضوی کی ثناخوانی ہوتی اور عوام کو گمراہ کیا جاتا رہا۔ حیدرآباد کے علاقے ملے پلی میں ہمارے گھر کے علاوہ شاید دو تین گھر ہی ایسے ہوں گے جو اس جنون کے خلاف اپنی سی کوشش کررہے ہوں گے۔ ''پیام'' اخبار کے ذریعہ بھی یہی کام کیا جارہا تھا۔ میرے گھر پر سنگ باری بھی کی گئی۔ جب باہر نکل کر پوچھا گیا کہ یہ کیا حرکت ہے تو جواب ملا ابھی تو پتھر ہی پھینکے ہیں گولیاں بھی چلائیں گے۔ پیام کے ایڈیٹوریل کی اشاعت کئی ماہ کے لیے ممنوع قرار دے دی گئی۔ اختر کو دو تین ماہ انڈر گراونڈ ہی رہنا پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھنؤ میں ایک میٹنگ کا اعلان کیا تھا حیدرآباد سے کافی لوگوں پر مشتمل مندوبین نے شرکت کی تھی۔ ان میں اختر، رضیہ اور رابعہ شامل تھے راستے ابھی مخدوش تھے مگر بہرحال یہ قافلہ بخیریت لکھنؤ پہنچا۔ اُن دنوں قاضی صاحب بھی وہیں تھے۔ میں جاوید

کے والد کی بیماری کی وجہ سے نہ جا سکی۔ واپسی پر اختر نے ساری تفصیل بتائی کہ کس طرح وہاں پارٹی لیڈر ڈاکٹر اشرف نے بے حد اچھی تقریر کی۔

سقوطِ حیدر آباد

17/ ستمبر 1948ء (17-9-1948) سقوط حیدر آباد کی تاریخ ہے۔ غالباً اسی دن اختر روپوشی سے باہر نکل آئے تھے۔ اس رات ملے پلی میں موت جیسا سناٹا تھا۔ سوائے میرے اور شاید دو ایک اور گھروں میں روشنی، ہر طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لوگ ڈرے سہمے گھروں میں بند بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر دل میں دہشت تھی۔ دوسرے دن کا منظر بھی بڑا عبرت ناک رہا محلے کے مسلم بھائی بوڑھے اور نوجوان سب اختر سے رُجوع ہو رہے تھے کہ بتایئے اب ہم کیا کریں بہت دھوکہ دیا ہمارے لیڈروں نے ہمیں۔ ہم آپ کے بہت خلاف تھے پر کیا کرتے۔ ہم وہی کچھ کیا کرتے جو ہمارے راہ نما کہتے اور کرتے تھے اب وہ تو منہ چھپا کر بھاگ گئے ہیں۔ آپ بہت ٹھیک باتیں لکھتے تھے۔ اب ہماری راہ نمائی آپ ہی کریں اختر نے انھیں حتی الامکان دلاسا دیا۔ اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر امن کمیٹیاں بنائیں۔ محلہ محلہ گھومے اور لوگوں کو سمجھایا۔ اضلاع کا دورہ بھی کیا وہاں بھی امن کمیٹیاں بنائیں اور ان کا انچارج مقامی سر برآوردہ افراد کو بنایا۔ کچھ اور لوگ تھے جو اس قسم کی کوشش میں جٹے ہوئے تھے۔ اختر نے اپنے اخبار کے ذریعہ بھی لاکھوں مسلم مظلومین کی رہبری کرنے کی کوشش کی۔ انھیں مشورہ دیا کہ وہ قومی دھارے میں شامل ہو جائیں۔ امن و امان کی فضاء کو بحال کریں۔ اس طرح رفتہ رفتہ امن وامان کی فضا بحال ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کے اندر جو احساس کم تری اور عدم اعتماد پیدا ہو گیا تھا اسے دور کرنا مشکل تھا۔ ادھر پارٹی قیادت میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ''پیام'' ان دنوں بہت اچھا چل رہا تھا۔ اختر اسٹیٹ کے ہندوستان سے الحاق کے حق میں تھے۔

روی نارائن ریڈی نے بھی اسی پالیسی کی حمایت کی۔ راج نے مجھے اختر اور رضیہ کو ایک محفوظ جگہ پر بلایا اور اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ اختر تو قائل نہ ہوئے تھے مگر ''پیام'' کے عملے میں چند راج کے ہم خیال بھی تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن لال قلعہ پر لال جھنڈا لہرا دیں گے' کی سُرخی لگا دی۔ غرض اس طرح غلط باتوں کے نتیجے میں کافی نقصان اُٹھانا پڑا اور اب اخبار کو پارٹی کا اخبار سمجھنے والوں نے بھی اپنی توجہ دوسری طرف پھیر لی۔

ٹھیک سے یاد نہیں غالباً اس سے کچھ عرصہ پہلے بھیمڑی میں پارٹی کی کُل ہند کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں، اختر، رضیہ، رابعہ اور ذکیہ شریک ہوئے تھے۔ جہاں کامریڈ رندیوے کو جوشی کی جگہ سکریٹری چُنا گیا۔ انھوں نے کچھ ایسی غلط پالیسی اختیار کی کہ اس کا اثر پارٹی پر بہت برا ہوا۔ شروع میں تو یہاں کے لیڈروں نے ان کا ساتھ دیا۔ بعد میں ان کے ماننے والے روی نارائن ریڈی اور مخدوم کو بھی اختلاف ہو گیا۔ راج اسی کڑپن کے حامی تھے۔ مخدوم کا خیال تھا کہ تلنگانہ مومنٹ کو اب ختم کر دینا چاہیے۔ لیکن راج جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ بہر حال وہ جا کر دلم میں شریک ہو گئے۔ اور وہاں ایک جھڑپ میں گرفتار کر لیے گئے۔ اسی طرح ہمارے یہاں ظفر اور حفیظ دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ ظفر' مخدوم کے ہم خیال تھے اور حفیظ راج کے۔ چناں چہ حفیظ بھی دلم میں شریک ہو گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ تحریک میں اب دم نہیں رہا۔ کمزور پڑ گئی ہے۔ چند ہی روز بعد بُری حالت میں واپس آئے۔ مگر ریوالور کو ساتھ لیئے۔ اس وقت تک حالات بہت بدل چکے تھے۔ بہت سے کانگریسی جنھوں نے انڈر گراونڈ کامریڈوں کو پناہ دی تھی اب حکومت کے حامی ہو گئے چناں چہ ہمارے ان دونوں بھائیوں نے شہزادآپا کے گھر کو پناہ گاہ بنا لیا۔ کچھ دنوں بعد وہاں مخدوم بھی جا کر رہنے لگے۔ حفیظ اپنے ریوالور کے ساتھ وہیں واپس آئے۔ یہ بہت بعد کی باتیں ہیں تقریباً 1950ء کی۔

اختر کے تعلق سے ایک بار مخدوم نے کہا تھا کہ ان کی سیاسی سمجھ بوجھ بہتر ے کا مریڈوں سے اچھی ہے۔ لیکن مزاج میں طفلگی ہے۔ شاید بچپنا کہنا مناسب نہیں لگا۔ بہر حال اخبار اچھا چل رہا تھا۔ آمدنی بھی ٹھیک ہو رہی تھی۔ تو بس انھوں نے شوق میں آ کر لال ٹیکری پر ایک کافی بڑا زیادہ کرائے کا مکان لے لیا۔ ان کی بیوی ریاست بھی نوکروں وغیرہ کے معاملے میں بہت فراخ دل تھیں مخدوم کو اب جب بھی ملنا ہوتا ایک دو حرفی چھٹی میرے نام آتی۔ کہ آج رات اختر کو بلا لیجیے۔ میں اپنے وقت پر آ جاوں گا آپ کا ریاض انڈر گراونڈ نام۔

اخبار میں گرفتاریوں کی خبر آتے ہی دوسرے دن اختر اور عزیز الدین صاحب کے ایک مشترکہ دوست حالات معلوم کرنے چلے آئے۔ جو عثمانیہ ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ جاوید کے والد کی حالت بہت خراب تھی۔ پچھلے دو ایک ماہ سے بالکل فریش تھے۔ ڈاکٹر ابوالفضل صاحب کا علاج چل رہا تھا۔ اور دو ہفتوں سے بخار نارمل رہنے لگا تھا۔ ان صاحب نے اس علاج کو بے کار بتاتے ہوئے عثمانیہ دواخانے میں شریک ہو جانے پر اصرار کیا۔ عزیز الدین صاحب خود بھی ان کی رائے سے متفق ہو گئے اور پھر ان صاحب نے اُسی دن ہسپتال میں کمرے وغیرہ کا انتظام کر کے عزیز الدین صاحب کو شریک کروا دیا۔ اب گھر میں صرف ابّی، امّی اور ذکیہ رہ گئے تھے دو تین دن میں ریاست بھی کرائے کا مکان خالی کر کے یہیں پر چلی آئیں۔ حوالات سے جیل منتقل کرتے وقت انور کو چھوڑ دیا گیا تھا وہ روز آنہ میرے پاس آنے لگا۔ ہسپتال میں اس وقت کے مشہور سرجن نے دیکھا اور کہا کہ آپریشن کی ضرورت ہے۔ بس تین ہفتوں میں تندرست ہو جائیں گے۔ چناں چہ ایک ہفتہ بعد آپریشن کیا گیا۔ اس کے دو دن بعد ہی عید تھی وہ تو عید کی چھٹی مناتے رہے۔ یہاں طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی آر ایم او صاحب بہت ہمدرد انسان تھے۔ خود آ کر دیکھا اور کہا کہ آپریشن غلط ہوا ہے۔ کچھ دوا وغیرہ دی اور بتایا کہ خون دینے کی ضرورت ہے خون بھی دیا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ طبیعت اور بگڑتی گئی

اب یہ کہا گیا کہ خون میں زہر پھیل گیا ہے۔ انور و جاوید میرے ساتھ ہی رہے۔ عزیز الدین صاحب کی پوری رات تقریباً غفلت میں گذری۔ صبح سویرے وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ بارش کا موسم تھا۔ بچوں کو رابعہ کے گھر بھیج دیا۔ وہاں کوئی نگرانی کرنے والا نہیں تھا۔ بچے کھیل کود میں بھیگتے رہے۔......

یہاں یونس سلیم صاحب کی ضمانت پر تیس دن کے لیے اختر ورضیہ کو جیل سے چھوڑا گیا تھا۔ شاہینہ کو بہت تیز بخار اور ناک سے خون جاری ہو گیا۔ اسی دوران راج بہادر صاحب کی ایک چھٹی اختر کے نام آئی لکھا تھا انتظام کر دیا گیا ہے انڈر گراونڈ ہو جاؤ۔ یہ بات ناممکن العمل تھی۔ اگر اس پر عمل کرتے تو نہ جانے یونس سلیم کا کیا حشر ہوتا۔ بہر حال تیسرے دن دونوں جیل واپس ہو گئے۔ شاہینہ کو اسی طرح بخار اور بے ہوشی کے عالم میں چھوڑ کر۔ چوتھے دن ہوش آیا لیکن پولیو کا حملہ ہو گیا۔ عرشی اس وقت کوئی سال بھر کا تھا۔ ڈاکٹر ابو الفضل صاحب کا علاج چلتا رہا۔ مہینوں بعد بیٹھ سکنے کی قابل ہوئی تین مہینوں بعد رضیہ کو چار ماہ بعد اختر، قمر اور مظہر کو پانچ ماہ بعد رہائی ملی۔ سب کو سی کلاس میں رکھا گیا تھا سیاسی کارکنوں کے لیے کوئی علاحدہ حصہ نہ تھا۔ عورتوں میں رضیہ کو مجرم عورتوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانا، نیچے زمین پر سونا جس کی وجہ سے اس کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ شدید قسم کا دمہ ہو گیا سیدھے لیٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ سکینہ فیملی کے ایک ڈاکٹر تھے جو رات گئے گھوم گھوم کر اپنی کار میں سارے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے تھے ان کے علاج سے رضیہ ٹھیک ہو گئی۔ اس وقت پرنسپل علی یاور جنگ تھے۔ انھوں نے بلا کسی وقفۂ رضیہ کو کام پر واپس لے لیا۔ کیوں کہ نہ تو کوئی الزام اس پر تھا اور نہ کوئی مقدمہ چلا تھا۔ انور نے گریجویشن کے بعد سٹی کالج میں کام کیا۔ پھر لائبریرین کا کورس کیا۔ اب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں سائنس ڈپارٹمنٹ میں لائبریرین کا کام کرتے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے قریب جہاں چند فاصلوں پر گھر بنے ہوئے تھے ایک گھر

کرائے پر لے لیا۔ تاکہ یونیورسٹی سے قریب رہیں اور ضرورت پڑنے پر انڈرگراونڈ ممبروں کے کام آسکے۔ انور کے اس مکان سے حبشتی گوڑہ جنگل سے جانے کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ کا تھا۔ پولیس ایکشن کے وقت شہزاد آپا کی بڑی لڑکی اختر کے شوہر تو رضا کاروں کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف رہے۔ ادھر یہ بے چاری اپنے تین بچوں کو لے کر چھپتے چھپاتے ماں کے گھر پہنچ گئی۔ ہمت والی لڑکی تھی، شہزاد بیگم میری خالہ زاد بہن، پولیس ایکشن میں ان کے شوہر کا قتل ہو گیا تھا۔

ہمارا گھر مخدوش ہو چکا تھا۔ اب مخدوم کبھی کبھار ہی آتے۔ البتہ انور کے نئے گھر پر جانے لگے۔ بعض وقت دو تین دن رہ جاتے۔ انور کے اطلاع دینے پر پکانے وغیرہ کی خاطر میں چلی جاتی۔ ابیؔ بھی وہاں بعض وقت جا کر کئی دن رہ جاتے۔ میں بھی ان کے ساتھ جا کر رہ جاتی۔ گھر کی ذمہ داری میں نے اب امّی کو دے رکھی تھی۔ ظفر بھی کبھی کبھی وہاں آجاتے۔ مخدوم ابیؔ کی موجودگی میں جب بھی آتے ابیؔ ان سے بڑی اچھی طرح ملتے اِدھر ان دنوں یہاں کیفی آئے ہوئے تھے میرے ذریعہ مخدوم سے انور کے گھر ملنا طے ہوا۔ ان دنوں ابیؔ کے ساتھ میں بھی وہاں تھی۔ رات دس بجے کے بعد ان لوگوں میں بات چیت شروع ہوئی۔ ملحقہ کمرے میں، مَیں اور ابیؔ سوتے مجھے کسی طرح نیند نہ آئی خدا جانے مخدوم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ میں جاگ رہی ہوں کہنے لگے نیند نہیں آرہی ہے تو یہاں آجائیے۔ پارٹی کی اہم باتوں اور بحثوں میں ہر ایک کو یوں شریک نہیں کیا جاتا۔ مگر یہ باتیں کئی گھنٹے جاری رہیں۔

شہزاد آپا کے یہاں حفیظ کے بعد ظفر اور پھر مخدوم بھی اکثر جا کر رہنے لگے مقطعہ پر اب دوسرے بھائی کا قبضہ تھا۔ بڑی دونوں بہنوں سے چھوٹے لڑکوں میں دو بڑے لڑکے مقطعہ گئے ہوئے تھے۔ یہاں صرف ان کی دوسری لڑکیاں اور بچے تھے۔ مخدوم حفیظ اور بچوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور تلاشی شروع ہوئی۔ ریوالور اوپر کے صندوق میں رکھا ہوا تھا۔ جسے سرسری طور پر دیکھ کر نیچے رکھ دیا

گیا لڑکی اختر فوراً وہاں جا کر اسی صندوق پر بیٹھ گئی۔ باقی صندوقوں سے کچھ برآمد نہ ہوا کسی نے پھر پہلے والے صندوق کو دیکھنا چاہا۔ تو اس نے غصّے سے کہا ابھی تو دیکھ کر نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ لو دیکھ لو۔ اس پر آفیسر نے کہا ہاں دیکھ چکے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ وہ بیٹھی رہی چاروں طرف دو دن تک پولیس کا گھیرا رہا۔ دو مرتبہ اور تلاشی لی گئی مگر بے کار لڑکی نے موقعہ پاتے ہی ریوالور نیفے میں اُڑس لیا۔ اور ضرورت کا بہانہ کر کے جنگل کا رُخ کیا اور وہاں ریوالور کو زمین میں گاڑ دیا۔ انور وقتاً فوقتاً یونیورسٹی جاتے آتے وہاں بھی چلے جاتے وہ اس واقعہ سے ایک دن پہلے ہی گئے تھے۔ مخدوم کو شاید نزلہ تھا۔ انھوں نے ان سے کوئی دوا لانے کو کہا۔ ان دنوں انور مظہر کو حساب وغیرہ سکھانے ہمارے ہی ساتھ رہ رہے تھے۔ دوسرے دن آفس جانے کے لیے نکلے۔ ان سب کا یہ قاعدہ تھا کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ہوتی تو مجھ سے ضرور ذکر کرتے۔ اس دن بھی اپنے جانے کی بات اور پھر دوا لیتے ہوئے جانے اور واپس میں دے آنے کا ذکر کیا۔ شام دفتر سے جب وہاں پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے۔ یہ عذر کون سنتا کہ بہن سے ملنے آئے ہیں۔ انور کے گھر کی تلاشی بھی قفل توڑ کر لی گئی تھی۔ شام کے سات بجے کے قریب کامریڈ اونکار پرشاد کے بھیجے ہوئے ایک آدمی نے ان کی گرفتاریوں کی تکلیف دہ اطلاع دی۔ دوسرے دن اخباروں میں گرفتاریوں کی کوئی خبر نہیں چھپی۔ کسی نے بتایا کہ عزیز و اقارب اخباروں میں اگر ایسا بیان چھپوائیں کہ فلاں عزیز کا پتہ نہیں چل رہا ہے تو ذرا ٹھیک ہوتا۔ ورنہ لاوارث سمجھ کر حوالات میں کافی اذیتیں دی جاتیں۔ میں نے بھائیوں کے تعلق سے تو ایسا بیان چھپوا دیا۔ لیکن مخدوم کے تعلق سے...... ان کی بیوی ہی دے سکتی ہیں۔ میں سویرے گئی معلوم ہوا کہ وہ میکے گئی ہوئی ہیں۔ ان کے بہنوئی بھی نہ ملے۔ دوسرے دن کافی سویرے گئی تب بھی وہ نہ ملے۔ بازو کے گھر والوں سے آفس کا پتہ پوچھا۔ ان سے صرف اتنا کام تھا کہ وہ اپنی عزیزہ کے نام سے چھوٹا سا بیان دے دیں۔ ان کا نام تو کہیں آنے والا نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں؟ ہمسائے سے جب یہ معلوم ہوا

کہ میں آفس کا پتہ پوچھ گئی ہوں تو اسی دن شام میرے گھر آئے میں نے ان سے اپنی عزیزہ کی طرف سے چند سطریں لکھ دینے کو کہا۔ جواب ملا کیا ضرورت وہ خود کہہ چکے ہیں کہ ع۔۔۔ صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے" بہت کوفت ہوئی ان کا کیا بگڑنے والا تھا۔ بہر حال ایسے عزیز بھی ہوتے ہیں۔ اس دوران جہاں جہاں بھی معلوم ہوا مجسٹریٹ کے آفس میں جا کر پوچھا مگر حوالات کی جگہ کا پتہ نہ لگا۔ بھائیوں کا نام لے کر پوچھتی کہ یہاں ہیں یا آپ اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔۔۔؟ بعضوں نے مہذبانہ انداز میں اور بعضوں نے سرسری جواب دے دیا کہ نہیں۔ مجھے ان چکروں میں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ کوئی رکشے کے ساتھ ساتھ رہتا ہے پتہ نہ چلتا اگر وہ بے وقوف تین دنوں سے بس ایک ہی پھول دار شرٹ پہنے رہا جو دور سے صاف نظر آتا تھا۔۔۔ پھر یہ مرحلہ ختم...... اب سوال جیل میں سہولتیں فراہم کرنے کا تھا بھائیوں کو تو پان سگریٹ جیسی کسی چیز کی عادت نہ تھی۔ مخدوم سگریٹ کے عادی۔ میری پھوپھی زاد بہن کا بڑا لڑکا نسیم الحسن حیدر آباد آ گیا تھا۔ وہ اورنگ آباد جیل میں چار پانچ ماہ کا عرصہ گذار چکا تھا۔ گو مجھے اپنے تجربے کے لحاظ سے مشورہ دیتا۔ اس نے بتایا کہ کوئی عزیز اگر رقم وغیرہ جمع کروائے تو محفوظ رکھی جاتی ہے۔ اور قیدی جو طلب کرے منگوا دیا جاتا ہے میں مخدوم کے گھر گئی اور ایک قلیل سی رقم دے کر کہا۔ یہ اپنی طرف سے بھیج دیں۔ ان کے بہنوی کا لڑکا خاصی عمر کا تھا۔ میرے پاس ایسا کوئی نہ تھا جس سے یہ کام لے سکتی۔ چند دنوں بعد پھر وہاں گئی تو پتہ چلا کہ رقم نہیں بھیجی گئی کیوں کہ پہنچانے والا کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے حفیظ کا وہ لمبا بے وقوف سا بھائی محمود جو کبھی کبھی آ جایا کرتا تھا' میرے پاس آیا اس سے میں نے کہا میرا ایک کام کر سکتے ہو اس نے کہا ضرور اب بڑی سہولت ہو گئی رقم کھانا اور کتابیں وغیرہ جو چاہو بھیجو...... نسیم کے ہی کہنے کے مطابق کہ کسی عزیز کے نام سے یہ چیزیں بھیجی جائیں تو مناسب ہو گا چناں چہ ایک وقت آساوری کے دستخط لیے۔ انھوں نے اپنا نام دستخط میں ذکیہ لکھا ٹیڑھے اور بگڑے ہوئے خط میں نقل کرنا کچھ مشکل نہ تھا لہٰذا اس

ایک دستخط سے کام چلتا رہا۔ جو کچھ بھی بھیجا کرتی وہ چیز برابر مل جاتی۔ یہ جو کہا گیا تھا کہ کوئی عزیز ہی بھیجے تو چیز دی جاتی ہے بے کار بات تھی۔ کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ۔ پہنچنے والی ذکیہ کون ہیں۔ نہ پہونچانے والے سے کوئی باز پرس۔ ہر چیز کے ملنے کی باقاعدہ لینے والے کی دستخطی رسید بھی دی جاتی۔ چاہیں تو روز کچھ بھیجیں۔ مگر لے جانے والا ایسا کوئی نہ تھا۔ مجبوری۔ مخدوم یہی سمجھتے رہے کہ بیٹی بھیج رہی ہے۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ کتابیں تو آپ سے لے کر بھیجی ہوں گی۔ میں انجان بن کر ٹال گئی۔ بیٹی کی طرف سے حُسن ظن ختم کرنا ٹھیک نہ لگا۔ ظفر وغیرہ کو یہاں دو تین ہفتے ہی جیل میں رکھا گیا۔ اور پھر جالنہ کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں تلنگانہ جدوجہد میں گرفتار کر لیے گئے کئی سو کسان تھے رکھے گئے تھے کچھ دنوں بعد بعض شکایتوں کی وجہ سے ظفر نے کئی دنوں کی بھوک ہڑتال بھی کی۔ کچھ شکایتیں رفع بھی ہوئیں۔ پھر اسے گلبرگہ جیل بھیج دیا گیا۔ اور یہاں صرف میرے دو بھائی انور اور حفیظ گئے اتنی دور جانا اور ملنا تو مشکل تھا خط وکتابت جاری رہی گرفتاریوں کو دو تین ماہ ہو چکے تھے کہ مظہر ایک دن پیام لائے کامریڈ کلیم صاحب کا کہ بنگال سے تین اصحاب، مخدوم کو رہا کروانے کی کوشش میں آنے والے ہیں۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیجیے گھر میں بالکل جگہ نہ تھی ان ہی دنوں سامنے کا ایک گھر خالی ہوا تھا مالک مکان سے امیؔ کی شناسائی تھی میں نے امیؔ سے کہا ایک چٹھی لکھ دیں کوئی عزیز آرہے ہیں مکان ایک ہفتہ کے لیے دیا جائے جو بھی کرایہ ہوگا دیا جائے گا۔ انھوں نے بلا کچھ کہے چھٹی لکھ دی اور مکان دار صاحب نے کہہ دیا کہ آپ اپنے عزیزوں کو رکھ سکتے ہیں۔ امیؔ ذرا خاموش لگیں ان کے بچے جو جیل میں تھے۔ تین کامریڈ آئے۔ مظفر احمد میرٹھ سازش کیس کے ملزم کامریڈ گوپالن اور جیوتی باسو۔ کھانے پکانے کا سامان اور انتظام بھی اسی گھر میں رکھا تھا۔ مظہر اور قمر تقریباً ہمہ وقتی کارکن رہے تاج محل کے گیٹ پر رات دن ایک پلٹن کھڑی ہوتی۔ سڑک پار کر کے ادھر سے ادھر جائیں تو دیکھنے کے لیے مکان میں پیچھے کی طرف ایک گلی سی تھی اور ادھر ایک چھوٹا سا

دروازہ جس کا نہ جانے پتہ نہ تھا یا کیا؟ ادھر کوئی نظر نہ آتا ایک رات انڈر گراونڈ کا مریڈ کی میٹنگ رکھی گئی تھی اور اس دروازے سے خاصے لوگ جمع ہوئے کملا دیوی حال ہی میں جیل سے رہا ہوئی تھیں ان سے اسی میٹنگ میں ملاقات ہوی ان کے شوہر اروٹلا رام چندر ریڈی ایک بار زخمی ہو کر ہمارے ہاں آئے تھے مرہم پٹی کے لیے۔ پھر جیل میں بھی وہ اختر کے ساتھ تھے۔ کملا جی نے بتایا کہ اب کسان اور گاؤں کے اکثر افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی حکومت آگئی ہے۔ دیش مکھوں جاگیرداروں کا ظلم ختم ہو جائے گا۔ پھر یہ لڑائی کیوں؟ مخدوم کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا با سو خاصی اردو بول لیتے تھے۔ ساری بات چیت انھوں نے ہی کی تھی۔ گوپالن نے باتوں میں کچھ زیادہ حصہ نہ لیا۔ مظفر احمد تو خاصے معمر تھے۔

گوپالن صاحب کو جاوید چار مینار وغیرہ دکھانے لے گیا۔ وہاں سے وہ دو چار لنگیاں خرید لائے۔ یہ لوگ یہاں چھ سات دن رہے۔ پر کچھ نہ ہوا۔ بے نیل مرام واپسی۔ یہ سات آٹھ دن کافی مصروفیت میں گذرے۔ یوں تو کھانے والے تین ہی تھے پر کوئی نہ کوئی دو چار اور شریک ہو جاتے۔ دونوں وقت کے لیے سات آٹھ آدمیوں کا کھانا بنانا ہوتا تھا۔ بہر حال یہ وقت بھی گذر گیا۔ پہلے کی طرح محلے والوں اور لوگوں کے گھروں میں جانا۔ اس سلسلے میں کچھ اچھے اور دل چسپ تجربے بھی ہوئے امن اپیل پر دستخط کے سلسلے میں گھر سے قریب ہی ایسے دو تین گھر مل گئے جہاں کے لوگ کچھ سننا اور جاننا چاہتے تھے مگر ان کو کچھ بتانے سے پہلے گھر کے کسی بڑے محافظ جیسے باپ یا سسر وغیرہ کو اعتماد میں لینا پڑتا تھا۔ یوں تو یہ لوگ بڑے کٹر سے لگتے مگر بعد میں یہ اندازہ ہوا کہ بڑے سیدھے سادھے اور نیک لوگ ہیں۔ ایک جگہ ایک بڑے کنبے کے سرپرست نے ملتے ہی کہا کہ کمیونسٹ تو لامذہب ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں شادی بیاہ وغیرہ کا کوئی رواج نہیں ہے وغیرہ مجھے سب لوگ کمیونسٹ پارٹی کا ہی نمائندہ سمجھتے تھے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ یہ بہت بڑا پروپیگنڈہ ہے جو دشمن کرتے ہیں مجھ سے تو کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اور آپ سعدی شیرازی کو تو جانتے ہوں گے کہ دو چیزیں زندگی میں عام طور پر سب

سے اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ایک مذہب اور پھر محبت۔ اس سلسلے میں سعدی صاحب نے جو کہا وہ بھی سن لیجیے۔

شب چو عقد نماز می بندم چہ خورد بامداد فرزندم

یعنی رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ صبح کو بچے کیا کھائیں گے۔

چناں قحط سالی شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

اب دیکھیے خالی پیٹ رہ کر نہ ہی عبادت ٹھیک سے ہوتی ہے نہ محبت ہی کی جاسکتی ہے۔ اور یہ میرا کہنا نہیں ہے بلکہ سات آٹھ سو سال پہلے سعدیؔ صاحب نے کہا تھا۔ تو ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ لاکھوں انسان جو ننگے بھوکے رہتے ہیں انھیں کام' پیٹ بھر کھانا تن کو کپڑا اور ہر ایک کو صحیح معنوں میں انسانوں کی طرح جینے کا موقع نصیب ہو جائے۔ کیا آپ کو اس سے کچھ اختلاف ہے۔ غرض اس قسم کی باتیں کرنے پر وہ لوگ بہت قائل ہو گئے۔ اور پھر میرے آنے جانے اور ان کے گھر والوں سے ملنے جلنے پر کوئی اعتراض نہ رہا۔ بلکہ خود بھی کبھی کبھار ادھر ادھر کی باتیں کر لیا کرتے۔ اس گھر کی عورتیں اردو پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ میں اس گھر بہت دنوں تک جاتی رہی تھی۔ برسوں بعد جشن مخدومؔ سے کچھ پہلے جب ایک اجتماع میں مخدومؔ کو دوشالہ پیش کیا گیا تھا اس گھر کے چھوٹے چھوٹے لڑکے جو اب جوان ہو چکے تھے پہچان گئے اور خیر و عافیت دریافت کی۔ دستخطیں جمع کرنے اور گھر گھر گھومنے کے دوران ہی کرشن چندر' جعفریؔ، کیفیؔ، مجروحؔ، ساحرؔ، بنے بھائی (سجاد ظہیر) وغیرہ جیسے لوگوں کی مہمان داری بھی ہوتی رہی۔ یہ لوگ آکر میرے ہاں قیام کیا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں اخترؔ عالم خوندمیریؔ' کوکب دری، جے سوریا نائیڈو وغیرہ نے مل کر ایک نئی تنظیم پیوپلز ڈیماکریٹک فرنٹ Poeples' Democratic Front کے نام سے بنائی۔ پارٹی تو غیر قانونی تھی مگر اور ایسی

تنظیمیں بھی تھیں جس میں پارٹی کے ممبرس بھی شامل تھے شریک ہوئیں۔ فرنٹ ان ہی تمام پر مشتمل تھی۔ بے سوریا نائیڈو صدر چنے گئے۔ عنقریب جنرل الکشن ہونے والے تھے۔ بہت سارے پارٹی کامریڈ جیلوں میں تھے فرنٹ کی طرف سے ان میں سے بہتوں کے نام اسمبلی اور پارلیمنٹ کے لیے بھیجے گئے۔ غالباً الکشن سے تین چار ہفتے قبل ایک دن دوپہر دو بجے کے قریب ایک نوجوان رکشہ والے نے مجھے بلا کر کہا مخدوم صاحب چھوٹ گئے۔ اور نام پلی کے گھر میں ہیں۔ میں نے کہا وہاں لے چلو گے۔ بولا ضرور۔ نام پلی میں سروجنی نائیڈو کے گھر چھوڑ دیا اندر گئی تو دیکھا کوئی نہیں ہے ہال میں صرف اختر کھڑے ہیں۔ ان سے کچھ پوچھنا چاہتی ہی تھی کہ کمرے سے ایک صاحب نکلے میں آگے بڑھی پر وہ مخدوم نہیں تھے رک گئی۔ دو منٹ بعد ہی دوسرے طرف سے مخدوم خود ہی میرے طرف تیزی سے بڑھ کر آئے۔ اور ہاتھ ملانا چاہا جو خالی نہ تھا۔ میرے گھر میں گلاب کھلے تھے۔ اتفاق سے ان میں ایک سرخ گلاب بھی تھا۔ میں نے جلد ہی ایک گلاب توڑ لیا تھا۔ جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھما ہوا تھا مخدوم نے مسکراتے ہوئے یہ پھول مجھ سے لے لیا۔

الکشن کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اُس دن دو میٹنگیں ہونے والی تھیں چار بجے شام چکڑ پلی میں اور دوسری رات آٹھ بجے دیوان دیوڑھی پر۔ ارونا آصف علی صاحبہ خاص مقرر تھیں۔ مخدوم کو پرانے شہر سے کھڑا کیا گیا تھا۔ وہاں موجود افراد سے تعارف ہوا۔ پہلے آنے والے صاحب روی نارائن ریڈی تھے جو نلگنڈہ سے پارلیمنٹ کے لیے کھڑے کیے گئے تھے۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے ہم چکڑ پلی کے لیے روانہ ہو گئی۔ تب تک بہت ہی کم لوگوں کو ان رہائیوں کا علم ہوا تھا۔ پھر بھی جلسہ گاہ میں کافی مجمع نظر آیا۔ مخدوم یہاں پہنچے تو لوگوں کی خوشی کا عالم ناقابل بیان تھا۔ مزدوروں نے تو انھیں کاندھوں پر اُٹھا کر ڈائس تک پہنچا دیا۔ سنا تھا ارونا جی بہت اچھی تقریر کرتی ہیں۔ پر اس دن تو یوں لگا کہ جیسے مخدوم کے سوا کسی اور کا وجود ہی نہیں۔ آناً فاناً خبر پھیل گئی مجمع بڑھتا گیا۔ میٹنگ کے اختتام پر

مخدوم محی الدین کا خط اور نظم "قید" سنٹرل جیل حیدرآباد وارڈ نمبر 10 سے جمال النساء کے نام

دیوان دیوڑھی کی طرف روانگی تقریباً چھ سات میل کا فاصلہ، مخدومؔ روی نارائن اور دوسرے دو تین امیدوار لاری میں جلوس کی شکل میں نکلے ایک لاکھ سے زیادہ افراد کا مجمع اس میں، میں بھی شامل تھی۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹوں بعد دوسری میٹنگ کے لیے پہنچے ڈائس کے سامنے ہی فرش پر امّی وغیرہ سب گھر والے موجود۔ رابعہ کی بڑی لڑکی شُہلا چار پانچ سال کی تھی مخدومؔ نے نیچے اُتر کر امّی کو سلام کیا اور شُہلا کو گود میں اُٹھالیا۔ غرض کوئی دو بجے رات کو یہ میٹنگ ختم ہوگئی مخدومؔ دوسرے دن شام ہمارے یہاں آئے اور رات یہیں گذاری۔

وقت تھوڑا کام بہت' ہزاروں لوگوں نے تو یہاں شاید ووٹ کیا بلا ہے یہ بھی نہ سُنا ہوگا۔ پتھر گٹی پر ایک ملگی میں آفس کھولا گیا۔ صبح سے وہاں کارکن آجاتے مخدومؔ بھی آجاتے۔ دن بھر کا پروگرام بنتا۔ رات دیر گئے واپسی ہوتی۔ میرے ساتھ مظہر، قمر اور آغا پورہ والی تین لڑکیاں ہوتیں راج کی چچی اور بیوی بھی یہ لوگ وہیں شاہ علی بنڈہ میں رہتے تھے۔ ہمارا نشان ہاتھ کا پنجہ۔ اور ووٹروں کی اکثریت مسلمانوں کی۔ بات چیت کرو تو کہتے کہ یہ تو پنجتن پاک کا پنجہ ہے اس کو نہیں تو کس کو دیں گے۔ میٹنگوں میں بھی کافی اجتماع ہوتا۔ پندرہ بیس دن میں سب جگہ جانا ناممکن سا لگا۔ ہمارے علاوہ کامریڈز کے اور گروپ بھی کام کر رہے تھے۔ پھر بھی.......... بظاہر تو یوں لگتا جیت ہماری ہی ہوگی پر نتیجہ خلافِ توقع۔ صرف چند سو ووٹوں سے ہار ہوگئی۔ حکومت کی طرف سے ڈرانے دھمکانے کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنی ہی دھاندلیاں ہوئیں۔ لاریوں میں بھر بھر کر ووٹرس چلے آرہے ہیں۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وقت ختم لیکن ووٹنگ ختم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر جے سوریا بھی نہ جیت پائے۔ اختر کامیاب ہوگئے۔ جلگاؤں سے جہاں کے لوگوں نے شاید پہلے کبھی ان کا نام سنا بھی نہ ہوگا۔ مگر وہاں لوگوں کو نام سے غرض نہ تھی واسطہ اس بات سے تھا کہ امیدوار کس پارٹی کا ہے۔ اس طرح کملا دیوی، اور بہیترے دوسرے کامریڈ کامیاب ہوگئے۔ روی نارائن ریڈی نے تو جواہر لعل نہرو سے بھی زیادہ

ووٹ حاصل کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ کچھ ہی دنوں بعد حضور نگر کی سیٹ خالی ہوگئی اور وہاں سے مخدوم کو کھڑا کیا گیا۔ ایک شام سات آٹھ بجے روی نارائن صاحب دو تین اور کامریڈوں کے ساتھ آپہنچے اور کہا چلنا ہے کہاں، کیوں یہ سب کچھ کون پوچھتا۔ تین چار جوڑے کپڑے لیے ایک ہینڈ بیاگ میں ڈال چند منٹ میں تیار ہوگئی۔ گھر کی دیکھ بھال امی کے ذمے کر دی تھی رات بارہ کے قریب ایک گاؤں میں لوگ جلسے کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ بڑا اکٹھا، تقریریں وغیرہ ہوئیں۔ وہاں سے مریال گوڑہ نامی قصبے کو روانہ ہوئے یہاں بھی وہی سب کچھ ہوا تین بجے رات کے بعد فرصت ہوئی۔ کسی کے گھر ٹھہرا دیا گیا۔ صبح ناشتہ پھر سے روانگی مجھے میٹنگوں میں بولنے کی عادت نہ تھی۔ مگر کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑا دوسرے دن مغرب کے بعد حضور نگر پہنچے۔ وہاں دو منزلہ گھر تھا اُوپر جانے کو کہا گیا...... سناٹا ...... دلان اور اس کے بازو ایک کمرا ہر جگہ اندھیرا، کمرے کی کھڑکی کے سامنے دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی پانچ دس منٹ بعد ہی روشنی ہوئی، کھڑکی کھلی مخدوم نے حسب معمول مسکراتے ہوئے کھڑکی کی سلاخوں میں سے ہاتھ بڑھایا۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا ساتھ آنے والے کامریڈ جمع ہوگئے کھانا، تیس تبصرے۔ اتنے میں کملا جی بھی آگئیں۔ ساتھ کا دلان ہم دونوں کا بیڈروم بنا۔ صبح کئی لڑکیاں اکٹھا ہوگئیں مذہباً سب کی سب ہندو مگر یہاں نہ ذات پات تھی نہ مذہب اور نہ چھوت چھات نہ ہی زبان کا جھگڑا۔ مخدوم نے ایسے ملایا جیسے اُن کی عزیز ہوں۔ بہت خوش' انھوں نے پوچھا ہماری کامریڈ آپ کو کیسی لگیں' بُری لگنے کا تو سوال ہی نہ تھا سب نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ یُوں جیسے ہمیشہ سے جانتی ہوں۔ ذرا دیر ہنس بول کر کام پر روانہ ہوگئے۔ حضور نگر کافی بڑا موضع تھا کھانے پینے اور چائے وغیرہ کی دو کانیں۔ کامریڈ میری خاطر مدارت پر تُلی ہوئی۔ کہیں چائے اور کہیں کچھ اور دوپہر کو واپس ہوئی۔ کھانے کے بعد پھر وہی چکر۔ پانچ دن بعد پولنگ ہوئی اب ساری ٹیم کسی دوسری جگہ ایسے ہی کام کے لیے روانہ ہوگئی۔ میرا دوپہر کی بس سے مخدوم کے ساتھ روانہ ہونا طے تھا۔ آفس صبح ہی خالی

کر کے ایک برہمن خاتون کے گھر آ رہے۔ یہاں مخدوم کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی انھوں نے کہا ایک

دن یہیں گذار لیتے ہیں۔ ووٹوں کی گنتی کے بعد ہی واپس ہوں گے مجھے تکلف کہ کیوں رہوں واپسی

کا ارادہ ظاہر کیا صاحب خانہ نے جلد ہی کھانا تیار کر کے سامنے رکھ دیا۔ اصرار کر کے کھلا رہی ہیں

مخدوم پلنگ پر لیٹے لیٹے خوش نظر آ رہے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں دیکھیے کیسے پُرخلوص ہیں ہمارے

لوگ شاید کامریڈ حیدر بھی ساتھ تھے۔ ان سے مجھے بس پر سوار کرانے کو کہا۔ تھوڑی دُور چل کر خیال آیا

کہ کرایہ پُوچھوں میرے پاس کرائے کی اتنی رقم نہ تھی اب تک کبھی کسی کام کے لیے پارٹی یا کسی سے

پیسے نہیں لیے تھے اب کرایہ مانگنا پڑا۔ بس رونا سا آ گیا۔ یہ صاحب جا کر رقم لے آئے۔ سفر کی ابتدا ہی

غلط ہوئی تھی۔ حد سے زیادہ تکلف کرنے کی سزا ملی۔ راستے کی تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا مریال گوڑہ

وہاں سے بس بدل کر نلگنڈہ جائیں پھر وہاں سے بس بدل کر حیدر آباد جا سکتے ہیں شام چار بجے کے

قریب مریال گوڑہ پہنچی معلوم ہوا کہ نلگنڈہ کوئی بس نہیں جائے گی۔ وجہ کسی کو نہیں معلوم اب کیا کروں

قریب ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے پوچھا کہاں چلنا ہے۔ بتایا تو کہنے لگا میرے پاس

وہاں کی تین سواریاں ہیں۔ آپ چل سکتی ہیں۔ دو گھنٹے بعد روانگی ہوگی۔ یہ کھدر پوش تین افراد تھے۔

سامنے میدان کی طرف نظر پڑی بہت سارے لوگ جمع تھے۔ میں بیاگ کار میں رکھ مجمع کی سمت بڑھی

تو دیکھا کہ روی نارائن ریڈی صاحب جن کے کپڑے خون میں تر تھے۔ لاری میں چند کامریڈ کے

ساتھ۔ اوپر چڑھ کر حالات دریافت کیے۔ معلوم ہوا نلگنڈہ میں پارٹی آفس کو جلا دیا گیا توڑ پھوڑ وغیرہ

ہوئی۔ انھوں نے چند منٹ لوگوں کو مخاطب کیا۔ لاری روانہ ہونے کو ہوئی تو میں نیچے اُتر پڑی۔ نیچے وہ

تینوں سیٹھ صاحبان کھڑے نظر آئے انھوں نے بھی دیکھا۔ اب ان کے ساتھ جانا ٹھیک نہ لگا۔ جا کر

بیگ کار سے اُتار لیا۔ کار روانہ ہوگئی مجمع چھٹ گیا۔ شام ہو رہی تھی کروں تو کیا کروں۔ اسی سوچ میں

کھڑی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی باجی -- پلٹ کر دیکھا مہذب سے ایک دھوتی پوش صاحب تھے۔

میں نے تو پہچانا نہیں انھوں نے کہا میں وکیل گرواریڈی۔ آپ یہاں کیسے؟ قصہ سن کر کہا۔ میری کار خالی جارہی ہے نلگنڈہ چھوڑ دے گی۔ احتیاطاً سامنے سے جھنڈا اُتار لیتا ہوں۔ ایک لڑکا بھی ساتھ کر دیتا ہوں۔ یوں یہ مشکل آسان ہوئی۔ نلگنڈہ میں بلدیہ الکشن کے سلسلے میں ایک گھر میں کئی دن رہ چکی تھی۔ یہ گھر گلی میں پارٹی آفس کے مقابل تھا۔ گلی کے سرے پر کار سے اُتری۔ وہاں اب بھی پولیس والے بھرے ہوئے تھے۔ اندر جانے پر روکنے لگے۔ ذرا ڈانٹا ڈپٹا پھر کسی طرح جانے دیا۔ اندر گئی تو سارے گھر والے پریشان و فکر مند نظر آئے پتہ چلا کہ شہر سے آمد و رفت' فون وغیرہ جیسے سارے رابطے منقطع ہو گئے ہیں۔ سُنا ہے کہ وہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ ان گھر والوں کے تین لڑکے شہر کے کالجوں میں تھے۔ جن کی کوئی خیر خبر نہ مل سکی تھی کہیں اور جانے کا سوال ہی نہ تھا لہٰذا جوں توں کر کے رات وہیں گذر گئی صبح معلوم ہوا کہ شہر کو بسیں نہیں جارہی ہیں۔ البتہ بھونگیر تک جارہی ہیں۔ میں نے وہیں جانے کا فیصلہ کرلیا یہاں بھی پارٹی آفس میں دو چار دن رہ چکی تھی۔ لیکن وہاں نہیں گئی۔ بس اسٹیشن کے قریب ہی رُکی۔ ٹرین کوئی چھ بجے شام حیدرآباد روانہ ہوئی چناں چہ ویٹنگ روم کھلوایا اور بقیہ دن وہاں گزارا۔ رات آٹھ بجے حیدرآباد پہنچی۔ رکشے والے نے بتایا کہ کرفیو آج ہی اُٹھا ہے۔ گھر پہنچی ساری تفصیلات کا پتہ چلا۔ وہاں کافی ہنگامہ ہو چکا تھا۔ طلباء پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس موقع پر میرے سب بھائی موجود تھے۔ اختر گرفتار کرلیے گئے۔ یہ سب کچھ غالباً وشال آندھرا کے سلسلے میں ہوا تھا۔ اختر کو چند دنوں بعد رہائی ملی۔ اس ہنگامے میں کئی افراد شہید بھی ہو گئے۔ حضور نگر میں مخدوم کافی ووٹوں سے کامیاب ہو گئے۔

ان گرفتاریوں سے پہلے کوئی خاص کام تو رہا نہیں تھا۔ عموماً دن کو اپنے قریبی محلوں میں گھر گھر جا کر امن اپیل پر دستخط جمع کرتی۔ اور شام آٹھ بجے کے بعد دیر تک قریبی محلوں کے چار پانچ ایسے گھروں میں جہاں کی خواتین اور لڑکیاں کچھ سننے اور جاننے کی شوقین ہوتیں جا کر "انسان کا عروج"،

''والگا سے گنگا تک'' گورکی کی آپ بیتی وغیرہ جیسی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی اور پھر سوالات ہوتے میں ان کے جوابات دیتی۔ ایسے دو گھر تو آغا پورہ میں تھے۔ ایک میکش مرحوم کا گھر جہاں ان کی ساس، سالی اور ان کے بچے رہتے تھے اور دوسرا کامریڈ سُندریا کے ہم جماعت کھمم کے ایک صاحب کا، جن کی بہن اور بھانجی حسینی علم اسکول میں پڑھتی تھیں۔ جہاں میری بہن رابعہ ٹیچر ہوگئی تھی۔ ذکیہ اب کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی ایک ہم جماعت کے گھر بازار گھاٹ بھی جانے لگی۔ امن اپیل کے دستخط کے دوران ملے پلی میں دو ایک گھر ایسے لگے جہاں پر یہ سلسلہ شروع کیا جاسکا۔ امن اپیل پر دستخطوں کے تعلق سے یاد آیا کہ کوئی پندرہ بیس دن پہلے مخدوم کا ایک خط کسی کامریڈ کے ذریعہ مجھے ملا تھا جس میں انھوں نے میرے دستخطوں کے تعلق سے اظہار خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اپنی رائے سے اس بارے میں مطلع کروں۔ میں سوچتی رہی کہ میں بھلا کیا رائے مشورہ دے سکتی ہوں۔ چناں چہ کوئی جواب لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ یہ گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ذہن پر ایک بار یہ بھی تھا کہ انور کے اس جنگل کے گھر میں مخدوم سے میرا ملنا ہوا کرتا تھا۔ تو ان سے ان کا کلام سننے کو جی بہت چاہتا مگر فرمائش کرنے کی ہمت نہ ہوتی ایک دن نہ جانے کیسے ''جنگ آزادی'' سنانے کو کہا اختر بیگم نے مجھے بتایا تھا کہ مخدوم سے فرمائش کر کے انھوں نے کئی نظمیں اُن سے سنیں مگر ''جنگ آزادی'' انھوں نے فرمائش پر بھی نہیں سنائی۔ یہاں میں نے شاید بلا سوچے سمجھے اُسی نظم کو سنانے کی خواہش کی تھی۔ انھوں نے اس نظم کو کافی زور سے اپنے خاص لہجے میں سنایا اب مجھے یہ بھی خیال آرہا تھا کہ چاروں طرف خفیہ پولیس گھومتی رہتی ہے کہیں آواز سن لے تو قیام گاہ کا پتہ نہ چل جائے۔ کتنے ہی ایسے خیالات ذہن پر چھائے ہوئے تھے پولیس کے گھیرے کی وجہ سے تین دن تک تو کوئی وہاں جا ہی نہ سکا۔ اس کے بعد قمر اور مظہر گئے۔ حالات کی تفصیلات کا پتہ چلا۔ ہتھیار پولیس کے ہاتھ نہ لگا یہ جان کر کافی اطمینان ہوا۔ مظہر اور قمر کی کوششوں سے قریبی محلے آصف نگر میں ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان مل

گیا۔ اور شہزاد آپا وغیرہ اس میں منتقل ہوگیئں۔ اختر آئی تو اس ریوالور کو نکال کر اپنے ساتھ لائی اور یہاں میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بھی اسے ایک صندوق میں ڈال دیا۔ شہزاد آپا کچھ رقم وغیرہ کے حصول کی خاطر اپنے دیور کے پاس مقطعہ چلی گئیں۔ یہاں اختر نے بتایا کہ ان کا شوہر بار بار آ کر اسے بہت تنگ کر رہا ہے کہ بتا ؤ ریوالور کیا ہوا۔ اسے بخار آنے لگا۔ مگر وہ اسی حالت میں کام کرتی رہی چند دنوں بعد شہزاد آپا لوٹ آئیں۔ اختر کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی بخار مستقل رہنے لگا۔ قمر نے بتایا کہ طبعیت بہت خراب ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر شاہ نواز کا نام اچھے ڈاکٹروں میں لیا جاتا تھا۔ میں نے جاوید کو شام آٹھ بجے انھیں لانے کے لیے بھیجا۔ اور خود میں شہزاد آپا کے گھر گئی نو بج گئے لیکن ڈاکٹر صاحب کا پتہ نہیں۔ کوئی دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آئے۔ مریضہ سے پہلے انھوں نے گھر کو بغور دیکھا جہاں لائٹ نہیں تھی صرف دو ایک قندیلیں جل رہی تھیں۔...... خیر مریضہ کو دیکھ کر بتایا کہ اسے ٹائیفڈ ہوگیا ہے اور نسخہ لکھ کر ہاتھ میں تھما دیا۔ میں ٹیکسی کا کرایہ اور فیس دینے لگی تو کہا کہ آٹھ بجے کے بعد میری فیس دوگنی ہو جاتی ہے مجھے بہر حال دینی پڑی۔ جاوید ان کے یہاں سات سوا سات تک پہنچ چکا تھا۔ تو انھوں نے کہا میں عشا کی نماز کے بعد چلوں گا۔ وہ ان کو ساتھ لانے کے لیے دیر تک بیٹھا رہا اس نماز سے ڈاکٹر صاحب کو بڑا فائدہ ہوا فیس ڈبل ہوگئی......! مگر میرے پاس جو بھی رقم تھی ختم ہوگئی۔ ٹائیفڈ کی مجرب دوا حال ہی میں متعارف ہوئی تھی جو کافی مہنگی تھی۔ مجبوراً فوراً منگوا نہ سکی دوسرے دن شہزاد آپا نے اپنے چھوٹے دیور سے جو حیدر آباد ہی میں رہتے تھے کیفیت کہلوا کر رقم منگوائی اور اس طرح دوسرے دن دوپہر کو مریضہ کو دوا مل پائی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور دو دن بعد یہ پیاری سی بہادر لڑکی ''گذر بھی جا   کہ تیرا انتظار کب سے ہے'' پڑھتی اس لالچی دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ یہ مکان بہت چھوٹا تھا مظہر وغیرہ نے ذرا بہتر مکان تلاش کیا اور یہ لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔

مجھے اب کافی فرصت ہوگئی رضیہ ویمنس کالج میں لکچرر ہو گئیں تھیں خرچ کا پورا بار اس پر تھا۔

گھر کا انتظام میں نے امی کے سپرد کر دیا تھا۔ ہاں کام کی ذمہ داری ہم دونوں کی ہی تھی۔ جس سے نو دس بجے صبح تک فراغت ہو جاتی۔ رضیہ نے میرے لیے ایک کام فراہم کر دیا تھا۔ کاٹیج انڈسٹری سے جو ان دنوں لیپاکشی کہلاتی ہے اجرت پر پرنٹنگ کام لا دیتی۔ مصروفیتوں کے باوجود اتنا تو کر ہی لیتی کہ چالیس پچاس روپے ماہوار مل جاتے۔ اور یوں ضروری اخراجات پورے ہو جاتے ابی کو ذکیہ کی شادی کی فکر تھی۔ کیفی اور شوکت یہاں آئے تھے ایک دن کیفی نے ذکیہ کے لیے عادل کے رشتے کی بات کی۔ اور یہ بھی بتایا کہ پارٹی ممبر ہیں اس وقت پارٹی ممبر ہونا کم از کم میرے نزدیک گویا مکمل انسان ہونا تھا۔ لہٰذا کچھ اور معلوم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھیمڑی کانفرنس میں دونوں مل بھی چکے تھے۔ ہم سب نے سوچا کہ ٹھیک ہے مگر.......... ابیؔ کتنے ہی روشن خیال کیوں نہ ہوں ایک برہمن پنجابی سے رشتہ کرنے پر شاید ہی تیار ہوں۔ لہٰذا دروغ مصلحت آمیز سے کام لینا چاہیے تو ان سے کہا اصلی نام عادل ہے اور فلمی دنیا میں لیا جانے والا نام وشوامتر ہے۔ نیز یہ کہ یہاں چوں کہ پارٹی غیر قانونی ہے تو بمبئی جا کر یہ فریضہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ بھی کہا کہ ذکیہ راضی ہے ابیؔ نے اور کچھ نہ پوچھا بات طے ہو گئی ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ تو نہیں اختر، امی اور میں ذکیہ کو ساتھ لے کر جا کر بمبئی میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں۔ ابیؔ اپنے عہد پر قائم رہے رضیہ کے تعلق سے کئی پیامات آئے لیکن رضیہ کی مرضی نہ تھی تو ابیؔ نے کبھی اسے مجبور نہ کیا۔ خیر...... بمبئی میں عصمت چغتائی کے گھر ٹھہرنے کا انتظام ہوا۔ عادل ان دنوں بے کار تھے۔ عزیز الدین صاحب کی وفات پر علم ہوا کہ ہاسپٹل میں ابی کے ذریعہ۔ انہیں جو ماہوار وہ آخری تھی۔ دوسرے ماہ سے پنشن ہونے والی تھی نیز یہ کہ مکان، انشورنس کی قسطیں، تعلیمی قرض وغیرہ سب آخری ماہوار تک ادا ہو چکا ہے۔ اب کچھ دینا نہیں ہے۔ یہ بھی کہ تنخواہ چھ سو ماہوار سے کچھ اوپر ہی مل رہی تھی۔ مگر مجھے وظیفہ صرف پچاس روپیہ ماہانہ۔ اتنا کم کیوں نہ میں نے پوچھا نہ ابیؔ نے۔ بس اتنا کروا لیا کہ بینک سے مل جایا کرے۔ انشورنس کے دس ہزار نقد بھی وہیں

اُسی دن مل گئے۔ یوں موتی گلی صرف ایک بار جانا پڑا تھا۔ جاوید گرامر میں پڑھ رہا تھا۔ غالباً پانچویں کلاس میں۔ وہاں کی فیس۔ رکشا کا کرایہ وغیرہ ملا کر ماہانہ چالیس پینتالیس کا خرچ تھا۔ گھر کے خرچ کے لئے پہلے بھی مجھے پچاس ماہوار ہی ملتے تھے۔ کپڑا، کھانا، کرایہ مکان، اسی میں ملنا ملانا سب کچھ۔ بچے کی تعلیم اس میں شریک نہ تھی۔ اب آمدنی بڑھانے کی کوئی صورت ضروری تھی۔ میرا خود میٹنگز وں میں جانا۔ رکشا کا کرایہ۔ ایک آدھ کامریڈ کا کھانے وغیرہ کا خرچ۔ الکشنوں کے سلسلے میں گھومنا وغیرہ۔ کسی بھی کام کے لئے پارٹی سے کبھی ایک پیسہ نہ لیا۔ عادل ریڈیو میں ملازم تھے۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں رہے پھر شاید بمبئی تبادلہ ہوگیا تھا۔ وہ ڈبل ایم اے تھے۔ انگریزی کے بعد۔ فارسی سے بھی کیا تھا ۔ پھر لکھنؤ کا قیام۔ تو زبان کافی اچھی۔ ان دنوں پارٹی شاید گاندھی جی کی حمایتی نہ تھی۔

ان سے غالباً ریڈیو پر گاندھی جی کے بارے میں ستائشی مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا۔ جو اس وقت کی پارٹی پالیسی کے لحاظ سے ٹھیک نہ تھا۔ تو انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور بالکل بے کار تھے لیکن پھر جلد ہی انہیں مدراس میں فلم انڈسٹری کے تحت لکھنے لکھانے اور کچھ ڈائرکشن کا کام مل گیا۔ اور تقریباً سب ہی لکھنے والوں کی طرح۔ فلمی ادارہ ہی معاشی ضرورتوں کا ذریعہ۔

عصمت آپا اور ان کی چھوٹی بہن جن کے شوہر پولیس ایکشن میں ختم ہوگئے تھے۔ شام کی چائے کے لوازمات میں مصروف ہوگئے تھے۔ یہاں یونیورسٹی کے ہندی کے پروفیسر ونشی دھرودیا نکار کی بڑی لڑکی شاردا وہیں تھیں وہ ذکیہ کی سہیلی بن گئی تھیں۔

غیر متعلق ذمہ داریاں

پارٹی کا کام تو اپنے شوق سے کر رہی تھی ایسے بھی کتنے ہی کام کرنے پڑے۔ جن سے مجھے کوئی دل چسپی نہ تھی مثلاً کھانا پکانا جس کا مجھے بالکل شوق نہ تھا مگر تقریباً بارہ سال کی عمر سے یہ کام کرنا پڑا۔ اسی طرح رشتے لگانے اور شادی بیاہ کی تقاریب کے انتظامات سے مجھے قطعی کوئی دل چسپی نہیں تھی مگر کتنی ہی ایسی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑیں سب سے پہلے تو ایک صاحب کی شادی کا انتظام کرنا پڑا جن سے مجھے کوئی واسطہ تھا اور نہ میں اُنھیں جانتی تھی۔ جاوید کے والد کے کوئی ماتحت تھے اور اپنے والدین کی مخالفت کے باوجود۔ انھوں نے ان کا رشتہ میری خالہ زاد بہن خواجہ بیگم کی لڑکی پتلی بیگم سے کروا دیا انھوں نے تھوڑی سی رقم میرے ہاتھ میں تھما کر شادی کا انتظام کرنے کو کہا۔ میں دولھا والی بن کر پتلی بیگم کی رخصتی کروا کے اپنے گھر لے آئی۔ یہاں تک تو ٹھیک رہا۔ لیکن اس کے بعد حماقت یہ ہوئی کہ ان دونوں کو اپنی میٹنگوں وغیرہ میں شریک رکھا ان دنوں ذہنوں کو جگانے اور شعور بیدار کرنے کا بھوت سوار تھا۔ سوچا لڑکا گریجویٹ ہے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کی ہے تو ضرور سمجھ دار ہوگا۔ مگر وہ تو انتہائی قدامت پرست نکلا ہمارے خیالات اور بیوی کی بے پردگی انھیں بہت ناگوار گذری۔ چند ہی ہفتوں میں بیوی کو لیے سسرال میں جا رہے۔ اور بیوی کو ہم سے ملنے سے منع کر دیا۔

...... دوسری تقریب جس کا انتظام کرنا پڑا وہ میرے اپنے چچا کی لڑکی حلیمہ بیگم کی شادی کا تھا۔ چچا میاں مسجد کے قریب حسرت چچا والے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں سے اب خفا نہ تھے چچی اماں کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ تب ہی مجھے وہاں جا کر سب کچھ کرنا پڑا تھا۔ اب چچا میاں نے بطور خاص آ کر مجھ سے کہا کہ تم کو ہی اس شادی کا انتظام کرنا ہوگا۔ کیسے انکار کرتی۔؟ یہ رشتہ خط و کتابت کے ذریعہ پھوپھی اماں کا طے کیا ہوا تھا۔ چچی اماں کا جو تھوڑا بہت زیور کپڑا تھا انھوں نے سب میرے حوالے کر دیا تا کہ جو مناسب سمجھوں کروں۔

جیسے بھی ممکن ہوا میں نے اس کام کو انجام دیا۔ شادی کے بعد رخصت ہو کر چلی تو گئیں مگر
تھوڑے ہی دنوں بعد نہ جانے کیا ہو گیا اپنا زیور کپڑا لے کر واپس ہو گئیں۔ چند روز بعد شوہر لینے آئے
تو انکار کر دیا انھیں دنوں گھر میں چوری ہوئی حلیمہ بیگم کا خیال کہ یہ چوری ان کے میاں ہی نے کی
ہے۔ کچھ دنوں بعد دونوں میں خلع ہو گئی۔ وہ صاحب پاکستان چلے گئے یہاں حلیمہ پر ہسٹیریا کے
دورے پڑنے لگے۔ باپ بے چارے پریشانی کے عالم میں بھاگے بھاگے آئے۔ میں نے کچھ دن
بلا کر اپنے پاس رکھا۔ اس دوران چچا کے کسی دوست نے کوشش کر کے حلیمہ بیگم کا عقد کسی مسجد کے متولی
سے کروادیا۔ ویسے وہ زیادہ تر باپ کے پاس رہا کرتیں۔ مگر جب باپ بیمار ہو گئے تو انھیں اکیلا چھوڑ
کر نند پاس چلی گئیں ایک دن ان کے پڑوسی نے آکر اطلاع دی تو میں کوآپریٹیو میں عبدالرزاق
صاحب جو "ماسٹر صاحب" کے نام سے مشہور تھے، انھیں ساتھ لیے انکے گھر گئی تو دیکھا وہ بالکل ہی
اکیلے فالج میں مبتلا دو دن کے بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں۔ کھانا کھلایا رزاق صاحب نے
کپڑے بدلے۔ پھر انھیں عثمانیہ ہسپتال لے گئی۔ وہاں کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد نرسوں اور
ڈاکٹروں کی فضول بکواس سننے اور انھیں ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد بمشکل جنرل وارڈ میں شریک کروا سکی۔
دو تین دفعہ دیکھنے گئی ان کی حالت میں کوئی سدھار نہ ہوا تو گھر لے آئی۔ بالکل معذور ہو گئے تھے
اتفاق سے ایک ایسا آدمی مل گیا جو ان کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ وہ انھیں رات کا کھانا کھلانے کے بعد
چلا جاتا اس سے زیادہ میں اور کچھ نہ کر سکی۔ بیٹی داماد کو جب یہ معلوم ہوا کہ گھر خالی پڑا ہے تو وہاں آکر
رہنے لگے چار پانچ ماہ بعد جس رات حالت بہت خراب تھی میں نے کہلا بھیجا تو جواب دیا کہ میں کیا
کروں۔ بہت دنوں بعد ملنے آئیں تو میاں کی شکایت کرنے لگیں کہ انھوں نے آنے سے روک رکھا
تھا.......... تیسری شادی جس کی ذمہ داری مجھ پر پڑی وہ سلیم چچا مرحوم کے بڑے لڑکے نسیم کی تھی۔
انھوں نے ایک دفعہ خاص طور پر مجھے اورنگ آباد بلایا کہ ایک یتیم لڑکی صرف ماں کے ساتھ ہے

آپ آکر ان سے ملیں۔ اور معاملہ طے کروادیں۔ میں وہاں گئی دونوں سے ملی۔ مجھے تو کچھ زیادہ پسند نہیں آئے یہ لوگ اورنگ آباد سے کافی دور کسی قصبے میں رہتے تھے۔ نسیم نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ایک وکیل صاحب آپ کو اورنگ آباد سے اس قصبے تک پہنچادیں گے اور میں وہاں آکر آپ سے ملوں گا۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ اتفاق سے نسیم کو کسی ضرورت کے تحت وہاں سے جانا پڑا۔ ان دونوں خواتین سے ملاقات ان کی عدم موجودگی میں ہوئی دوسرے دن صبح نسیم آگئے مجھ سے پوچھا ملاقات کیسی رہی۔ میں نے مختصراً بتادیا کہ کچھ دیر ٹھہری بات چیت ہوئی۔ نسیم نے تعجب سے کہا۔ پھر رات آپ کہاں رہیں۔ میں نے کہا انھیں وکیل صاحب کے گھر۔ بلا کیمیں ان لوگوں کے گھر کیسے رہ سکتی تھی۔ نسیم کو انکا یہ برتاؤ غیر شریفانہ لگا۔ اور انھوں نے قصہ ہی ختم کردیا۔ وکیل صاحب کے گھر والے کافی مہذب اور ملنسار لوگ تھے۔ اسی دن اورنگ آباد واپس ہوگئی۔ دو دن وہاں ٹھیرنے کے بعد حیدرآباد۔ آپا اپنے اس لڑکے سے کچھ خوش نہ تھیں۔ اور اس کے کسی کام میں دخل نہ دیتیں۔ میرے اس طرح آنے جانے پر وہاں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ کچھ دن بعد اس نے مجھے لکھا کہ فلاں صاحب کی نواسی سے بات کرکے کچھ طے کرادوں۔ اب الکشن کے زمانے میں جب کہ میں بے حد مصروف تھی مجھ پر ذمہ داری ڈال دی کہ فلاں سے بات بھی طے کرادوں اور شادی کا انتظام بھی کروں۔ یہ صاحب زادی دادی اماں کی بڑی بہن کی نواسی تھیں جو حیدرآباد میں اپنے داماد کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ لڑکی نے انٹر پاس کرلیا تھا۔ بہر حال یہ کام بھی کرنا تھا۔ صالحہ پھوپھی "لڑکی کی نانی" فوراً تیار ہوگئیں اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق شادی کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ نسیم نے لکھ دیا تھا وہ اکیلا ہی آئے گا۔ شادی ہوگئی۔ میرے یہاں ہفتہ عشرہ رہ کر دونوں اورنگ آباد چلے گئے۔ نسیم نے کوشش کرکے انھیں ٹیچر کی نوکری دلوادی۔ وہ چار پانچ سال کے اندر تین لڑکوں کی ماں بھی بن گئیں۔ مگر نسیم کا جو یہ خیال تھا کہ پڑھی لکھی ہیں تو کچھ اچھی سمجھ بوجھ بھی رکھتی ہوں گی ٹھیک ثابت نہ ہوا۔ دونوں کے

مزاج نہ مل سکے شادی کے پانچ سال بعد نسیم کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا کوشش کر کے انھوں نے بیوی کا

تبادلہ بھی یہیں کروالیا۔ یہاں آنے کے بعد چھوٹا لڑکا (پرویز) پیدا ہوا۔ نسیم نے اپنے لڑکوں کو اچھی

تعلیم دلوانے کی کوشش کی بڑے نے تو اس کی زندگی ہی میں گرایجویشن کر لیا۔ مگر دو کی تعلیم مکمل نہ

ہو سکی۔ یکا یک باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑی خواہش تھی کہ لڑکے تعلیم پا کر خوش حال زندگی بسر

کریں۔ اسی خاطر زندگی بھر تنگی ترشی میں زندگی بسر کرتے رہے اور بچے جب اس قابل ہوئے تو دُنیا

سے سِدھار گئے۔

الکشن ہوئے تو تیرہ ممبروں کی اکثریت سے کانگریس کی حکومت بن گئی لیکن ہماری پارٹی

اب بھی غیر قانونی رہی۔ حویلی پرتاپ گیرجی کا نچلا حصہ عموماً جلسوں وغیرہ کے لیے لیا جاتا تھا چنانچہ

ایک دن مختلف ٹریڈ یونینوں کی جانب سے مخدوم کے خیر مقدم کے لیے میری صدارت میں جلسہ رکھا

گیا۔ چند ہی دن پہلے نلگنڈہ میں جو توڑ پھوڑ ہوئی اور روی نارائن ریڈی کو مارا پیٹا گیا تھا اس کے پیش

نظر یہ خیال ہوا کہ مخدوم کو رہا تو کر دیا گیا ہے مگر حکومت اور سرمایہ دار اب بھی ان کے دشمن ہیں۔

جلسہ دو بڑے دلانوں میں ہوا۔ پیچھے کی دیوار میں تین بڑے بند دروازے تھے ان کے پیچھے کیا تھا

معلوم نہیں۔ جلسے کے دوران یہ کھٹکا لگا رہا کہ پچھلے دروازوں سے نکل کر کوئی حملہ نہ کر بیٹھے۔ مڑ مڑ کر

دیکھتی رہی۔ ٹریڈ یونینوں کی طرف سے پچاسوں ہار پہنائے گئے۔ یہ تقریباً ان پڑھ غریب مزدور تھے

کتنا چاہتے تھے وہ اپنے کامریڈ کو۔ ہاں اسی سلسلے میں یاد آیا کہ الکشن کے دوران ایک بہت بڑے

جلسے کا یہ منظر کہ الکشن فنڈ کے لیے کچھ عورتوں نے اپنے چھلّے وغیرہ تک اُتار کر فنڈ میں دے دیے

تھے۔ پرتاپ گیرجی نے بھی اوپر سے ایک انگوٹھی بھجوائی تھی۔ مخدوم کو پہنائے گئے پھولوں کے ہار

ساڑھے چار ہزار میں ہراج ہوئے تھے۔ نلگنڈے میں تو سُنا گیارہ ہزار میں گئے تھے۔

ادھر شہزاد آپا کو ان کے دوسرے داماد پاکستان بُلا رہے تھے۔ وہ انتظار میں تھیں کہ حفیظ

وٹ جائے تو ان سے مشورہ کرلیں۔ مگر جوں جوں دن گذرتے گئے ان کے رہا ہونے کے آثار نظر
ئے۔ اخراجات کی تنگی بڑھ گئی تو پھر انھوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا شہر میں ابھی کوئی پارٹی کا
س نہیں تھا۔ آغا پورے کے کسی کامریڈ کے مکان میں میٹنگ رکھی گئی آئندہ کام کے بارے میں
روخوص کے لیے۔ مخدوم کا خیال تھا کہ جو بھی ہیں جتنے کچھ ہیں جتنا کچھ بن پڑے کرتے رہیں۔
میٹنگ میں عورتوں میں کام کرنے کی ذمہ داری انھوں نے مجھے دی۔ میں نے اپنی ناتجربہ کاری و
لیت کا عذر پیش کیا تو مخدوم نے یہ کہتے ہوئے کہ ''میں مدد کروں گا۔'' قصہ ختم کر دیا۔ کامریڈ ڈانگے
جگہ نئے سکریٹری اجے گھوش صاحب سے یہیں ملنا ہوا۔ اب جب کسی کے پاس جاتی تو عورتوں کی
ظیم کے تعلق سے ضرور بات کرتی۔ اس پر جواب ملتا کہ اس وقت کوئی ایسا کام بتائیں جس سے
چار پیسے مل سکیں۔ پولیس ایکشن کے بعد ان تین چار برسوں میں مسلمانوں کی مالی حالت بہت
اب ہو چکی تھی۔ دوسری طرف گرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ سوچا ایسا کیا کیا جائے کہ جو ان کو مالی امداد مل
ے۔ ان ملاقاتوں کے دوران ایک بڑی تیز ہوشیار خاتون سے ملاقات ہوئی وہ اردو پڑھی لکھی تھیں۔
ت چیت میں اچھے اچھوں کی خبر لے لیتیں ان کی باتیں ہماری چچی اماں کی طرح دل چسپ بھی
تیں۔ غالباً اسی سبب سے وہ اپنے قریبی گھروں کی خواتین اور لڑکیوں میں بے حد مقبول تھیں۔ نام تھا
نیر فاطمہ ایک دن باتوں باتوں میں' میں نے کہا؛ ضرورت مند خواتین کو کچھ دست کاری وغیرہ
ھانے کا انتظام ہو جائے۔ انھیں کچھ اُجرت ملے تو بہت اچھا کام ہوگا۔ انھوں نے فوراً کہا میرا گھر
ضر ہے۔ میں ایسی کئی ضرورت مند لڑکیوں اور عورتوں سے واقف ہوں ان کو اگر کام مل جاتا ہے تو
بھی آجائیں گی۔ ان صاحبہ نے دو چار دن بعد ہی کوئی آٹھ دس خواتین کو اپنے گھر اکٹھا کرلیا۔ مجھے
لاع دی کام کے سلسلے میں بات ہوئی۔ وہ کام کے لیے تیار تھیں مگر انھیں معمولی سینا پرونا بھی نہ آتا
۔ بڑا تعجب ہوا۔ میں نے بچپن سے سوائے شیروانی سب کچھ گھر میں سلتے دیکھا۔ خیر۔ وہ اے کلاس

کا آرائش بلدیہ کا گھر تھا سامنے کا دالان اس مقصد کے لیے مختص کر دیا گیا۔ طے پایا کہ دس سے دو

بجے تک میں وہاں آ کر کام سکھاؤں گی اور کچھ اردو پڑھنا لکھنا بھی۔ وہیں ایک کامریڈ سے ملاقات

ہوئی۔ جو پاس ہی میں شادی کر کے سسرال میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنی ساس سے

ملایا۔ بہت خوش مزاج ہنس مکھ مگران کے شوہر نیم پاگل ساس کا سلوک بھی اچھا نہ تھا۔ اب چار بچوں کی

ماں تھیں یہ صاحبہ۔ کچھ سینا وغیرہ جانتی تھیں غرض اس طرح ایک دو مہینوں میں کچھ لڑکیاں ایمبر اڈری اور

کچھ سینا پرونا سیکھ گئیں۔ کچھ رقم جمع کر کے دستیاں بنوائیں اور پٹی کوٹ سلوائے۔ رضیہ کے ذریعہ یہ

ساری چیزیں ویمنس کالج بھجوائیں چیزیں فروخت ہوگئیں مزید آرڈر بھی ملے۔ کام کرنے والیوں کو ملا

کر تیس چالیس کے لگ بھگ تعداد بن گئی۔ خاتونِ خانہ کی باتوں سے اب کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ انھوں

نے اس طرح کے کام کو شروع کرنے میں جو مدد کی اس میں اپنے فائدے کا بھی خیال رکھا تھا۔ ایک

دن انھوں نے کہا: ایسے تو کام چلے گا نہیں۔ میرے شوہر اچھی امداد دلوا سکتے ہیں میں اس کے لیے تیار

نہ ہوئی کیوں کہ اندازہ ہوا تھا کہ امداد میں امریکہ کا ہاتھ ہے۔ بہر حال وہ دل برداشتہ ہوگئیں۔ اور بار

بار یہ شکایت کہ میرے دو جوان لڑکے ہیں۔ یہاں جوان لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا

ہے۔ اس گفتگو کے بعد مجھے کسی دوسری جگہ کے بارے میں سوچنا پڑا۔ ان ہی دنوں میرا گیراج خالی

ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال سے یہاں ایک سیکنڈ ہینڈ کار اختر کی کھڑی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کا انجن بہت

اچھا ہے مگر وہ صرف ڈیڑھ دو ماہ چلی تھی۔ ہاں یہ کسی انڈر گراونڈ کامریڈ کے بیڈروم کے کام آتی رہی

تھی۔ گیراج میں بوریوں کے فرش پر کام ہونے لگا۔ عورتوں کی تنظیم کے سلسلے میں مخدوم کے وعدے

نے جو ہمت دلائی تھی وہ اپنی جگہ مگر اصل مدد تو کامریڈ اونکار پرشاد سے ملی۔ مخدوم تو الکشن کے سال،

ڈیڑھ سال بعد ہی چائنا اور رشیا وغیرہ کے دورے پر چلے گئے۔ اور وہاں غالباً ورلڈ ٹریڈ یونین کے

سکریٹری کی حیثیت سے دو ڈھائی سال یا تین ساڑھے تین سال باہر ہی رہے۔ ادھر انجمن کا نام

ممبر شپ کے قواعد، رسائد چھپوانا ان ساری چیزوں کا خرچ و سارا کام اونکار پرشاد صاحب نے کیا۔

''عوامی انجمن خواتین'' (Women's Democratic Association) ممبر شپ کی سالانہ فیس ایک روپیہ۔ اب جتنی بھی عورتیں کام کر رہی تھیں انکے ساتھ اوروں کو بھی ممبر بنالیا گیا اس طرح سو ڈیڑھ سو ممبروں کی تعداد ہوگئی۔

ایک واقعہ

ودیالنگار صاحب کی لڑکی شاردا جس سے بمبئی میں ذکیہ سے ملاقات ہوئی تھی اُن کی شوہر سے نہ بنی۔ آخرکار علاحدگی ہوگئی۔ وہ ماں باپ کے پاس چلی آئیں اور ریڈیو اسٹیشن پر کام کرنے لگیں۔ یوں ان کے گھر والوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ تب معلوم ہوا کہ اونکار پرشاد صاحب کو شاردا کے بھائی، بہنیں پاشا بھائی کہتی ہیں۔ یہاں مسلم گھرانوں میں تو ہر ایک میں کوئی پاشا اور نواب ہوتا ہے لیکن ایک برہمن خاندان میں پاشا بھائی؟ دکن کی متحدہ تہذیب کا ایک نمائندہ مظہر۔ ودیالنکار صاحب بہت خوش اخلاق اور اسکالر ٹائپ انسان تھے۔ یہاں ریڈیو پر اس زمانے میں بروا لطیف صاحب کام کر رہے تھے کچھ دنوں بعد شاردا اور بروا صاحب نے ہمیشہ ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

ان ہی دنوں دتی میں خواتین کی ایک کل ہند کانفرنس بلائی گئی یہ سوچنے اور طے کرنے کے لیے کہ پرانی ویمنس نیشنل کانگریس کے تحت آگے کام کیا جائے یا اپنی ایک اور نئی تنظیم تشکیل دی جائے ؟ تاتی وغیرہ اس وقت تک چھوٹ چکی تھیں۔ تین چار کالج کی لڑکیاں جملہ گیارہ بارہ افراد پر مشتمل ایک وفد کو لیے تاتی کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئی۔ ہندوستان بھر کی مختلف ریاستوں سے یہاں تین سو سے زیادہ خواتین اکٹھا ہوئی تھیں۔ دو دن کی اس کانفرنس میں متفقہ طور پر

یہ طے پایا کہ نئی تنظیم کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ واپسی میں مئی کی تپتی دھوپ میں تاج محل کی سرسری سیر کی۔ دلّی سے واپسی پر یہاں کوآپریٹیو محکمہ کی ہماری ایک ہمدرد خاتون یامنی دیوی ہم سے ملنے آئیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ عورتوں کی کوآپریٹیو بنائی جائے۔ شیرز سے بھی رقم جمع ہو سکے گی اور سرکار سے قرض وامداد بھی مل سکتی ہے۔ ان کی اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ جن لوگوں سے چندے کے بطور رقم ملی تھی دس روپے پورے کروا کے انھیں شیر ہولڈر قرار دیا گیا۔ اس طرح ایک سوسائٹی "حیدرآباد ویمنس انڈسٹریل کوآپریٹیو سوسائٹی" کے نام سے رجسٹرڈ کروائی گئی۔ اور اس کے شیر ہولڈرس بنانے کی مہم شروع ہوگئی۔ رضیہ نے کالج کی کئی لکچررس کو شیر ہولڈر بنایا۔ یامنی دیوی نے اپنی سیونگ مشین مستعار دی۔ اس وقت کوئی بیس بائیس شیر ہولڈر اور کُل سرمایہ دو سو سے کچھ زیادہ۔

(1954)

دلّی میں جس نئی تنظیم کا فیصلہ کیا گیا تھا اب اس کا نام قواعد وضوابط مرتب کرنے کے لیے کلکتہ میں کل ہند کانفرنس رکھی گئی اس کانفرنس میں مختلف جگہوں سے سات سو سے زیادہ نمائندے شریک رہے۔ کلکتہ کے ودیا ساگر ہاسٹل میں سب کے قیام وطعام کا انتظام کیا گیا تھا چار دن کی اس کانفرنس میں بحث ومباحثہ کے بعد اس کا نام "انڈین نیشنل ویمنس فیڈریشن" تجویز ہوا۔ اغراض و مقاصد مرتب کیے گئے طے پایا کہ کم از کم سو عورتوں پر مشتمل۔ جو بھی تنظیم فیڈریشن کے اغراض و مقاصد سے متفق ہو پانچ روپے سالانہ دے کر الحاق لے سکتی ہے۔ کانفرنس کی کل ہند میٹنگ دو سال میں ایک بار ہوا کرے گی۔ کونسل میٹنگ ہر سال اور ورکنگ کمیٹی ہر چھ مہینے میں مختلف جگہوں پر ہوگی۔ کلکتہ کی ایک بہت پرانی سوشیل ورکر کو صدر چنا گیا۔ جنرل سکریٹری پارلیمنٹ ممبر رینو چکرورتی کو بنایا گیا۔ پینتیس ارکان پر مشتمل ورکنگ کمیٹی جن میں 'میں' بھی شامل تھی فیڈریشن سے اسی وقت

ق لے لیا تھا۔

پارٹی کے تقریباً سب ہی گرفتار شدہ لوگ رہا ہو چکے تھے۔ میرے بھائیوں کو گرفتار ہوئے ڈیڑھ سال ہو رہا تھا انور نے دلّی سپریم کورٹ میں اپیل کی کہ ہم پر کوئی مقدمہ چلایا گیا اور نہ ہی کوئی جرم ثابت ہوا ہے۔ اور یوں ہی ڈیڑھ سال سے ہم قید جھیل رہے ہیں۔ خط سے ہمیں اطلاع ملی کہ کس وقت یہ لوگ ناسپلی اسٹیشن پہنچیں گے۔ یہاں تین گھنٹے رکنا ہوگا۔ دہلی کی گاڑی پکڑنے کے لیے میں اور امی اسٹیشن پہنچے۔ ویٹنگ روم کے سامنے پولیس بیٹھی ہوئی یہاں بھی ڈانٹنے ڈپٹنے پر جانے دیا گیا اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کھانے کے لیے قریبی ہوٹل عزیزیہ چلے۔ اس حالت میں کہ پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھ کر واپس ہوئے۔ دلّی سپریم کورٹ نے سماعت کے بعد ان دونوں کو بے قصور بتا کر چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پارٹی آفس گئے اور ان لوگوں کے تعاون سے پورے ڈیڑھ سال بعد گھر لوٹے.......... اب پارٹی کا دفتر حمایت نگر میں لے لیا گیا تھا جو ایم ایل اے کوارٹرز کے قریب تھا۔

کچھ پیام کے بارے میں

(1949) کا ذکر ہے کہ اختر اسی سال جیل سے چھوٹے پھر اخبار پیام نکلنا شروع کر دیا چار ماہ سے بند پڑا تھا۔ ادھر شاہینہ کی بیماری کا سلسلہ جاری تھا۔ اور فنڈ بالکل نہیں لیکن انھوں نے اپنے ارادے اور کچھ ساتھیوں کی مدد سے (جن میں اونکار پرشاد قابل ذکر ہیں) کسی نہ کسی طرح پیام کی اشاعت شروع کر دی۔ وہ تین چار ماہ تو میرے ساتھ ہی رہے پھر قریب ہی کرائے کے ایک منزلہ گھر میں منتقل ہو گئے۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ایک صاحب کورکھا کامریڈ مہدی غالباً اسٹیج کے ایڈیٹر تھے جو بمبئی سے بلائے گئے تھے۔ یوں تو اخبار چلتا رہا لیکن آمدنی کم اور خرچ

زیادہ۔ اُس وقت تو خیال نہ آیا مگر اب سوچتی ہوں۔ بہت سے گھریلو اخراجات کو کم کیا جا سکتا تھا ....! ریاست اور ان کی بہنوں میں اچھی صورتوں کو پسند کرنے کا رجحان تھا۔ پتہ نہیں کیسے ریاست ایک ایرانی خاتون سے متعارف ہو گئیں یہ صاحبہ جنگ کے دوران آندھرا کے کسی سپاہی سے شادی کر کے یہاں آ گئی تھیں۔ بقول ان کے کچھ دنوں بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اب ان کی ایک پانچ سالہ لڑکی اور ایک نو دس سالہ لڑکی جو بقول ان کے بھائی کی تھی۔ کافی پریشان حال تھیں۔ عرشی کی عمر اس وقت سال کی رہی ہو گی۔ ریاست نے اس خاتون کو اسی کی آیا کے طور پر رکھ لیا۔ ان تین افراد کا خرچا اور ان کی ماہ وار تنخواہ۔ پھر ان ہی دنوں انھوں نے عربی سے بی۔ اے کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے لیے ماسٹر چاہیے گانا سیکھنے کا بھی انھیں بہت شوق تھا اس کے لیے بھی ایک ماسٹر الگ اور گھر کے کام کے لیے دو نوکر لازمی طور پر تھے۔ کبھی کبھی تو تین...... اختر کی ضروریات بہت ہی کم۔ صرف کُرتے پائجامے میں رہا کرتے تھے باہر جاتے تو ویسٹ کوٹ پہن لیتے۔ سگریٹ کے علاوہ کوئی اور عادت نہ تھی۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ کسی مقصد کے لیے کوئی کام کیا جاتا ہے تو بہت ساری قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ لیکن گھریلو اخراجات میں کمی کرنا شاید ان کے بس کی بات نہ تھی چناں چہ نوبت یہاں تک آ پہنچا کہ اخبار کا نکلنا مشکل لگنے لگا۔ میرے اور رابعہ کے بیچ کا مکان خالی ہو چکا تھا وہ یہاں منتقل ہو گئے۔ اخبار چار ماہ بند رہا تھا۔ سرمائے کی کمی اور پارٹی پالیسی اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بنی رہی۔ قرض کا بوجھ بڑھنے لگا۔ ان پر اپنے ہی کسی عزیز کا تین ہزار قرض تھا۔ کسی معمولی سے اختلاف کی بنا پر ان کے اس عزیز نے اپنا قرض ادا کرنے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ مجھے انشورنس کی جو رقم ملی تھی اس میں سے میں نے جاوید کو ۲۰۰۰ روپے دے دیے تھے۔ اس کے سینئر کیمرج ہونے پر موٹر سیکل کے لیے۔ ان دنوں شاید بچوں کے بنک کھاتے نہیں ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا وہ رقم اس نے میرے ہی پاس امانت رکھوا دی دو ہزار ابتداء میں خرچ ہو چکے تھے۔ پھر بھی

چھ ہزار جمع تھے۔ ان میں سے تین ہزار نکلوا کر اختر کو دے دیے۔ مگر صرف پانچ چھ ماہ کے اندر اخبار کی اہم مختلف ضرورتوں کے تحت یہ رقم بھی خرچ ہوگئی۔ ان دنوں حکومت کے پرانے ساتھی اخبار کی کچھ نہ کچھ مدد کرتے رہتے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ دو ہزار روپے نقد کی ضرورت آن پڑی۔ این۔ ایل۔ گپتا صاحب اور ایسے کئی دوسروں پر مشتمل، ایک میٹنگ ہوئی۔ ان سب نے دو ہفتے کے اندر رقم فراہم کردینے کا وعدہ کیا۔ رقم کی اس وقت فوری ضرورت تھی اگر کوئی قرض دے سکے تو اچھا ہوتا۔ ایسا فوری قرض دینے والا کوئی نہ تھا۔ مجبوراً سب کی یقین دہانی پر جاوید کی جمع شدہ رقم دو ہزار روپے میں نے دیے اس یقین کے ساتھ کہ دو ہفتوں بعد مل جائیں گے۔ یہ دو ہفتے آج تک بھی ختم نہیں ہوئے۔ ادھر جاوید اب سائیکل پر اسکول جا رہا تھا۔ یہ سیکل ایک رات چوری ہوگئی۔ دوسری سیکل خریدنا ضروری ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ جاوید کو اسکول جانے آنے میں بڑی دِقت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک دن مجھے بتایا کہ مسلم ضیائی صاحب پاکستان جا رہے ہیں۔ ان کی سیکل بہت اچھی ہے وہ بیچنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے میرے لیے خرید لیں۔ دو سو روپیوں کی ضرورت تھی۔ میرے اکاونٹ میں پیسے نہیں تھے۔ جاوید کے متواتر تقاضے کے باوجود میں اسے روپے نہ دے سکی اس نے کہا لگتا ہے آپ نے سارے پیسے خرچ کر لیے ہیں۔ خیر اب جو میرے پیسے جمع ہیں ان میں سے دے دیجیے۔ میں اس کو کیا جواب دیتی بس ایک ناقابلِ بیان تکلیف دہ شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ بہر حال کوئی چارۂ کار نہ تھا وہ بھی ناامید ہو کر چپ ہوگیا۔ مجھے یہ احساس کہ شروع ہی سے میں اس کا خیال کما حقہٗ نہ رکھ سکی۔

ان ہی دنوں کونسل میٹنگ میں شرکت کے لیے دِلّی جانا ہوا۔ ایک مدت کے بعد ابّا بھی موہان گئے۔ جاوید کو شوق ہوا وہ ان کے ساتھ ہولیا۔ وہاں سے وہ دِلّی آیا اور پھر میرے ساتھ ہاپوڑ اور میرٹھ اپنی پھوپھی کے پاس گیا۔ ہاپوڑ میں اس کے والد اور تایا کی کچھ زمینیں تھیں وہاں موجود اس

کے پھوپھی زاد اس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ وہ مسلسل لکھ رہے تھے کہ لڑکے بڑے ہو گئے ہیں اور اُن زمینوں پر قبضہ کرنے پر مُصر ہیں۔ جاوید میاں یہاں آکر کچھ تصفیہ کرلیں تو بہتر ہوگا۔ زمین وغیرہ کے بارے میں جو بات ہوئی تھی وہ میں نے جاوید کو بتادی۔ اور یہ بھی کہا کہ بیس پچیس سال سے وہ لوگ اس زمین پر محنت کر رہے ہیں سوچا جائے تو اس زمین پر ان ہی کا حق ہوتا ہے۔ مجھے تو کچھ چاہیے نہیں تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ جاوید کو بھی میری بات ٹھیک لگی لکھ دیا جیسے چل رہا ہے چلنے دیجیے۔ مجھے گھر یا زمین سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور یوں یہ قصہ ختم ہو گیا اب اسکول کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ بچپن سے گھوڑ سواری کا شوق تھا۔ ابّی' امّی کے ساتھ گاؤں میں پٹیل پٹواریوں کے گھوڑوں پر تین برس کی عمر سے سواری کرتا رہا ہے اور اب اسی شوق کی تکمیل کے لیے پولو کلب میں شریک ہو گیا۔ اس کلب میں گھوڑ سواری اور پولو سکھانے کی فیس ماہانہ تیس روپے لی جاتی تھی۔ جہاں اب وجے نگر کالونی ہے وہاں صاف اور بڑا کھلا میدان تھا۔ اور اسی میں گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔ اور پولو بھی کھیلا جاتا۔ کچھ دنوں بعد پولو بھی کھیلنے لگ گیا اور کچھ انعام بھی حاصل کیے۔ جاوید کو موٹر ڈرائیونگ اور فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا۔ لہٰذا سمجھا بجھا کر علاؤالدین ٹکنیکل کالج میں شریک کروادیا۔ ایک سالہ کورس تھا وہ اس نے سکنڈ کلاس کامیاب کرلیا۔ فوٹو گرافی کا شوق تھا کیمرہ ہر وقت گلے میں لٹکائے رکھتا فلم خود ہی دھوتا او پرنٹ نکال لیتا۔ ان ہی دنوں حسرت چاچا کے چھوٹے بھائی جن کی شادی موہان کے قریب کسی پیسے والی حسین لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان کی ایک لڑکی یہاں اپنی پھوپھی سے ملنے آئی تھی۔ آمنہ نام تھا۔ اچھی شکل و صورت کوئی پندرہ سال کی کچھ دنوں ہمارے ہاں بھی آکر رہی۔ پڑھی لکھی بالکل نہ تھی۔ مگر کافی تیز طرار اور اپنی صورت پر کسی قدرے نازاں بھی لگتی تھی۔ ہمارے جاوید صاحب اس پر ریجھ گئے۔ میں نے سمجھایا پندرہ سولہ سال کی عمر میں لڑکیوں کی شادی بھی نہیں کی جانی چاہیے۔ تم تو بہت چھوٹے ہو پڑھ کر کچھ کرنے لگو گے تب شادی کی سوچنا۔

دوسری بات یہ کہ لڑکی بالکل ان پڑھ ہے اور کچھ مغرور بھی اور نتو پھوپھی (نسیمہ بیگم حسرت چچا کی سگی بہن) بھی اس رشتے پر راضی نہ ہوں گی تو بات کچھ ان کی سمجھ میں آئی۔ اور اب وہ گھوڑ سواری اور پولو میں زیادہ وقت لگانے لگے۔ اس کلب کے کرتا دھرتا کوئی محمود علی بیگ صاحب اعظم جاہ کے سکریٹری تھے ان کے ایک لڑکا اور لڑکی محمود بیگ خود پڑھے لکھے نہ تھے مگر چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا اچھی تعلیم حاصل کرے۔ لڑکا جاوید سے کچھ چھوٹا ہی تھا اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ ڈرامے وغیرہ کرنے سے دل چسپی تھی۔ اب وہ جاوید کے ساتھ ہمارے ہاں آنے لگا تھا۔ قادر علی بیگ نام تھا۔ ایک ڈرامہ اس نے "بابا کالے شاہ" کے نام سے ہمارے ہاں ہی کیا تھا جس کے دو تین فوٹو میرے پاس رہ گئے ہیں۔

سُرور نگر میں اعظم جاہ صاحب کی بہت بڑی کوٹھی اور زمین وغیرہ تھی۔ وہاں ریس کے گھوڑوں کی تربیت' ڈیری فارم اور پولٹری فارم وغیرہ قائم کرنے کے منصوبے بنائے گئے تو ان اسکیمات کا انچارج محمود علی صاحب کو بنایا گیا تھا۔ ان صاحب کو حساب کتاب کے لیے ایک ایمان دار آدمی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے جاوید سے کہا کہ تم روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آ کر حساب کتاب دیکھ لیا کرو۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملیں گے۔ وہ تیار ہو گیا۔ اُن ہی دنوں اس نے نہ جانے کس طرح موٹر بائیک بھی خرید لی بات تو دو گھنٹے کی ہوئی تھی مگر کچھ ہی دنوں میں وہاں ان کی اتنی خاطر داری ہونے لگی کہ زیادہ وقت وہیں گذرنے لگا۔ گھر کے ایک رکن کی طرح ماں بیوی بیٹی سب کا پردہ ختم۔ بیٹی کی شادی چند ماہ قبل پیسے کے زور پر کسی اونچے گھرانے میں کر دی تھی۔ چند دنوں بعد ہی وہ ماں کے گھر لوٹ آئی۔ بیٹے سے محمود علی صاحب کچھ خوش نہ تھے۔ عملے کی تنخواہیں سب جاوید میاں سے دلوائی جانے لگیں۔ جاوید میاں بہت خوش کہ مجھ پر اس قدر اعتماد کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ گھوڑوں کے چارے وغیرہ کا انتظام بھی جاوید میاں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس میں کمیشن اچھا مل جاتا تھا۔ یہاں کام شروع کرنے سے پہلے اس نے ایک سالہ بیسک ٹیچر (Basic Training) کورس بھی کر لیا

ویمن کوآپریٹو سوسائٹی کی جانب سے ڈرامہ شکنتلا کی پیشکش

قادر علی بیگ کی ہدایت میں ڈرامہ بابا کالے شاہ پیش کیا گیا

ویمن کوآپریٹو سوسائٹی کی لڑکیوں کے ساتھ جمال النساء

C2 Park Road Colony Park Road Lucknow

14.3.83

تھا۔ جس میں یہ شرط تھی کہ جب بھی کبھی ضرورت ہوگی نوکری کے لیے طلب کرلیا جائے گا۔ وہ موقعہ آگیا نوکری کے لیے بلاوا آگیا بڑے شش و پنج میں کہ کیا کیا جائے۔ میں نے مشورہ دیا کہ نوکری کرلینا زیادہ بہتر ہوگا۔ محمود علی صاحب نے یہی کہا کہ آدھے دن کا اسکول ہے کرلو۔ دوپہر کے بعد یہاں آسکتے ہو۔ تو اس نے نوکری کرلی۔ اسکول میں پڑھائی وغیرہ برائے نام بس تنخواہ برابر ملتی رہی۔...... جاوید اکثر راتوں میں بہت دیر سے آنے لگا تھا۔ محمود علی صاحب کے شراب نوشی کے قصے سناتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ حال کہ جاوید کی طبیعت جب بھی ذرا خراب ہوجاتی تو ماں، بیوی، بیٹی سب ڈھیر سارے میوے لے کر جاوید کو دیکھنے چلے آجاتے۔ جاوید نے لڑکی اور لڑکے دونوں کی شادیوں میں مجھے بھی شرکت پر اصرار کیا تھا۔ اور شادی میں تحفے دلوائے تھے۔ محمود علی بیگ صاحب کی دعوت بھی کی تھی جس میں مخدوم بھی شریک رہے۔ مخدوم کا یہ انداز کہ وہ کسی طرح کے بھی شخص سے ملتے کچھ اس طرح کہ اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ جاوید نے دونوں کے مخصوص شغل کا بھی انتظام بطور خاص کیا تھا۔

ہمارے رہن سہن کا طریقہ انھیں شاید اپنے سے اونچا لگا ہو ان لوگوں کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے مجھے تو لگا کہ ان کی جو لڑکی ہے اس کے لیے انھوں نے شاید جاوید کو مناسب سمجھا ہے۔ شوہر سے علحدگی ہوگئی تو........... جاوید بھی اس بات کو کچھ سمجھ رہا تھا ایک دفعہ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ اگر اس لڑکی سے شادی کرلوں تو......؟ میں نے کہا تمھاری مرضی۔ مگر..... پھر خود ہی کہنے لگا کہ کہیں ایسی بات نہ ہو کہ وہ سمجھنے لگیں کہ میں، ان کی دولت کی خاطر شادی کرنے پر مائل ہوں۔ غرض ہماری طرف سے کوئی اقدام نہ ہوا۔ ادھر اتفاق یوں ہوا کہ صاحب زادی کی ساس انتقال کرگئیں۔ چوں کہ قطع تعلق تو ہوا نہ تھا باپ نے لڑکی کو سسرال جانے پر مجبور کیا۔ اصل جھگڑا ساس کی ہی وجہ سے تھا کیوں کہ وہ بہت تیز مزاج اور حکم چلانے کی عادی تھیں۔ اب ان کی عدم موجودگی میں شوہر کے

ساتھ رہنا اتنا مشکل نہیں رہ گیا تھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ جاوید کو آمدنی خاصی ہو رہی تھی۔ جسے وہ محمود علی صاحب کے پاس جمع کروانے لگے۔ میں نے ایک دو مرتبہ کہا رقم بنک میں رکھا کرو۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ ان کے کہنے کے مطابق کوئی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم جمع ہو گئی تھی۔ یکا یک اعظم جاہ صاحب نے کسی اور کو اپنا سکریٹری بنالیا۔ حالات بدل گئے۔ تنخواہوں کا ملنا بھی رک گیا تھا۔ ایسے میں جاوید نے محمود علی صاحب سے رقم کا مطالبہ کیا تو چند دنوں ٹالتے رہے پھر کہنے لگے میرے پاس کچھ نہیں ہے سب کچھ نئے سکریٹری کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تو کہیے کہ بیرسٹر عطاالرحمٰن صاحب کی توجہ ہوئی تو سال بھر میں صرف پندرہ ہزار روپے بقیہ ماہوار کے وصول ہوئے۔ کسی نے سچ کہا ہے مصیبتیں آتی ہیں تو ایک ساتھ۔ جاوید کا تبادلہ کسی دوسرے اسکول پر ہو گیا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر صاحب سے کچھ ان بن ہو گئی۔ غرض ذہنی جھٹکوں کے سبب انھیں پینے کی لت لگ گئی۔ آمدنی تو اب کچھ خاص نہیں رہی تھی۔ بس ٹیچری کی تنخواہ مل جاتی تھی۔ تو ستا ٹھرا وغیرہ پینے لگے۔ جب خوب کمانے لگا تھا تب بھی میں نے اس سے کچھ لیا نہیں تھا اور اب تو کچھ سوال نہ تھا۔ اسی دوران ستار بجانے کا شوق ہوا تو کسی مٹھ میں جا کر صبح صبح ستار بجانے کی مشق کیا کرتا تھا بہر حال ان دنوں ساری باتوں کا شوق ختم۔ میں نے شادی کے لیے دو تین لڑکیوں کی نشان دہی کی مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ سارا دن اسکول میں گذر جاتا اور شام ہوتے ہی پھر وہی پینے کا مشغلہ آدمی پی کر چپ چاپ سو جائے تو ٹھیک مگر یہاں وہ بھی نہیں چیخ پکار، ہنگامہ گالی گلوج، توڑ پھوڑ گھر میں ہر ایک کے حق میں عذاب ہو گئے۔......

ہندوستانی خواتین کا وفد ماسکو و تاشقند میں

بیرونی سفر

ہمارے پاس کام سیکھنے والوں کی تعداد جوں جوں بڑھنے لگی تھی جگہ کی بھی بہت تنگی ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اپنی چوڑیاں بنک میں رہن رکھ کر تھوڑی رقم فراہم کرلی اور اوپری حصے میں ہال جیسا تھا اس پر دیواریں اٹھی ہوئی تھیں چھت ڈلوادی۔ باہر آنے کا زینہ بنانے کے لیے جو ایک کمرے کی جگہ اوپر کی چھت پڑی تو اس کے بیچ میں چھت ڈال کر ایک کمرہ بنالیا۔ زینہ، رضیہ کے کمرے کے بازو سے۔ ہال کوئی چوبیس پچیس فیٹ لمبا اور چودہ فیٹ چوڑا تھا اس میں جماعتیں منتقل کردیں اور ہال کے بازو چھوٹے سے کمرے میں خود رہنے لگی۔ زینے کا دروازہ ہال میں کھلتا تھا نیچے سڑک سے لگا ایک پھاٹک۔ ہفتے میں دو تین دن پڑھائی اور تین دن دست کاری سکھانے کے لیے ہوتے۔ بھائیوں کی معرفت ایک کامریڈ عبدالرزاق صاحب سے تعارف ہوا۔ ورنگل کے رہنے والے تلگو بہت اچھی جانتے تھے انھیں تلگو پڑھانے کے لیے مقرر کرلیا۔ کوآپریٹیو کی صدر ان دنوں ویمنس کالج کی ایک لکچرار گروانی تھیں اور میں سکریٹری۔ ٹننگ کے آرڈرز زیادہ تر میں پورے کرتی کیوں کہ کوئی بھی یہ کام ٹھیک نہ کرسکتی تھیں۔ (1955) ایک دن فیڈریشن کی طرف سے ہاجرہ آپا کا خط ملا۔ لکھا تھا ورلڈ ویمنس ڈیماکریٹک فیڈریشن کی عالمی کانفرنس لوزان میں ہونے والی ہے۔ آندھرا میں ہماری ملحقہ تنظیم تو بس ایک تمھاری ہی ہے۔ وہاں سے ایک نمائندہ ضرور ہونا چاہیے۔ یہاں ممبرس کی میٹنگ کانفرنس کے نمائندہ چناؤ کے لیے رکھی گئی۔ کوئی پانچ سو سے اوپر عورتیں جمع ہوئی تھیں۔ اس میٹنگ میں متفقہ طور پر مجھے نمائندہ کے لئے چُنا گیا۔ اتنی بڑی میٹنگ کے لیے جگہ کیسے فراہم ہوئی؟ یوں ہوا کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک نواب صاحب نے تاج محل ٹاکیز بنوائی تھی چندہ وغیرہ کے سلسلے میں میں اُن سے مل چکی تھی۔ ٹاکیز میں بہت بڑا ہال تھا۔ میں نے ان سے مل کر دو تین گھنٹوں کے لیے

میٹنگ کے لئے ہال کی اجازت مانگی انھوں نے اجازت دے دی۔ ایک مشکل حل ہوگئی۔ سوال اب اخراجات کا تھا۔ کچھ قرض لے لیا۔ پاسپورٹ اختر نے کوشش کر کے بنوادیا۔ ہاجرہ آپا کے اندازہ کے مطابق بابرلنگ بھگ ایک ماہ کا قیام رہے گا۔ یہاں ایک اچھی ورکر کو ذمہ داریاں دے دیں عبدالرزاق صاحب تو تھے ہی۔ رضیہ کو قائم مقام سکریٹری بنا کر بے فکر ہوگئی۔ (30-06-1955) کو حیدرآباد سے روانہ ہو کر دلی پہنچی۔ دو دن ہاجرہ آپا کے ہاں قیام رہا۔ کوئی چالیس پینتالیس خواتین پر مشتمل وفد تھا۔ ساری مندوبین دلی میں اکٹھا ہوگئی تھیں وہاں سے چارٹرڈ طیارے کے ذریعہ جنیوا پہنچے۔ ایرپورٹ پر لوزان جانے والی بس تیار تھی۔ موسم بہت خوش گوار تھا سڑک کے دونوں جانب نہر' سبزہ' پھول اور جھاڑیاں اک دل کش وشاداب منظر۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں ہم لوزان پہنچ گئے۔ ہمارے گروپ کو تین ہوٹلوں میں ٹھیرایا گیا۔ میرا کمرا ہاجرہ آپا کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ نیچے سبز رنگ کے پانی کی جھیل میں سفید راج ہنس تیرتے ہوئے اس کے آگے اونچے اونچے سبزے سے ڈھکے پہاڑ تقریباً ساڑھے چار بجے صبح ہوجاتی۔ سامنے کا منظر اس قدر حسین تھا کہ جی کرتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان پہاڑوں میں گھومنے نکل جاؤں۔ بہر حال کانفرنس کا وقت آنے لگا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہونا تھا ناشتہ کیا اور جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ کانفرنس ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا بہت بڑا ہال جس کی چھت شیشے کی تھی ساٹھ پینسٹھ مختلف ملکوں سے آئی ہوئی ایک ہزار کے لگ بھگ خواتین۔ مقامی زبان کے علاوہ عربی' انگریزی اور فرانسیسی میں تقریروں کے ترجے کا خاصہ بندوبست تھا۔ یہ کانفرنس چار دن چلتی رہی۔ میٹنگیں' اہم مسائل پر تقریریں' بحث ومباحثہ سب کچھ اور شام کے اوقات میں کلچرل پروگراموں کا انعقاد ہوتا رہا۔ دوپہر کا کھانا' چائے وغیرہ سارا اہتمام وہیں پر تھا۔ ان ہی اوقات میں ایک دوسرے سے ملنے سمجھنے' بات چیت کرنے کا موقعہ ملتا اور چھوٹے موٹے تحائف کا آپس میں تبادلہ ہوتا رہا۔ کتنے ہی اخباروں کے رپورٹرس نہایت مستعد نظر آئے۔ قیام گاہ پر واپس لے جانے کے لیے بسوں کا

معقول انتظام آخری دن بہت طویل کلچرل پروگرام ہوا۔ کوئی ڈیڑھ دو بجے رات تک چلتا رہا۔ واپسی کے وقت ہجوم میں نہ جانے کیسے میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہوگئی اپنی دانست میں جس بس کا نمبر یاد رہا اس میں بیٹھ گئی اس بس میں بہت ساڑی پوش خواتین نظر آئیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی میری شناسا نہیں۔ میں بس میں بیٹھی کسی سے کچھ پوچھا نہیں ایک جگہ سب اُترنے لگیں۔ پھر دوسرے مقام پر چند اور اس طرح مختلف لوگ مختلف جگہوں پر اُترتے گئے میں تقریباً اکیلی رہ گئی ڈرائیور نے کہا یہ بس اب آگے نہیں جائے گی۔ مجھے اُترنا ہوگا۔ ایک اکیلا مسافر جو رہ گیا تھا وہ بھی اُتر گیا۔ اب کیا کروں؟ اس دوسرے آدمی نے اشاروں میں پوچھا کہ جانا کہاں ہے غنیمت ہے کہ مجھے ہوٹل کا نام یاد تھا بتا دیا۔ اور اشاروں سے ٹیکسی کے لیے کہا وہ فوراً جا کر ٹیکسی لے آیا۔ وہ تو ساتھ بھی چلنے کو تیار ہوگیا مگر اس کی ہمت نہ ہوئی ایک لفظ "مرسی" شکریہ کہنا سیکھ لیا تھا۔ مرسی کہہ کر شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ہوٹل پہنچے پر پتہ چلا کہ قیام گاہ سے کافی دور نکل گئی تھی۔ اس لیے کرایہ بھی بہت ہوگیا۔ رات بہت ہو چکی تھی کسی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ کمرے میں جا کر سو گئی۔ لوزان بہت صاف ستھرا سرسبز و شاداب پہاڑیوں سے گھرا نہایت خوب صورت شہر ہے۔ یورپ کا کشمیر قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھوں کی کاری گری سے آراستہ بڑی بڑی کئی منزلیں عمارتیں چمن زار ہر طرف پھولوں سے بھرے گملے گھروں بالکونیوں پر لٹکتے جھولتے۔ پھول ہی پھول نہروں میں کچھ بے فکرے لوگ چھڑیاں ڈالے مچھلیوں کے انتظار میں۔ ایک عجیب سا خواب ناک ماحول یہ لمحات ناقابل فراموش حیات کا حصہ بن گئے۔

کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی کتنے ملکوں کے وفود نے ہماری مندوبین میں سے کچھ کچھ افراد کو اپنے پاس مدعو کیا تھا۔ روس نے چودہ افراد کو دعوت دی تھی۔ ایک رات ہم ایک جگہ اکٹھا ہوگئے یہ طے کرنے کے لیے کون کہاں جائے گا۔ ان میں بنگالی خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ چار پانچ بنگالی، دو تین اتر پردیش کے دو کیرالا کی ایک آندھرا پردیش کی جو میں تھی۔ غرض روس جانے کے

لیے چودہ ارکان پر مشتمل وفد کو چنا گیا۔ آندھرا سے صرف میں ہی تھی۔ لہٰذا چھنٹنے کا سوال ہی نہ تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر لوزان سے بذریعہ ٹرین دو تین گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم ایک مقام پر اترے وہاں رات تک رہنا پڑا۔ اس مقام کا کیا نام تھا یاد نہیں۔ شام آٹھ بجے ہوائی جہاز سے پراگ پہنچے۔ رات وہاں ایک ہوٹل میں گذاری۔ دوسرے دن صبح سے ٹرین کا طویل سفر شروع ہوا۔ ٹرین بہت عمدہ صاف ستھری۔ دو دو' چار چار نشستوں کے کمپارٹمنٹ سرحد پر ویزا وغیرہ کی چیکنگ میں کئی گھنٹے لگ گئے وہاں سے دوسری ٹرین میں سوار ہوئے۔ یہ ٹرین بھی بڑی آرام دہ تھی۔ اس میں چار چار بستروں کے کمپارٹمنٹ تھے۔ سامنے کھڑکیوں سے لگی فولڈ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں ان ہی کرسیوں پر بیٹھی باہر کے مناظر دیکھتی رہی۔ راستے میں بڑے اسٹیشنوں پر جب ٹرین رکتی کئی عورتوں' بچوں کا مجمع خیر مقدم کے لیے کھڑا موجود نظر آتا۔ ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لیے امن کے نعرے لگاتے ہوئے۔ غالباً کیفے پر تازہ چیزیز سے بھری باسکٹ بھی پیش کی گیئں یہ بڑا لمبا سفر تھا دو دن بعد ہم ماسکو پہنچے۔ یہاں بھی ہمارا بہت شاندار استقبال ہوا۔ ہمیں بہت بڑے عمدہ چوبیس منزلہ ہوٹل میں ٹھیرایا گیا۔ ہر کمرے میں زیادہ تر دو دو کے ٹھیرنے کا انتظام تھا۔ مجھے بھی ایک ڈبل بیڈروم ملا۔ کسی ایک صاحبہ کو ایک کا۔ وہ اکیلی رہنا نہیں چاہتی تھیں میں نے اپنا کمرہ انھیں دے کر وہ جگہ ان سے لے لی۔ اس شام صرف ماسکو یونیورسٹی سرسری طور پر دکھائی گئی۔ اور شہر میں خوب گھمایا گیا۔

دوسرے دن لینن اور اسٹالن کی آرام گاہوں پر چادر گل چڑھانے گئے وہاں لوگوں کا میلہ لگا تھا دور دور سے لوگ آئے بڑے صبر سے کھڑے رہتے ہم بیرونی مہمان تھے سبھوں نے ہمیں پہلے جانے کے لیے راستہ دیا ہمارے ساتھ اور بھی کئی ملکوں کی خواتین تھیں۔ ان میں چھ سات عراقی خواتین' ایک مصری اور ایک جاپانی یہ ہمارے ساتھ ہی قیام پذیر تھیں یہ سب ہی یورپین لباس میں تھیں

سوائے جاپانی ڈاکٹر خاتون کے جو اپنے قومی لباس ''کیمونو'' میں ملبوس تھیں۔ عراقی عورتیں بہت خوب صورت۔ ان میں ایک خاتون برقعہ پوش بھی تھیں ہم نے کریملن کا میوزیم بھی دیکھا۔ جس میں زار اور زارینہ کی سواریوں کی گاڑیاں خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ اس زمانے کے اور بھی نوادرات عمدگی سے ترتیب دیے ہوئے تھے۔ کریملن سے واپسی پر یکایک میرے گھٹنوں میں شدید درد اٹھا ایک ایک قدم مشکل ہوگیا۔ کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے تک راستہ طے کرلیا۔ جاپانی ڈاکٹر جس کا کمرا میرا کمرے کے سامنے ہی تھا اس نے میری کیفیت کو محسوس کیا، سمجھا۔ اتوار کا دن تھا ڈاکٹر کا ملنا مشکل تھا چناں چہ خود اسی نے انٹر پریٹر سے بات کی اور مجھے انجکشن لگایا۔ اور گرم پانی کی تھیلی سے سینکنے کو کہا۔ رات بہت تکلیف سے گذری۔ صبح ڈاکٹر آیا۔ زبان سے ناواقف کسی طرح ترجمان کے ذریعہ اپنی کیفیت کا اظہار کر پائی۔ اس نے کہا ٹھیک علاج تو ایکس رے کے بعد ہوگا۔ کم از کم پندرہ دن رہنا پڑے گا۔ ہم سے پہلے ہی پوچھ لیا گیا تھا کہ ماسکو کے دس روزہ قیام کے دوران ہم کیا کیا دیکھنا اور کہاں کہاں جانا پسند کریں گے۔ اکثریت کی رائے ماسکو کے علاوہ لینن گراڈ اور ازبکستان کے حق میں تھی۔ ٹائم ٹیبل کے لحاظ سے دوسرے دن رات لینن گراڈ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ تو میں نے کہا اتنے دن رہنا ناممکن ہے مجھے تو ایسی دوا دیجیے کہ رات کی گاڑی سے لینن گراڈ جاسکوں۔ انھوں نے چار دن کے لیے چار چار گھنٹوں کے وقفے سے کھانے کو کچھ گولیاں دیں۔ ان سے مجھے شام تک بڑی حد تک فائدہ ہوا۔ دوسرے دن، رات کی گاڑی سے بآسانی جانے کے قابل ہوگئی۔ یہاں سورج ان دنوں رات کے بارہ کے قریب ڈوبتا اور صبح چار بجے سے پہلے طلوع ہوجاتا یوں صرف تین چار گھنٹوں کی رات ہوا کرتی۔ ہوٹلوں اور گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر موٹے موٹے مخملی پردے پڑے ہوئے ہوتے کہ دن نکلنے پر بھی رات کا احساس ہو۔ ہمارا ہوٹل دریائے نیوا کے ساحل پر تھا۔ دریا کے کنارے جو چمن ہے اس میں خالی زمین پر زور سے پاؤں مارو تو پانی فوارے کی طرح نکلتا ہے۔ یہ

تجربہ ہم نے بھی کیا۔ زار کے محل پر گولہ باری کرنے والے جہاز کو بھی دیکھا۔ محل کی صفائی اور درستگی ہو رہی تھی اس لیے اس کو نہ دیکھ سکے۔ ایک رات یہاں قیام کیا اور دوسرے دن ماسکو واپس ہو گئے۔

یہاں کا سب سے متاثر کن نظارہ۔ وہ گھر اور ان کی دیواریں تھیں۔ جہاں دشمن کے خلاف بھوکے پیاسے رہ کر۔ وہاں کے رہنے والوں نے مقابلہ کیا تھا۔ گولیوں کے نشان ہر جگہ...... کہیں گھر کے اوپری حصہ میں دشمن۔ نیچے۔ وہاں کے شہری۔ کہیں اس کے برخلاف چپہ چپہ پر مقابلہ کرتے۔ جان دیتے اپنی آزادی کی حفاظت کی تھی۔ اور آخر کار دشمن پر فتح پائی۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب ہوائی جہاز کے ذریعہ ازبکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ تین بجے ازبکستان پہنچے۔ ایرپورٹ پر کئی عورتیں خیر مقدم کے لیے موجود تھیں۔ تعارف ہوا تو یوں لگا جیسے ازبکستان کی پوری کیبنٹ عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ سب ہی تقریباً کسی نہ کسی محکمہ کی وزیر اور سب کے نام ہم لوگوں جیسے ہی لیکن نام کے آخر میں وا یا فے لگا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً جمیلہ کے آگے جمیلوا' عزیزہ کے آگے وا بڑھا کر عزیزوا کر دیا گیا ہو۔ ہمارے ساتھ کیرالا کی ایک وکیل صاحبہ تھیں جو کافی سنجیدہ خاتون تھیں تھوڑی بہت اردو جانتی تھیں۔ اور ایک کرسچین ڈاکٹر' پستہ قد کافی موٹی بڑی بد دماغ اور متعصب بھی۔ انھیں ہر جگہ بس تصویر کھنچوانے کی فکر لگی رہتی جہاں کہیں جاتیں عبادت گاہیں دیکھنے کی فرمائش کرتیں چناں چہ ماسکو میں فرمائش کر کے کئی چرچ دیکھ ڈالے اور جب تاشقند پہنچے تو یہاں بھی مسجد و گرجا گھر دیکھے۔ دوسرے دن ظہر کی نماز کے وقت ایک قدیم بڑی مسجد دکھانے لے گئے وہاں مفتی الیشان بابا خان صاحب سے تعارف ہوا۔ انھوں نے دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ بابا خان کی دعوت کے کھانے میں ہمارے ہاں کی طرح قورمہ نان اور پلاؤ تھا۔ ان ہی ناموں سے مگر ذائقہ میں فرق۔ مفتی صاحب کی الماری میں کتابوں پر نظر پڑی۔ ان میں علی شیر نوائی کے دیوان کے علاوہ'' جس کو وہ اپنا قومی شاعر مانتے ہیں'' رقعاتِ عالم گیری بھی نظر آیا، زبان تو یہاں

کی کچھ ترکی زبان سے ملتی ہے لیکن اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نظر آئی۔ مفتی صاحب نے ریشم سے کڑھی ہوئی چوگوشہ ٹوپی ایک ایک سب کو تحفتاً دی۔ دوسرے دن وہاں کے ایک مشہور کپڑے کے کارخانے لے جایا گیا۔ وہاں اس وقت کئی رنگوں سے عمدہ سلک بُنا جا رہا تھا۔ مزدوروں کے مکان اور ان کے بچوں کے لیے نرسری اسکول' ہاسپٹل' بازار سب آس پاس ہی نظر آئے۔ مکان سارے باہر سے گھاس کی جھونپڑیوں جیسے لگتے مگر اندر سے بہت صاف ستھری لکڑی کی چھت' عمدہ ترشے ہوئے ستون۔ ہر گھر میں دو کمرے' ورانڈا اور بہت بڑا آنگن جہاں ترکاریاں اور پھول وغیرہ ہوتے۔ عورتوں کا لباس شلوار نما پائجامہ لامبا سا کُرتا۔ اور سر پر قصاوہ باندھے۔ ایک مشترکہ فارم بھی دیکھا جہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بہت لامبی سی میز مختلف کھانوں سے بھری ہوئی فارم میں کام کرنے والوں کی بستی بھی دیکھی ویسے ہی گھاس کے ڈھکے صاف ستھرے مکان معلوم ہوا کہ یہاں گرمی بہت پڑتی ہے اس لیے چھتوں پر گرمی کم کرنے کے لیے گھاس کی چھت ڈالی جاتی ہے۔ یہاں بھی فارم کی طرف سے پوت سے بنی ہوئی ٹوپی تحفہ میں ملی۔ مرد' عورتیں اور بچے بھی یہاں ایسی ہی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ علی شیر نوائی کے کلام کے چار چار ریکارڈ بھی ہر ایک کو دیے گئے۔ روانگی سے قبل ہر ایک کو اپنی زبان میں وہاں کی سیر کے تاثرات ریکارڈ کرنے کو کہا گیا۔ اردو میں یہ کام مجھے کرنا تھا۔ رات میں بیٹھ کر مختصراً لکھا دوسرے دن ریکارڈنگ ہوئی۔ بہت تعریف اور یہ کہ اس میں تو کئی الفاظ ہماری زبان کے ہیں۔ یہاں کے دورانِ قیام ایک فلم "شیریں فرہاد" بھی دکھائی گئی مجھے تو وہ شہر اپنے ہندوستان کے شہر جیسا ہی لگا۔ دلّی جیسی گرمی ہاں مگر صفائی وغیرہ بہت ہی زیادہ۔ تعلیم یافتہ افراد تقریباً اسّی نوّے فی صد کے قریب۔ چوتھے دن وہاں سے واپسی تھی اسی دن شام بہت اچھا کلچرل پروگرام اور مشاعرہ بھی ہوا۔ جس میں مشہور شاعرہ زلیقہ کو بھی سنا۔ پھر رات دو بجے ماسکو کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہماری جو بات چیت ریکارڈ کروائی گئی تھی اس کا ہر ایک کو معاوضہ بھی ملا۔ صرف تین چار

لوگوں کو۔ یہ تصفیہ ہوا کہ یہ رقم سب میں برابر تقسیم کر دی جائے۔ تو دو سو رُوبل سے کچھ اوپر ہی ملے۔
تاشقند سے ماسکو صبح سویرے سے کچھ پہلے پہنچ گئے۔ سارا شہر صاف ستھرا روشنی سے جگمگا رہا تھا یہاں
دو تین دن قیام کرنا تھا۔ ایک دن ہم گھومے پھرے، دوسرا دن کچھ شاپنگ میں صرف ہو گیا۔ کیوں کہ
روبل کو یہاں پر خرچ کرنا تھا۔ ماسکو سے بذریعہ ہوائی جہاز ہمیں جنیوا پہنچنا تھا۔ روانگی کے ایک دو
گھنٹے بعد ہی لیتھوانیا کے ایرپورٹ پر پانچ چھ گھنٹے رُکنا پڑا۔ اس اطلاع کے تحت کہ مطلع صاف نہیں
ہے۔ وہاں سے پھر سیدھے جنیوا۔ یہاں ہمیں ایک دن رُکنا تھا۔ جہاز دوسرے دن صبح روانہ ہونے
والے تھے مہمان نوازی کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ ہر شخص بڑی کفایت سے کام لے رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا
ایک سستے ہوٹل میں کھایا اور زیادہ تر پیدل گھومے۔ میں لیگ آف نیشن کی عمارت دیکھنا چاہتی تھی مگر
سب کے پرس تقریباً خالی تھے۔ رات کے کھانے کے لیے چند چیزیں خرید لی گئیں رات کو رہنے کے
لیے دو دو تین بستروں والے کمروں کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ایک رات دو اور بنگالی مندوبین کے ساتھ
گذارنی پڑی۔ دن بھر کی تھکن تھی کھانے سے فارغ ہو کر جلد ہی لیٹ گئی۔ اب جوان بنگالی خواتین کی
باتیں شروع ہوئیں تو خدا کی پناہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں۔ یہ پڑھی لکھی خواتین تھیں جو غالباً کامریڈ بھی
تھیں مگر یوں لگا کہ انھیں کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں۔ بس بنگالی زبان میں بولے
جا رہی ہیں۔ مجھ میں اپنی کم علمی کا احساس رہتا اس لیے شاید کسی سے بھی زیادہ گھل مل نہ سکی۔ مگر ان
لوگوں کے طرزِ عمل اور دوسرے تجربوں سے اتنا ضرور ہوا کہ میرے اندر جو احساس کمتری تھا وہ کم
ہو گیا۔ مگر احساس اجنبیت بڑھ گیا۔ بس ہاجرہ آپا تھیں کتنی اچھی مہذب اور ہر کسی کا خیال رکھنے والی۔
جن کے ساتھ کبھی بھی مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کئی سال قبل انھوں نے خطوں میں لکھا کہ میں
اپنی سوانح قلم بند کروں میں نے یہ سوچ کر کہ میرے ایسے کون سے کارنامے ہیں کہ لکھتی۔ ان کی
خواہش پر عمل نہ کیا۔ جنیوا میں سارے ہی مندوب اکٹھا ہو چکے تھے۔ دوسرے دن دس بجے ہم اپنے

ملک کی طرف روانہ ہوئے۔ بحرین پر دو تین گھنٹے توقف کرنا پڑا۔ صبح کے نو بج رہے تھے گرمی حد درجہ شدید تھی پیاس سے بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس پر پانی کی قلت۔ آخر میں انھوں نے تربوز لا کر دیے۔ پانی کی جگہ انھیں استعمال کرنے کے لیے۔ اسی خاص وجہ سے بحرین پر اُترنا یاد رہ گیا۔ ورنہ آتے جاتے اور بھی جگہوں پر اُترنا ہوا تھا۔ ہم لوگ پورا ایک مہینہ اپنے ملک سے باہر گذار کر گھر پہنچے۔ ایک غیر متوقع خوش خبری ملی یہ کہ مخدوم کا خط میرے نام ماسکو سے لکھا ہوا کہ وہ اب چین روانہ ہو رہے ہیں اور یہ کہ ماسکو میں ایک بیلے ڈانسر کا ڈانس دیکھا مگر ان سے مل نہ سکے۔ اب وہ حیدرآباد پہنچنے والی ہیں۔ آپ ان کا رقص ضرور دیکھیں یہ بھی کہ چین سے ہندوستان ہوتے ہوئے ویانا وغیرہ جائیں گے پھر کچھ دنوں بعد اُن رقاصہ صاحبہ کی حیدرآباد آنے کی خبر ملی۔ میں امّی کے ساتھ وقت سے کچھ پہلے ہی فنکشن ہال پہنچ گئی ابھی ہم باہر ہی کھڑے تھے کہ کسی نے آ کر امّی کے پیٹ میں منڈی ڈالی (یہ حیدرآباد کی ایک خاص اصطلاح ہے جو اپنے بڑوں کو بہت جھک کر سلام کرنے کو کہتے ہیں) حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ مخدوم تھے۔ یکایک یہاں کیسے پہنچ گئے۔ امّی کو سلام کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے بتایا کہ یہاں سے کلکتہ میں مزدوروں کی کوئی عالمی کانفرنس ہے۔ اس میں شرکت کرتے ہوئے وہاں سے سیدھے ویانا جانا ہے۔ اتفاق کی بات کہ دو تین ہفتوں بعد ہی فیڈریشن کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لیے کلکتہ جانا ہوا۔ دس گیارہ بجے ہاوڑا اسٹیشن پر اترے مخدوم نظر آئے اور کوئی نہ تھا انھوں نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس گرمی کا احساس آج تک ہے۔ کلکتے میں چند روزہ قیام کے بعد وہ (مخدوم) ویانا چلے گئے۔ اور اس دفعہ سال بھر کے اندر ہی حیدرآباد لوٹ آئے۔ اختر کے ہاں دو بچے اور ہو چکے تھے۔ انور کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ ظفر نے مظہر اور قمر کے ساتھ نوجوانوں میں دوبارہ کام کا آغاز کر دیا۔ پارٹی پر سے پابندی بھی اُٹھ چکی تھی۔ انور نے سوچا کہ مقطعہ جا کر حفیظ کے ساتھ کھیتی باڑی کی جائے وہاں پاشا بھائی سے چھوٹے نواب جانی ہی تھے۔ ساری زمین بٹائی پر اٹھا

رکھی تھی۔ ہل، بیل کچھ نہ رہے تھے اب کھیتی کرنا ہو تو بیل وغیرہ خریدنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔ ابّا جی نے کسی کمپنی کے دو ہزار کے شیرز خرید رکھے تھے انھیں بیچ کر رقم انور کے حوالے کر دی ان دونوں نے بیل وغیرہ خرید کر کام شروع کر دیا۔ لیکن یہ کام انور سے نہ ہو سکا چند ماہ بعد واپس ہو گئے۔ یہاں آ کر دو ایک ٹیوشن کرنے لگے پھر جلد ہی اختر کی کوششوں سے ان کی پرانی ملازمت انھیں مل گئی مگر تقرر نئے سرے سے ہوا۔

(1957)

کوآپریٹیو کا کام اچھا چل رہا تھا۔ ایک دن ایک صاحبہ نے آ کر کہا کہ ان کی بھانجی بہت اچھا کام جانتی ہے۔ انھیں کوئی کام دیجیے۔ میں نے کچھ کام دے دیا۔ بہت جلد اور اچھا کام کر کے دکھایا۔ چند ہی دنوں بعد ان کام کرنے والی صاحبہ کے بارے میں تفصیلات کا علم ہوا۔ یہ بن ماں باپ کے دو بھائی بہن جو اپنے نانا نانی کے زیرِ پرورش تھے بڑے بھائی کو باپ کی نوکری مل گئی تھی اور بہن صاحبہ جن کا نام بدر النساء بتایا گیا تھا آٹھویں جماعت کامیاب کر کے کسی صنعتی اسکول میں داخلہ لیا تھا وہاں اچھا کام سیکھ کر سند حاصل کر چکی تھیں۔ نانا کا انتقال ہو گیا۔ بڑے ماموں اور ممانی نے جلد ہی شادی کروا دی میاں کو بیوی پسند نہ آئی۔ دو تین ماہ کے بعد انھیں میکے واپس بھیج دیا۔ یہاں سات آٹھ مہینے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا یہ کوشش کی گئی کہ میاں بیوی کو بلا لیں مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ خالہ صاحبہ کے میاں امین پولیس تھے زیادہ تر اضلاع پر رہتے۔ ان کی بھی شاید میاں سے بنتی نہ تھی ماں کے ساتھ رہنے لگی تھیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی ان کے۔ میاں لڑکے پڑھائی وغیرہ کا خرچ بھیجتے رہتے۔ بھتیجی کو بہت چاہتی تھیں اس لیے انھیں کام پر لگانے کی کوشش کرتی رہیں۔ یہ سارا قصہ ان کی خالہ ہی نے مجھے سنایا تھا اور یہ بھی کہ لڑکی کے میاں طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ ایک دن میں خود گئی ان کی نانی سے

ملاقات کی اور کہا ہفتہ میں تین دن آ کر ہمارے ادارے میں کام سکھائیں۔ ان کا گھر قریب ہی لال ٹیکری میں تھا' نانی بھیجنے پر تیار ہو گئیں...... او پر باتھ روم بنانے کی ضرورت تھی لیکن رقم کی فراہمی کی کوئی صورت نہ تھی۔ چوڑیاں چھڑا کر بیچ دوں تو کچھ رقم نکل سکتی ہے۔ لیکن چھڑانے کے لیے بھی تو رقم چاہیے۔! یہ کہاں سے آئے؟ ٹیچر بدرالنساء نے اس بارے میں اپنی خالہ سے بات کی وہ ایک دن میرے پاس اپنا زیور لے کر آئیں کہا انھیں بینک میں رہن رکھ کر جتنی رقم کی ضرورت ہے قرض لے کر اپنی چوڑیاں چھڑا لیں۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا چوڑیاں چھڑا لیں اور بیچ دیں اس سے جو رقم آئی اس میں ان کا زیور چھڑا کر انھیں لوٹا دیا۔ اور بقیہ رقم سے باتھ روم وغیرہ کی تعمیر کروائی۔ اس وقت تک جاوید بھی کافی کمانے لگ گئے تھے۔ ورانڈا اور دوسرے دو کمرے کی تعمیر کے لیے جاوید نے رقم لگائی۔ اس طرح اب چار بڑے کمرے ایک چھوٹا کمرا ایک ورانڈہ کافی بڑا مکان مکمل ہو گیا۔ ایک کمرے میں مشین وغیرہ رکھی تھی۔ اخراجات کسی طرح پورے نہ ہو رہے تھے۔ شاید کامریڈ مہیندرا نے بتایا تھا کہ سوشیل ویلفیر بورڈ سے مالی امداد مل سکتی ہے۔ وہاں کوشش کی۔ شروع میں ایک سال کے لیے ایک ہزار روپیوں کی امداد ملی۔ حسابات چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ذریعہ پیش کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ چناں چہ یہ شرط اکاؤنٹنٹ کی تلاش کر کے پوری کر دی گئی۔ ہمارا حساب بہت ٹھیک رہا۔ اس بہتر حساب کے حوالے سے درخواست دینے پر چار ہزار کی سالانہ گرانٹ منظور ہو گئی۔ دو ہزار روپے ماہ وار ٹیچر کی تنخواہ کے لیے دو ہزار روپے سامان کی خریدی کے لیے۔ کرایہ مکان یا اکاؤنٹنٹ کی فیس کے لیے کوئی امداد نہیں۔ ختم سال پر اکاؤنٹنٹ کی رپورٹ پیش کرنا ضروری تھا۔ اب تک تو سیکھنے والوں سے فیس نہیں لی جاتی تھی' اب ماہانہ ایک روپیہ فیس مقرر کر دی گئی پھر بھی تربیت پانے والیوں میں لگ بھگ نصف فی صد لڑکیاں فیس ادا کرنے کے موقف میں نہ تھیں۔ ہر دوسرے سال ورکنگ کمیٹی کے انتخابات منعقد کروانے ضروری تھے۔ اور یوں بھی دوسرے تیسرے ماہ ورکنگ کمیٹی رکھ کر ہی فیصلے

لیے جاتے تھے۔

فیڈریشن کی دوسری آل انڈیا کانفرنس وجئے واڑہ میں ہوئی۔ یہاں تین مندوبین نے شرکت کی تھی جن میں امی بھی شامل تھیں۔ اسی کانفرنس میں پہلی بار کامریڈ راجیشور راؤ صاحب سے ملاقات ہوئی جو بعد میں پارٹی کے سکریٹری ہوئے۔ مخدوم یہاں سٹی ورکنگ کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ان کا کوارٹر اختر کے کوارٹر سے ایک کوارٹر اونچا تھا۔ وجئے واڑہ کانفرنس میں ہاجرہ آپا نے کہا کہ باہر سے آنے والی مہمان مندوبین میں چیکوسلواکیہ کی دو خواتین حیدرآباد میں دو دن قیام کر کے لوٹیں گی۔ آپ فوراً حیدرآباد لوٹ جائیں اور ان مہمانوں کے قیام کے علاوہ سوسائٹی کی جانب سے کچھ پروگرام وغیرہ کا اہتمام کریں۔ میری یہ حماقت کہ انجمن یا کوآپریٹیو وغیرہ کے سارے کاموں کو صرف اپنی ذمہ داری باور کرتی تھی۔ یہاں میں ہوٹلوں سے واقف اور نہ ہی ایسے کسی کام کا تجربہ۔ گھوم پھر کر ایک ہوٹل کے کمرے بک کروالیے۔ کلچرل پروگرام کی ذمہ داری بدرالنساء اور عبدالرزاق صاحب کو سونپ دی۔ انھوں نے کلچرل پروگرام میں ایک کچھ ایسا منظر پیش کرنے کی سوچی جس میں ایک لڑکی دلھن کے بھیس میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے دلہن کی بہنیں اور سہیلیاں سر سے پیر تک ایک ایک زیور کی طرف اشارہ کرتی ہوئی گاتی ہیں۔ دلھن کے زیور تو سبھی دستیاب ہو گئے لیکن پیر کی پازیب کہیں نہ ملی۔ یہ مجھے علم تھا کہ آساوری کی والدہ کے پاس پازیب ہیں۔ چنانچہ پازیب اُن سے مانگ لائی۔ ان لوگوں نے بہت ہی خوب صورت ایمبرائیڈری کی چیزیں تحفے میں دیں۔ یہ ایسا کام کہ شاید ہی کہیں اس سے بہتر بنتا ہو۔ ایک دستی میرے پاس اب تک بھی محفوظ ہے۔ مخدوم کو ورکرس کی میٹنگوں میں مدعو کیا جاتا ضرور شرکت کرتے۔ اور جب کبھی خواتین ان سے کلام سننے کی خواہش کرتیں وہ ضرور آجاتے اور اپنا کلام ہمیں جی بھر کر سناتے اس طرح ایک مشاعرہ ہو جاتا۔ سامعین میں دو ڈھائی سو خواتین سے کم تعداد نہ ہوتی۔

اُوپر کے حصّے میں پہلی دفعہ مخدومؔ کی آمد

کامریڈز سے ملنے جلنے کے بعد اختر بھی کچھ پینے پلانے کی جانب مائل ہو گئے تھے لیکن ریاست اپنے گھر کے اندر ایسے مشاغل کو گوارا نہ کرتیں۔ اس دوران اختر کی کوشش کے سبب میرے گھر فون لگ گیا تھا۔ ایک دن میرے پاس اختر کا فون آیا کہ وہ مخدومؔ و کنول پرشاد کنول شام میرے ہاں گذارنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آجائیں۔ تینوں بعد مغرب چلے آئے اور تین چار گھنٹے گذارے۔ اس کے بعد جب فرصت ہوتی مخدومؔ آجاتے۔ اختر رضیہ اور ہم سب کے ساتھ میرے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھنے لگے۔ شام سے رات تک طویل بیٹھکیں رہتیں اور یہ معمول کی بات ہوگئی۔ اب مخدومؔ اکثر باہر کے زینے ہی سے اوپر آجاتے۔ ان ہی دنوں میں اختر کے ہاں تین تین چار چار دن گذار دیتی وہاں روز ہی ناشتے کے بعد مخدومؔ بھی آجاتے اور کہیں جانے کی ضرورت تک بیٹھے رہتے۔ سامنے جو کھلی جگہ تھی وہاں شام میں عالم خوندمیری، مخدومؔ "بشرطِ فرصت" اور کئی ایسے ملنے جلنے والے بھی اکٹھا ہو جایا کرتے اس طرح دو تین گھنٹوں کی محفل کافی اچھی ہو جاتی۔

ایک دن میں اختر کے پاس گئی۔ اس شام وہاں مخدومؔ کے علاوہ کوئی نہ تھا طے ہوا کہ حسین ساگر کے قریب کے چمن کو جایا جائے۔ ہم چاروں پیدل نکل پڑے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر لوٹ آئے۔ دوسرے دن میں مستعار لائے ہوئے پازیب لوٹانے کے لیے گئی تو وہاں سے دس کے قریب واپسی کے لیے اُٹھی۔ اُساوری اور ان کی والدہ دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ اسی اثناء مخدومؔ اندر آئے نہ جانے کس موڈ میں تھے ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے چلیے ٹینک بنڈ چلتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے چلیے۔ اُساروی کی والدہ نے انکار کر دیا۔ اساوری سے کہا تو وہ بھی آمادہ نہ ہوئیں۔ ان کی والدہ کے انکار کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی تھی کہ وہ پردہ کرتی تھیں لیکن لڑکی اپنے باپ کی بات کو اس طرح رد

کر دے یہ بات عجیب سی لگی۔ جب مجھ سے چلنے کو کہا تو ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ راستہ خاموشی سے کٹا۔ حسین ساگر کے بیچوں بیچ ایک چوکور چھت کے نیچے جہاں ایک بنچ پڑی تھی بیٹھ گئے۔ مخدوم یہاں بھی چپ تھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے وقت گذاری کے لیے ان کے بیرونی سفر کا موضوع چھیڑ دیا تقریباً بارہ بجے کے قریب واپسی کے لیے اٹھے۔ مجھے اختر کے کوارٹر تک لا کر چھوڑا۔ کوارٹر میں ڈائننگ روم کے طور پر جو کمرہ ہوا کرتا تھا وہاں تخت پر میرے سونے کا انتظام رہتا تھا۔ اور اگر میں کہیں میٹنگ وغیرہ کے لیے باہر گئی ہوتی تو دروازہ صرف بھیڑ دیا جاتا تھا۔ دروازہ تو آج بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اندر جا کر لیٹ گئی۔ مگر نیند کوسوں دور۔ بار بار یہ خیال آتا رہا کہ اساوری کی والدہ اگر ساتھ آنا نہیں چاہتی تھیں تو کم از کم رات کے کھانے کے لیے تو پوچھ لیتیں۔ اور ایسے کتنے ہی خیالات نے گھیر رکھا تھا صبح تک کسی طرح نیند نہ آئی سویرے ہی گھر چلی آئی۔

(1957)

کوآپریٹیو کے کاموں میں بدر کی وجہ سے بڑی سہولت ہوگئی تھی۔ فیڈریشن کی تیسری کانفرنس دلّی میں ہونے والی تھی۔ رزاق کو جواب ماسٹر صاحب پکارے جانے لگے تھے تصویریں لینے اور خبریں چھپوانے کا بہت شوق تھا۔ اب یہ کوآپریٹیو کے ہمہ وقتی کارکن بن چکے تھے۔ ڈیلیگیشن کے دلی جانے کی خبر سب کے ناموں کے ساتھ اخبار میں چھپوادی۔ اس کا علم مجھے واپسی پر ہوا جب بدر نے آکر بتایا کہ گھر میں بڑا ہنگامہ ہوگیا ہر وقت لعن طعن کہ بڑی لیڈر ہوگئی ہیں۔ اخباروں میں نام آنے لگا ہے۔ اور بدر کی اس بے راہ روی کو ختم کرنے کے لیے کسی بوڑھے کو تلاش کیا گیا کہ اس سے عقد کر دیا جائے۔ اس دوران طلاق ہو چکی تھی غریب خودکشی پر آمادہ ہوگئی۔ بچے کو میرے پاس لے آئی اور کہا کہ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں تو میں اطمینان سے جان دے سکوں گی۔ میں نے سمجھایا کہ جان

دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمت ہے تو گھر چھوڑ دو۔ میرے پاس آجاؤ زینے کے اوپر جو چھوٹا سا کمرہ ہے اس میں رہ سکتی ہو۔ وہ اس کے لیے تیار ہوگئیں۔ اور اب وہ بھی ایک ہمہ وقتی کارکن بن گئیں۔ گھر والوں سے کوئی تعلق نہ رہا۔ وہ خالہ جنھوں نے مجھ سے بدر کا تعارف کروایا تھا کبھی کبھی ملنے آجایا کرتیں۔ ان کا بچہ تین سال کا ہورہا تھا۔ میں نے اسے چراغ علی گلی میں ایک آغا خانی اسکول میں شریک کروادیا۔ یہاں صرف ان ہی کی کمیونٹی کے بچوں کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ کسی کی خاص سفارش ہوتی تو کمیونٹی سے باہر کا کوئی لڑکا شریک ہوجاتا۔ اس کی شرکت میں بھی ایسے ہی ایک بزنس مین سے مدد حاصل کی گئی تھی۔ ادھر دو سال سے صنعتی نمائش میں سوسائٹی کے سامان کا ایک اسٹال لگ رہا تھا۔ اس کا انچارج میرا چھوٹا بھائی قمر ہوتا۔ یہ ہم سب سے الگ قسم کا لڑکا تھا اس کے کئی لوگ دوست بن گئے تھے ان ہی میں ایک قادیانی بزنس مین بھی تھے۔ جن کا گھر ہمارے پاس ہی میں تھا چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک بار میں ان کے گھر بھی جا چکی تھی۔ ایک دن وہ ہمارا ورک سنٹر دیکھنے آئے ہمارے کام کو بہت پسند کیا تھا۔ ان کی سفارش ہی سے اس لڑکے کو جس کا نام ظہیر تھا وہاں داخلہ مل گیا۔ عبدالرزاق نے اسے لانے لے جانے کی ذمہ داری لے لی۔

بلدیہ کے انتخابات ہونے والے تھے پارٹی نے بہت زیادہ افراد کو بلدیہ ممبر شپ کے لئے کھڑا کردیا تھا ان میں میرا نام بھی شامل کردیا۔ مجھے اس ممبر شپ سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور نہ میرے پاس اس سلسلے میں خرچ کرنے کے لیے اخراجات کی کوئی گنجائش۔ میں نے پارٹی سے یہ سب کہہ دیا۔ مگر شاید میری بات پر غور نہیں کیا گیا اور میرا نام ممبر شپ کے لیے برقرار رہا۔ ووٹنگ کے لیے کوئی دو ہفتے رہ گئے تھے اختر نے کہا کہ یہ تو بہت غلط بات ہے پارٹی نے نامزد کیا ہے تو اسے کام بھی کرنا چاہیے۔ یہ صورت حال مخدوم کے سامنے رکھی گئی تو انھوں نے ساتھیوں کو اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ تین چار میٹنگوں کو خود مخدوم اور اختر نے مخاطب بھی کیا۔ مگر چوں کہ بہت زیادہ افراد کو

کھڑا کیا گیا تھا۔ کسی ایک امیدوار کے لیے زیادہ وقت اور پیسہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ تو پھر ہوا یہ کہ میں پونے دوسو ووٹوں سے ہار گئی۔ پارٹی اگر پچاسوں امیدواروں کے بجائے اپنے فنڈز اور ورکرس کا اندازہ کر کے جہاں جہاں اس کا اثر تھا اپنے امیدوار کھڑا کر دیتی تو بہت سی نشستیں مل سکتی تھیں .... مجھے اپنے ہارنے کا کوئی افسوس بالکل نہ ہوا بلکہ ایک طرح خوشی ہوئی کہ بلدیہ کی میٹنگوں اور بحث ومباحث کے خیال سے جی گھبراتا تھا۔ دوسرے خوشی اس اعتبار سے بھی ہوئی کہ لوگ یہ باور کرتے کہ بلدیہ کی ممبر شپ کے طفیل میں نے گھر بنالیا۔ جاوید ان دنوں میرے کہنے پر اوپر کے نامکمل حصے کی تکمیل کروارہا تھا۔ اب جاوید بھی اوپر رہنے لگا تھا۔

کوآپریٹیو کا کام بتدریج پھیلنے لگا تھا لیکن مالی امداد کہیں سے کوئی خاص نہیں مل رہی تھی کامرس انڈسٹری کے چکر میں مسلسل لگے ہی رہے ہاں البتہ سوشیل ویلفیر بورڈ کی امداد جاری رہی۔ معلوم ہوا کہ سوشیل ویلفیر سے تعمیر کے لیے گرانٹ مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ سوسائٹی کی اپنی ذاتی زمین ہو۔ تلاش کرنے لگی کہ بلدیہ کا کوئی چھوٹا قطعۂ زمین کہیں قریب میں مل جائے۔...... پتہ چلا کہ نیلوفر دواخانے کے قریب تین چار سوگز زمین کا ایک ٹکڑا خالی پڑا ہے۔ کمشنر بلدیہ کی ایما پر مل سکتا ہے۔ اس وقت کمشنر کوئی شاستری صاحب تھے۔ منوہر راج سکسینہ سے ان کے اچھے روابط تھے۔ ان سے جاکر ملاقات کی۔ انھوں نے درخواست پر تجویز لکھ دی کہ زمین فلاں کوآپریٹیو کو دی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک نقل فوراً سوشیل ویلفیر بورڈ کو ارسال کردی۔ جہاں سے تعمیر کے لیے دس ہزار کی گرانٹ کی منظوری اس شرط پر ہوئی کہ زمین کی رجسٹری کے کاغذات ملنے کے بعد ہی گرانٹ کی اجرائی عمل میں آئے گی۔

بلدیہ الکشن کے بعد منتخبہ ممبروں کی کمیٹیاں بنائی گئی تھیں اور ان کے ذمہ مختلف کام تفویض ہوگئے تھے۔ زمین وغیرہ کے قطعی مرحلوں کو طے کرنے کی ذمہ داری ایسی ہی ایک کمیٹی کے تفویض تھی۔ اس کی پیشی کے وقت اپنی کوآپریٹیو کی صدر کے ہمراہ پہنچی۔ صبح گیارہ بجے سے شام چار بجے تک

ہم دونوں وہاں بیٹھی رہیں۔ کمیٹی کے صدر جناب اویسی صاحب نے محض اس بنا پر کہ جمال النساء ایڈیٹر پیام اختر صاحب کی بہن ہیں اور وہ کمیونسٹ ہیں کمشنر کے منظور کردہ عطیے کو منسوخ کر دیا۔ اور یوں زمین کے نہ ملنے پر ہم سوشیل ویلفیر کی منظورہ رقمی امداد سے محروم رہ گئے حالاں کہ اختر اور رضیہ کبھی پارٹی ممبر نہیں رہے البتہ پارٹی کے ہمدرد ضرور تھے۔ ہاں میں، ظفر، قمر، حفیظ اور مظہر وغیرہ سب پارٹی ممبر تھے۔ میں نے اپنے تعلق سے اس بات کو کبھی چھپائے نہیں رکھا۔ ہمارے پاس سے امتحان پاس کرنے کے بعد کئی ضرورت مند خواتین کو بلاک ڈیولپمنٹ اسکیم کے تحت اضلاع تلنگانہ میں پانچ سالہ اسکیم کے تحت نوکریاں ملیں اور بعد گاؤں سدھار اسکیمات کے ضمن نوکریوں کی پیش کش ہوئی تھی۔ کیوں کہ انھیں اچھا ورکر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے کام کو ہر جگہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ہمارے کئی ورکرس نے جو سند یافتہ تھے کئی ایک نے تو اپنا خود چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی رہیں۔

سوشیل ویلفیر بورڈ کی طرف سے میٹرک کی تعلیم کا انتظام کر کے امتحان دلانے کی خاطر گرانٹ دی جاتی تھی۔ انجمن کی طرف سے ہم نے بھی درخواست دی۔ کم سے کم پچیس طالبات کو دو سال میں امتحان کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔ اس کام کے لیے ایک ٹیچر کی ماہانہ دوسو روپے تنخواہ اور طالبات کے لیے پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ البتہ جگہ کے لیے کچھ نہیں ملتا۔ امتحان میں لگ بھگ بیس بائیس طالبات نے شرکت کی اور ان میں سے نو لڑکیاں کامیاب ہوسکیں اتنی محنتوں کے بعد ایسا نتیجہ سامنے آیا۔ یہ بہت خراب لگا۔ مگر ویلفیر بورڈ نے ہمارے نتیجے کو بہتر سمجھ کر گرانٹ جاری رکھی کچھ اضافے کے ساتھ اس شرط پر کہ پچیس میں سے کم از کم پندرہ لڑکیاں مستقلاً رات دن سنٹر میں رہیں۔ اسی صورت میں ان کے کھانے وغیرہ کا خرچ تیس روپے ماہانہ کے حساب سے دیا جائے گا۔ اس طرح کا اعلان اخبار میں شائع کروایا گیا۔ بیس لڑکیاں شریک ہوئیں ویلفیر بورڈ صدر صاحبہ جو

بنگالی تھیں انھوں نے مشورہ دیا کہ وہاں قریب میں تلگو بولنے والوں کا محلہ ہے اگر آپ تلگو میڈیم

میٹرک کی جماعتیں چلائیں تو بہتر ہوگا۔ ملے پلے کے پیچھے خالی میدان میں جو ایک کالونی وجے نگر

کے نام سے بس گئی تھی وہاں تلگو بولنے والوں کی اکثریت تھی اعلان کی اشاعت کے فوراً بعد آٹھ دس

لڑکیاں اور عورتیں شرکت کے لیے ہمارے ہاں پہنچ گئیں۔ اسی کالونی کی رہنے والی ایک ٹیچر ہمیں

دستیاب ہوگئیں۔ بنگالی صدر مسز برہما صاحبہ بڑی ہمدرد اور بے تعصب خاتون تھیں۔ اردو میڈیم کا نتیجہ

کچھ امید افزا نہیں رہا۔ جگہ کی تنگی اور فنڈ کی کمی کے باعث ختم کردیا۔ آٹھ مارچ کو کوآپریٹیو میں عورتوں

کا دن پریم لتا صاحبہ کی صدارت میں سب سے پہلے ہماری سوسائٹی کے زیر اہتمام منایا گیا۔ ہر سال

جب کوآپریٹیو ہال میں عورتوں کا دن ہوتا تو ڈیڑھ دو سو کی تعداد ہمارے ممبر وغیرہ کی ہوتی تھی۔ ہماری

لڑکیاں ڈرامہ، ڈانس اور ٹابلوز وغیرہ کا مظاہرہ اور کلچرل پروگرام پیش کرتیں۔ کامرس انڈسٹری کے

ڈائرکٹر کو میں نے اپنے ممبروں کی تعداد کے حوالے سے دو ہزار روپیوں کی گرانٹ کے لیے درخواست

دی۔ انھوں نے یہ عنایت کی کہ اس کی جگہ تین ہزار قرض منظور کیا جس کے حصول کے لئے کسی جائیداد

کا مکفول ہونا مشروط تھا۔ چناں چہ بلا کچھ سوچے سمجھے میں نے اپنے گھر کو مکفول کردیا۔ انھوں نے

سوسائٹی کو دو سیونگ مشینیں بھی دلوائیں۔ قرض کی ادائیگی کی مدت پانچ سال مقرر ہوئی۔ یہ رقم کچھ

قرضوں کی ادائی اور ضروری سامان کی خریداری میں صرف ہوگئی۔ سوسائٹی کا خرچ ماہانہ آٹھ سو روپے

تھا۔ ویلفیر بورڈ سے تقریباً سوا تین سو ماہانہ فیس سے تقریباً ساٹھ ستر اور سامان تیار مال وغیرہ فروخت

سے ڈھائی سو ماہانہ اس طرح جملہ آمدنی ساڑھے چھ سو کے آس پاس ہوجاتی تھی لیکن ماہانہ ڈیڑھ سو

روپیوں کا خسارہ ہورہا تھا۔ ایسے میں بھلا تین ہزار کی پابجائی کہاں سے ہوسکتی تھی۔ اس سلسلے میں بڑی

پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کونڈہ لکشمن بابو جی جب کوآپریٹیو کے منسٹر تھے تو ان سے اس بارے میں گفتگو

کی تھی۔ انھوں نے کچھ حل نکالنے کا وعدہ کیا تھا۔ اجب قرض کے ادا نہ کرنے کی صورت میں مطالبہ آیا

توان کو مل کر کہنا پڑا۔ تب تک وہ منسٹر بھی نہیں رہے تھے۔ انھوں نے کہا آپ بڑے لوگ ہیں دوبارہ اس سلسلے میں یاد دہانی کرنا گوارا نہیں کئے۔ اس سے مجھے بہت غصہ آگیا اور میں اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔ اس وقت تو راج کے ذریعہ کچھ سفارش پر یہ معاملہ ٹل گیا۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد محکمہ کے لوگ آئے۔ اور مشینوں وغیرہ کو ایک کمرے میں ڈال بند کر دیا۔ اور کہنے لگے یہ سامان قرق کر لیا جائے گا اگر مقررہ دنوں کے اندر رقم ادا نہ ہوئی تو ان دنوں سروجنی نائیڈو کی بہو دوار کا بائی کوآپریٹیو کی صدر تھیں اور یہاں کے منسٹر کوئی ڈاکٹر صاحب تھے۔ جن کا نام یاد نہیں۔ میں صدر صاحبہ کو لے کر ان کے پاس پہنچی۔ ساری تفصیلات ان کے سامنے رکھیں۔ دوار کا بائی تو کچھ دیر بعد چلی گئیں اور میں پورا دن بیٹھی رہی۔ جب تک یہ حکم جاری نہ کروالیا کہ تین ہزار گرانٹ دے کر قرض کی رقم میں محسوب کر لی جائے یہاں عبدالرزاق صاحب ساتھ تھے وہ آفس کے اندر باہر کئی چکر لگاتے رہے۔ غرض کوئی پانچ بجے کے بعد واپسی ہوئی۔ بعد میں ہم نے انھیں سوسائٹی کی طرف سے مدعو کیا وہ آئے کام کی تعریف اور امداد کا وعدہ کیا جو کبھی پورا نہ ہوا۔ چیف منسٹر آندھرا پردیش سنجیوا ریڈی بھی تشریف لائے تھے انھوں نے بھی تعریف کے ڈونگرے برسائے امداد کا پکا وعدہ کیا مگر بھلا دیا۔ ایک اور منسٹر بھی آئے تھے اور یہی کچھ کہہ سن کر چلتے بنے۔ البتہ نواب مہدی نواز جنگ کو ہم نے بلایا تو انھوں نے ہمارے کام کو نہ صرف سَراہا بلکہ فوراً سال بھر کے لیے کرایہ مکان اور ٹیچر کی تنخواہ دلوائی۔ دو تین سلائی مشین اور نیٹنگ مشین کے لیے رقم منظور کی۔ اُن کے آدمی کے ساتھ جا کر یہ ساری چیزیں خریدی گئیں۔ اب تک کلاس فرش پر ہوا کرتی تھیں ان کی رقم سے بنچس اور ڈیسک بنوائے گئے۔ کرایہ مکان اور ٹیچر کی تنخواہ کو یوں صرف کیا کہ دو اور سنٹر کھولے گئے۔ ایک مراد نگر اور ایک فرسٹ لانسر میں۔ مراد نگر سے ایک صاحبہ کام سیکھنے آیا کرتی تھیں جو متوسط طبقے کی ہوشیار لڑکی تھی۔ اس نے کام بھی بڑی تیزی سے سیکھ لیا تھا۔ ان کے گھر میں ہی ماہانہ دس روپے کرائے پر کمرہ لے لیا اور ان ہی کو ٹیچر مقرر کر کے کام کا آغاز کروا دیا۔

ایک مشین اور سامان بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اسی طرح دوسرا سنٹر بھی فرسٹ لانسر سے آنے والی خاتون کے گھر میں کھول دیا گیا۔ یہ صاحبہ ایک لڑکی کی ماں تھیں، شوہر برسوں سے غائب تھے۔ کام بہت عمدہ کرتی تھیں۔ انھیں بھی ایک مشین اور سامان دیا گیا۔ مراد نگر میں تو ایک روپیہ فیس رکھی تھی۔ لیکن یہاں لوگوں سے کچھ ملنا مشکل لگا۔ سال ڈیڑھ سال تک تو یہ رقم آتی رہی پھر وہی قرض کا سلسلہ چل پڑا۔ تین ساڑھے تین سال بعد مجبوراً دونوں سنٹر بند کرنے پڑے۔ اس دوران ایک سنٹر آغا پورہ میں بھی کھولا تھا پر صورتِ حال وہاں وہی تھی سیکھنے والی صاحبہ نے اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں خود ٹیچر بن کر کام شروع کیا تھا۔ دو تین سال بعد اسے بھی بند کرنا پڑا۔ ان تمام پانچ چھ سالوں کے دوران بشیر باغ کلب میں دو دفعہ مینا بازار رکھا گیا تھا۔ ایک مشاعرہ بھی رکھا گیا جس میں بمبئی سے سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجروحؔ سلطان پوری وغیرہ بھی اپنے جانے پہچانے شاعروں نے شرکت کی تھی یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ اس طرح کوئی چھ سات ہزار روپے اکٹھا ہو سکے ورنہ ان سنٹروں کا چلنا اتنے دنوں کہیں بھی ممکن نہ تھا۔ غالباً ان ہی دنوں دہلی میں وزیرِ اعظم اندرا گاندھی نے ویمنس اور کوآپریشن کے عنوان پر ایک کل ہند سیمینار منعقد کروایا۔ بابو جی نے آندھرا پردیش سے مجھے نامزد کروایا۔ میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آندھرا پردیش میں عورتوں کی کتنی کوآپریٹیو سوسائٹیاں چل رہی ہیں۔ اس سلسلے میں نہ ہمارے لوگ ہی کچھ جانتے تھے اور نہ ہی انڈسٹری ڈپارٹمنٹ والوں نے کچھ بتایا۔ میں خالی الذہن دلی چلی گئی۔ مارچ کا مہینہ تھا موسم خوشگوار اپنے پارلیمنٹ ممبرز کو جو آفس کی عمارت ملی تھی۔ راج بہادر گوڑ صاحب نے وہاں ٹھیرنے کا انتظام کروا دیا تھا۔ دو تین دن یہاں قیام رہا۔ کھانے کا انتظام وہاں میس کے ذمے تھا۔ روی نارائن ریڈی اور راجیشور راؤ ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ کئی باران لوگوں کا کھانے پر ساتھ رہا۔ کانفرنس وگیان بھون میں رکھی گئی تھی۔ یہ جائے قیام سے بہت قریب۔ سوچا تھا کہ دوسرے لوگ بھی کچھ بولیں گے تو اندازہ ہو جائے گا کہ مجھے کیا بولنا ہے۔

یہاں نشستوں کی ترتیب حروفِ تہجی کی کے لحاظ سے تھی اور اس میں آندھرا پردیش سب سے پہلے تھا۔ اندرا گاندھی جی کرسی صدارت پر موجود تھیں انھوں نے مختصر سی چند باتوں کے بعد ہر ڈیلیگیٹ کے لیے دس دس منٹ کا وقت مقرر کیا۔ آندھرا پردیش سے صرف میں پہلے میرا ہی نام پکارا گیا۔ میں نے ان دس منٹوں میں اختصار کے ساتھ امداد باہمی کی ضرورت، اہمیت اور اس کا احساس دلانے کے لیے تعلیم اور فنڈس کی قلت، متعلقہ محکموں کے ٹال مٹول کا رویہ، تاخیر، افسروں کی جانب داری وغیرہ کے بارے میں کہہ ڈالا اور بس خیال تھا کہ وقت کی پابندی ضروری ہے مگر اب جو بھی خاتون کھڑی ہوئیں بولتی ہی جاتیں۔ نہ وقت کا خیال نہ موضوع کا لحاظ۔ زیادہ تر غیر متعلق باتوں کی بھرمار بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کسی نے بھی بیس پچیس منٹ سے کم وقت نہیں لیا سارا وقت ختم۔ میٹنگ کے اختتام پر منسٹر صاحب کے ساتھ آنے والے کسی آفیسر نے مجھ سے کہا کام کی کچھ باتیں بس آپ ہی نے بتائیں تو ذرا اطمینان ہوا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں صرف اندرا جی نے بات کی۔ کچھ تبصرہ، کچھ ہدایتیں وغیرہ ان کی باتوں کا خلاصہ۔ تیسرے دن انھوں نے شام کی چائے پر اپنے ہاں مدعو کیا اور یہ کہا کہ بہتر ہوگا ڈیلیگیٹ اپنے اپنے صوبائی لباس میں آئیں چناں چہ تیسرے دن سہ پہر ہم سب اکھٹے ہوئے۔ غالباً تین مورتی ہاوز پر، ان موقعوں پر تصویر کشی تو ضروری ہوتی ہے۔ ایسے میں خواتین کی یہی کوشش رہی کہ اندرا جی کے ساتھ ان کی فوٹو آجائے۔ اس دوران میں ذرا الگ ہٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ صوبائی لباس میں کوئی زیادہ بوقلمونی نہیں نظر آئی زیادہ تر پنجابی خواتین تھیں۔ ہاں گجرات کی ایک صاحبہ بالکل گجراتی لباس میں دلھن بن کر آئی تھیں۔...... سیمنار کا ہنگامہ ختم ہوا تو چوتھے دن واپسی ہوئی اتفاق سے سفر میں لاہوٹی کا ساتھ ہوگیا۔

مخدوم کے ویانا سے واپس آنے پر پٹی کی جو ورکنگ کمیٹی چنی گئی تھی اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ مخدوم سکریٹری ہوئے اور پھر باقاعدہ آفس میٹنگیں، بحث مباحث ہونے لگے۔ اتنے

میں دوسرا الکشن قریب آ گیا۔ اختر اس میں کھڑے ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس وقت تک آندھرا پردیش کی تاسیس عمل میں آ چکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اب سارا کام تلگو میں ہوگا۔ مگر راج بہادر گوڑ کے اصرار پر آمادہ ہو گئے۔ مخدوم کو میدک سے ایم پی کے لیے کھڑا کیا گیا۔ اختر کے لیے میں زیادہ کام نہ کر سکی۔ مخدوم نے میدک میں بلایا تو ادھر چلی گئی۔ الکشن ہوا اور دونوں حضرات ناکام ہو گئے۔ الکشن کے دوران کوئی صاحب اختر کے پاس آفر لے کے آئے کہ فی کس ایک روپے کے حساب سے پانچ سو روپے دیں تو اتنے ہی ووٹ دلا سکتے ہیں۔ اختر کو بہت غصہ آ گیا انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر رخصت کر دیا۔ اختر تقریباً ساڑھے چار یا پانچ سو ووٹوں سے ہارے تھے۔ ...... ان کے اور میرے نزدیک یہ ہار پانچ سو دے کے جیتنے کے مقابل میں زیادہ بہتر تھی۔ اختر کو کوارٹر چھوڑنا پڑا۔ میرے اور رابعہ کے بیچ کا مکان خالی تھا وہ اس میں آ گئے۔ مخدوم نے اورینٹ ہوٹل کے بازو اردو گلی میں ایک کرائے پر لیا تھا۔ اردو گلی کا یہ مکان بہت چھوٹا تھا۔ سامنے ایک پتلا سا دالان اس کے پیچھے اندھیرا سا کمرا۔ دالان کے بازو ایک چھوٹا سا کمرا۔ یہ تھا مخدوم کا کمرہ۔ ایک پلنگ چھوٹا سا میز اور کرسی۔ اس زمانے میں انھیں فلم انڈسٹری سے کچھ کام کا پیش کش ہوا۔ ایک گانا ریکارڈ بھی ہوا تھا (جو ایک بار مجھے سنایا بھی تھا) شرط وہیں قیام کی جسے انھوں نے نامنظور کر دیا۔ اس کام کے بعد ہی گلی کے اختتام پر اختر کے پرانے دوست وکیل یونس سلیم کا مکان تھا ان کی بیوی ہماری عزیز ہوتی ہیں اس کا مجھے علم تو نہ تھا۔ انھوں نے خود ہی بتایا کہ ہماری تو بہت قریب کی رشتہ داری ہے۔ پہلے تو رضا کاروں کی طرف جھکاؤ رہا تھا میں مخدوم کے پاس جاتی تو برائے نام ملا کرتیں اب کے بہت تپاک سے ملیں۔ مخدوم کے مالک مکان کا گھر ملا ہوا ہی تھا ان کی اکلوتی لڑکی نصیرہ غالباً نصرت کو پسند آ گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد مخدوم لجسلیٹیو کونسل کے ممبر چنے گئے۔ تو پھر سے انھیں کوارٹر مل گیا لیکن اس مرتبہ بہت چھوٹا...... بڑا کوئی خالی نہ تھا۔

عصمت چغتائی کے تعلق سے ایک بات یاد آگئی۔ پہلے الکشن میں وہ آٹھ دس دن یہاں آکر اختر کے ساتھ ہنگامے میں گھوم چکی تھیں ایک دو دن واپسی پر جب ہمارے یہاں رہیں تو آدھی رات تک رمی (پتے) کھیلتی رہیں۔ اس کھیل میں وہ اتنی محو ہو جاتیں کہ کچھ اور یاد نہ رہتا ایک دفعہ میں اور امی، ذکیہ کے پاس بمبئی گئے ہوئے تھے انھوں نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ ساتھ کھیلنے والے شاید کوئی مل گئے۔ اب وہ کھیل میں اس قدر گم ہوگئیں کہ انھیں یاد نہ رہا کہ کس کو کھانے پر بلایا ہے۔ غرض تھیں بڑی دل چسپ خاتون۔ ہمارے یہاں دو تین وقت آکر رہیں۔ انھوں نے انجمن کے ممبروں کو بھی ایک مرتبہ مخاطب کیا تھا۔ ہمارے ممبروں کو مخاطب کرنے والوں میں ایسی کتنی ہی صاحب قلم خواتین رضیہ سجاد، ظہیر صاحبہ، سرلا شرما، سروجنی نائیڈو کی بڑی بہن رینوکا دیوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

الکشن کے ختم ہونے پر بائی الکشنوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو بس وہ بھی کافی دنوں تک چلتا رہا۔ محبوب نگر ، اوماپور، کرنول اور کئی مقامات پر اس سلسلے میں، میں مخدوم کے ساتھ جانا ہوا۔ کرنول میں ایک وکیل صاحب کے گھر میں سب کو ٹھیرایا گیا تھا یہاں دو دن قیام رہا۔ گرمی کا موسم پتھروں کی چھت کے مکان اور حد درجہ گرمی۔ وہاں کے خربوزہ بھی کھانے کو ملے بہت میٹھے۔ دوسرے دن وہاں کا ایک مندر دیکھنے گئے اس میں ایک بیل کے مجسمے کے بارے میں مخدوم نے بتایا کہ یہ بڑا نادر مجسمہ ہے مندر کے دامن میں کرشنا بہہ رہی تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ دریا کے کنارے دیر تک پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی رہوں۔ واپسی پر امرچنتہ اسٹیشن سے گذر ہوا۔ جی تو چاہا کہ پرانے مکان اور دادی لٹاں کی قبر جا کر دیکھوں شاید خواہش کا اظہار کرتی تو کچھ دیر کے لیے وہاں توقف ہو بھی جاتا۔ مگر یہ ڈر کہ انکار کا جواب نہ ملے ہمیشہ آڑے آجاتا۔ شاید اسی لیے کبھی کسی سے کسی خواہش کا اظہار نہ کرسکی۔

فیڈریشن رجسٹر ہو چکی تھی۔ اس کے ڈیلیگیشن آدھے کرائے پر سفر کرسکتے تھے۔ اب کی بار کانفرنس بنارس میں طے پائی۔ ہمارا وفد آٹھ اراکین پر مشتمل تھا اس میں امی اور مخدوم کے رشتے کی

ایک بھتیجی ذکیہ بھی تھیں جو شاید میٹرک کی ٹریننگ یا نوکری کے سلسلے میں مخدوم کے ہاں ٹھیری ہوئی تھی۔ ان کے والدین غالباً سنگا ریڈی میں رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے قریب تاج محل ٹاکیز میں کوئی فلم دیکھنے آئیں رات دیر ہونے کی وجہ سے یہیں رہ گئیں صبح اُسے میں نے امّی سے ملایا ہنس مکھ اور قبول صورت لڑکی تھی ان دنوں میرے بھائی ظفر کی شادی کے تعلق سے سوچا جارہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ لڑکی اچھی ہے امّی کو بھی پسند ہے تو اس بارے میں مخدوم سے بات کی ان کو بھی یہ خیال پسند آیا۔ کہا میں ان کے والد کو لکھتا ہوں۔ لیکن ان کے والد کو نہ جانے کیوں ہندوستانی پسند نہ تھے۔ بہت غصّے کا اظہار کرتے ہوئے لڑکی کو کسی رشتے کی پھوپھی کے پاس منتقل کرڈالا۔ جہاں ان ہی پھوپھی کے صاحب زادے سے ان کی شادی ہوگئی۔ لیکن یہ رشتہ بہت جلد ٹوٹ گیا۔ سوچتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے اپنی پسند کا ساتھی پا کر بھی............؟ تین چار ایسی مثالیں میرے سامنے تھیں کہ محبت کے نام پر ملاپ۔ اور پھر تفریق۔ غالباً یہ محبت نہیں بلکہ کچّی عمر کا ایک جذباتی اُبال ہوگا محبت قربانی چاہتی ہے محبوب کے لیے مٹ جانے کی ہمت اس کی خواہش کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے اور سب کچھ سہنے کا سلیقہ۔

چکڑ پلی میں ایک کامریڈ اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ کام کرتی تھیں انھوں نے وہاں ایک میٹنگ میں مجھے مدعو کیا۔ شام 6 بجے سے رکھی گئی تھی چلی گئی۔ حسب معمول جلسہ دیر سے شروع ہوا۔ اور رات آٹھ بجے ختم ہوا۔ مجھے راستے بھی یاد نہ رہتے یہاں اتنی دور پہلی بار جانا ہوا تھا۔ رکشے والے کے بھروسے پر لیکن اتنی رات کو سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ مخدوم نے آ کر پوچھا کہ واپسی کا کیا انتظام ہے کچھ نہیں بس رکشا لے لوں گی۔ کہا ساتھ چلتے ہیں۔ اور خود ہی جا کر رکشا لے آئے۔ اب رکشا چلی جارہی ہے مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ کدھر جارہی ہے چاندنی رات تھی تھوڑی دیر بعد ایک میدان میں پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کبھی چائے خانہ ہوا کرتا تھا ہم قرض کی چائے پیا کرتے تھے اسی طرح کچھ اور باتیں بھی بالکل یاد نہیں کہ میں نے کیا بات کہی جس کے جواب میں ہنس کر کہا کہ کیا آپ چاہتی

تھیں کہ میں یہاں نماز پڑھتا رہتا۔ غرض یوں ہی کچھ دیر گھومتے رہے۔ اس دوران میں نے اپنی لوزان کے اڈونچر کا ذکر بھی کیا نو بجنے ہی کو تھے کہا کہ کیا صفیہ نے دعوت رکھی ہے اپنے بی اے پاس ہونے کی خوشی میں۔ اب چلنا چاہیے۔ پندرہ منٹ بعد ہم وہاں پہنچے مجھ سے اترنے کو کہا۔ میں نے معذرت کی۔ رکشے والے کو ٹھیک پتہ بتایا اور کرایہ دے کر روانہ کیا۔ کتنا کہا کہ گھر پہنچ کر کرایہ دوں گی۔

ظفر کے لیے لڑکی تلاش کی جا رہی تھی ایک کوئی دتی کا گھرانہ تھا ان کے دو لڑکے ایک لڑکی۔ لڑکی کا نام نوشابہ۔ زیادہ تر سارے رشتہ دار میرٹھ اور مظفر نگر وغیرہ میں رہتے تھے۔ والد کسی ضلع سے پولیس ایکشن میں تباہی کے بعد شہر حیدر آباد آ گئے تھے۔ یہ صاحبہ بی اے کر چکی تھیں بات طے ہو گئی۔ لین دین کا کبھی سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ بہت سادگی سے شادی ہو گئی۔ ظفر کو سینس (Census) آفس میں نوکری مل گئی تھی اتفاق کی بات جس دن ظفر کی شادی تھی اسی دن مخدوم کی ان بھتیجی ذکیہ کی شادی بھی مقرر تھی۔ مخدوم وہاں چلے گئے۔ اس لیے ہمارے پاس نہ آ سکے۔ انور کی شادی اس کی پسند سے ہوئی تھی دوبارہ کام شروع کرنے سے پہلے انھوں نے انٹر کی ایک لڑکی کا ٹیوشن کیا تھا اور وہ انھیں پسند آ گئی۔ میرے ہاں عورتوں کے جو جلسے ہوتے رہتے تھے۔ اس میں بلوایا تاکہ ان کے بارے میں ہم لوگ کچھ جان سکیں۔ ان کے والد شاید عرب سے آئے تھے یہاں کچھ کاروبار کر رہے تھے۔ ملے پلی سے قریب بڑا ذاتی مکان تھا پاکستان جانے کے خیال سے سب کچھ بیچ ڈالا۔ بڑے صاحب زادے کو اخبار نکالنے کا شوق ہوا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ساری جمع شدہ رقم اخبار کی نذر ہو گئی۔ آٹھ، نو بہن بھائی تھے۔ ان دنوں انور جب پڑھانے جاتے تو ایک چھوٹے سے گھر میں مقیم تھے۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ ان سے چھوٹی فاطمہ یاسمین پڑھنے کا شوق رکھتی تھی۔ عمر سترہ اٹھارہ برس کے آس پاس۔ اچھی تو لگی مگر عمر کا فرق زیادہ۔ لیکن ان کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ حسب معمول یہ کام انجام پا گیا۔ یاسمین نے شادی کے بعد بی اے کیا۔ کچھ دنوں بعد کسی آفس میں ملازمت مل گئی۔ ان کو

یہ نوکری پسند نہ تھی۔ بعد میں اسکول میں ٹیچر بن گئیں۔ تین چار سال بعد انھیں ایک لڑکی ہوئی جس کا نام انور نے صبوحی رکھا۔ ہم پانچ بھائی اور چار بہنیں سب میں بڑی میں۔ رضیہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی لیکن نہ جانے کیوں مجھے شروع ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے۔ تھوڑا تھوڑا سبق پڑھنا مجھے کبھی اچھا نہ لگا۔ کھانے پکانے میں بھی کوئی دل چسپی نہ تھی۔ صبح دیر سے اٹھتی۔ دست کاری وغیرہ سیکھنے کی شوقین تھی۔ سلائی کا تقریباً سارا کام میرے ہی ذمے تھا۔ کارچوب، کامدانی، کروشیا، ایمبرائیڈری وغیرہ کے ساتھ ساتھ لمباڑوں سے شیشے ٹانکنا، بوریے بننا، سیندھی کے پتوں سے پنکھے بنانا سب کچھ سیکھا۔ حتی کہ جب پھوپھی اماں نے شوقیہ شطرنجیاں بنانا وغیرہ سیکھیں تو ان کے ساتھ کرگھے پر بیٹھ کر یہ چیزیں تک بُنیں۔ پھر بھی میں بے وقوف، پھوہڑ، فضول خرچ بدشکل اور نہ جانے کیا کیا سمجھی جاتی تھی۔ اور ہر وقت رضیہ سے تقابل رہتا۔ میں ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرتی لیکن شاید غیر شعوری طور پر میرے اندر کچھ احساس کمتری ضرور پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میں بہت سی باتوں میں جھجھکتی رہتی۔ اور نقصان بھی بہت اُٹھایا۔ زندگی کی بہت ساری خوشیاں کھودیں۔ یاد آ رہا ہے کہ حضور نگر میں الکشن کے زمانے میں ایک میٹنگ کو مخاطب کرنے کے لئے بہت اصرار کیا گیا تھا۔ لیکن میں کسی طرح تیار نہ ہوئی اور یوں لگا کہ یہ بات مخدوم کو کچھ اچھی نہ لگی۔ چناں چہ وہاں سے واپسی کے بعد چند مزدور یونینوں نے جب پرتاپ گیرجی کی کوٹھی میں ان کی کامیابی کی خوشی میں میری صدارت میں میٹنگ رکھی تو شش و پنج میں پڑ گئی اور بہت مشکل سے اس کام کے لیے خود کو آمادہ کر سکی۔ میٹنگ شام پانچ بجے سے تھی ختم ہونے تک متواتر ذہنی تناؤ رہا۔ رفتہ رفتہ وجئے واڑہ گنٹور وغیرہ کے بائی الکشنوں میں مخدوم اور مقامی معزز لوگوں کے ساتھ حصہ لینے سے احساس کمتری میں کمی تو ہوئی لیکن مستقلاً نہیں جس کا احساس تب تو نہیں ہوا لیکن بہت کچھ کھودینے کے بعد اب زیادہ ہونے لگا ہے۔ نہ جانے یہ غیر متعلق باتیں یہاں کیوں لکھ ڈالیں۔

اُن ہی دنوں قریب ہی لکڑی کے پل پر ایک ملگی کرائے پر لے کر ڈرائی کلیننگ اور رفو وغیرہ کا کام شروع کیا گیا۔ خیال تھا کہ بعد میں یہاں کوآپریٹیو کا تیار مال بھی رکھا جاسکتا ہے۔ جگہ اچھی تھی نام "سب رنگ" رکھا گیا۔ ایک کامریڈ کو جو خود کو اس کام کے ماہر بتاتے تھے انچارج بنایا اور قمر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ میرا یہ بھائی بظاہر کافی صحت مند لگتا تھا لیکن ادھر کچھ عرصے سے ایسا لگا کہ اس کی غذا کم ہوتی جارہی ہے۔ اور رنگ بھی پیلا پڑتا جارہا ہے۔ قریب ہی کسی ڈاکٹر کو دکھایا تو انھوں نے کہا کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہے۔ مگر جب غذا بہت ہی کم ہوگئی ڈاکٹر منان صاحب کو دکھایا انھوں نے کہا تو کچھ نہیں مگر فکر مند ضرور نظر آئے۔ تاہم اطمینان دلایا مگر یہ دلاسے کی بات تھی اسے بلڈ کینسر تھا۔ منان صاحب نے بڑی توجہ سے علاج کیا اور دو تین دفعہ دیکھنے آئے۔ مگر اس موذی مرض نے مہلت ہی کہاں دی۔ اور چند ہفتوں کے اندر ہی سب سے چھوٹا سب سے پہلے چلا گیا۔ ابّا اسے بہت چاہتے تھے۔ ابھی چند دنوں پہلے تو کیسے بھاگ کر بائیس مارچ کو ہونے والی شہلا کی دعوتِ سال گرہ کا انتظام کر رہا تھا۔ اسے ایسے کاموں میں بڑی دل چسپی تھی پڑھائی کا شوق نہ تھا۔ انجمن کے کاموں میں کافی دل چسپی لیتا اور وقت دیا کرتا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ موت اور زندگی کا یہ چکر سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ بقول حافظ کے : کہ کس نکشود، ونکشاید حکمت ایں معمارا۔

میں تو کئی دن تک سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں

زندگی اپنی چال چلتی رہتی ہے۔ اس کے کام رکتے نہیں

بس دل کے نہاں خانے میں دکھ بھری یاد باقی رہ جاتی ہیں

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھِلے مرجھا گئے

دوکان میں اب ظفر نے دل چسپی لینی شروع کی مگر ان کی اپنی نوکری بھی تھی زیادہ وقت

نہیں دے سکتے تھے۔ اُن کا مریڈ صاحب نے بہت نقصان پہنچایا۔ مسلسل خسارہ آخر کمیٹی کے فیصلے پر کچھ گڈول لے کر ایک کامریڈ موہن لعل کو دے دی۔ قمر کی جدائی کے ڈیڑھ دو سال بعد ابّا بھی داغ مفارقت دے گئے مجھے تو یاد نہیں کہ وہ کبھی بیمار پڑے بس ایک بواسیر کی شکایت تھی۔ ذرا کمزور ہو رہے تھے عمر کا تقاضہ آخری دن تک دوپہر کا کھانا ہم سب کے ساتھ کھایا رات پیٹ میں درد بتایا۔ رضیہ ناشتے کے بعد ہی دوا لینے گئی واپس آئی تو غافل تھے۔ رضیہ نے آواز دی۔ ابّا یہ دوا کھا لیجیے۔ آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ بس تیرا ہی انتظار دیکھ رہے تھے رضو کہا اور پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

تھی مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

اختر چند ماہ پہلے ہی اردو بلٹز کے ایڈیٹر بن کر بمبئی چلے گئے تھے جاتے وقت ملنے آئے تو انھیں دعا دے کر رخصت کیا اور کہا اب شاید تم سے پھر ملنا نہ ہو سکے۔ کیا جانے والوں کو پہلے ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اختر اور ذکیہ شام کے جہاز سے آئے ان کے آخری دیدار کے بعد ہی تدفین عمل میں آئی۔ یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں۔ بڑی غیر معمولی شخصیت تھی میرے ابّا کی۔ چند سال پہلے چھوٹے چچا اور چچی کے ساتھ حج بھی کر آئے تھے مگر آب زم زم نہیں لائے، کہنے لگے وہاں تھوڑی سی جگہ میں سینکڑوں لوگ نہاتے دھوتے رہتے ہیں وہ پانی صاف کیسے ہو سکتا ہے۔ نماز، روزوں کے پابند مگر کبھی دوسرے مذہب کے لوگوں کی برائی نہیں کی۔ حسرت چچا کی طرح درویشانہ مزاج کے حامل روپے پیسے کی ملکیت کی نہ کبھی فکر کی اور نہ خواہش۔ موہان میں چچا اور ان کے لڑکے کے انتقال کے بعد زمین، باغ وغیرہ کے حق دار چھ اصحاب تھے چھوٹے چچا نے قیمت کا اندازہ لگا کر جو رقم بھیجی تھی اس پر بعض کو اعتراض ہوا لیکن ابّا نے کچھ نہ کہا۔ ہاں اس رقم سے حج کر لیا۔ اختر نے

اپنی یادداشتوں میں جو لکھا ہے کہ انھوں نے حسرتؔ چچا کے ٹکٹ پر حج کیا تھا غلط ہے ابیؔ کے حج پر جاتے وقت حسرتؔ چچا حیات بھی نہ تھے۔ ہاں پھوپھی امّاں اور چچی امّاں اسی طرح گئی تھیں۔ واپسی پر یہ دونوں کئی دن ہمارے پاس رہے۔ چھوٹی چچی کے سینے پر ایک پھنسی ہو گئی تھی جو رفتہ رفتہ بڑھنے لگی تھی اس پر مکئے کی مٹی لگاتی رہیں یہاں تشخیص کروائی تو پتہ چلا کینسر ہے۔ یہ دونوں موہان لوٹ گئے۔ چند مہینوں بعد چھوٹی چچی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد چھوٹے چچا سب بیچ کر حیدرآباد چلے آئے۔ اور زیادہ تر نسیم کے ساتھ رہنے لگے۔ ہمارے پاس بھی کئی کئی ہفتے رہے وہ بچپن ہی سے ہمارے ساتھ رہتے آئے تھے۔ آخر آخر میں چند دنوں سے موہان جا کر رہنے لگے تھے۔

رضیہ ابیؔ کی زندگی ہی میں تہران (ایران) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے آئیں تھیں۔ 1977ء سے یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پروفیسر اور صدر شعبہ ہو گئی تھیں۔ گھر کے خرچ کی ذمہ داری ملازمت کی شروعات ہی سے وہی اٹھائے جا رہی تھیں۔ ابیؔ کو اس کا اور اس کے گھر نہ بسنے کا بھی بڑا رنج تھا اس کی تنہائی کا احساس تو مجھے بھی۔ مگر چارہ ہی کیا ایک ذہن اور معیار بن جائے اور اس پیمانے پر کوئی نہ ملے یا مل بھی جائے اور نا قابلِ حصول ہو تو کیا کیا جائے......!؟ موجودہ سماج اور حالات بدل جائیں تو شاید کوئی حل نکل آئے۔ مگر پھر بھی...... انسانی قدروں، ذمہ داریوں اور مجبوریوں کا احساس۔ شاید یہی احساسات زندگی کے ضامن بن جاتے ہیں۔

بہر حال سوسائٹی اور پارٹی کا کام چلتا ہی رہا۔ ان ہی دنوں ایک دن مہیندرا کا فون آیا کہ آپ کو کھمم چلنا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہاں پارٹی کی صوبائی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ اس کام کے لیے یہاں کے نمائندے بھی چنے گئے تھے لیکن میرا نام ان میں شامل نہ تھا۔ کیوں جانا ہے یہ پوچھا تو کہنے لگے مخدومؔ نے آپ کو خاص طور پر بھیجنے کو لکھا ہے۔ تیار ہو جائیے۔ چار دن کی اس کانفرنس میں ایک خاتون کی تقریر مجھے بڑی حقیقت پسندانہ لگی۔ انھوں نے بہت ہی کھل کر باتیں کی

تھیں۔ مذہبی رجحان کی بڑھتی ہوئی تفریق پسندی سے خبردار کیا تھا۔ بحیثیت مجموعی کانفرنس ٹھیک رہی۔
ادھر چند دنوں سے مخدوم دلی میں رہ رہے تھے۔ یہاں کمیٹی سکریٹری راج تھے۔ مجھے کچھ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ راج اور مہیندرا میں کچھ عدم اتفاق ہے جو ان دونوں کی طبیعت کا تقاضہ تھا۔ راج سنجیدہ موضوع میں بھی کچھ نہ کچھ مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے اور مہیندرا بے حد سنجیدہ۔ غرض جیسا اتفاقِ رائے ہونا چاہیے تھا نہیں تھا۔ ان ہی دنوں بنے بھائی (سجاد ظہیر) یہاں آئے۔ وہ جب بھی آتے ہم سے ملنے ضرور چلے آتے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے کچھ پارٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے ان پر اپنے خدشات ظاہر کر دیے۔ اور کہا مخدوم کی موجودگی میں قیادت کا کام اچھی طرح چلتا ہے۔ بہر حال میرے کہنے کا ردِ عمل تھا یا کچھ اور۔ چند دنوں بعد مخدوم پھر سے یہاں آگئے۔

بھیمڑی کانفرنس کے بعد سے پارٹی میں کٹر پن بڑھتا جا رہا تھا ایک زمانہ تھا جب ابتداء میں تائی ہم سے ملتی تھیں اور دو تین ملاقاتوں کے بعد ہی انھوں نے ہم پر اتنا بھروسا کیا کہ جیسے ہم پرانے پارٹی ممبر ہوں۔ اور اب پرانے پارٹی ممبروں کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اگر کوئی اپنے بچے کی سالگرہ کر لیتا یا اچھے کپڑوں میں نظر آنے لگتا تو فوراً یہ رائے قائم کر لی جاتی کہ انھیں امریکی امداد مل رہی ہے اس غلط قسم کی سوچ نے کتنوں کو بددِل کر دیا۔ چند دنوں بعد سٹی کمیٹی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ بھائی ظفر نے ایک دن کہا۔ میرا خیال ہے کہ اس بار آپ کا نام نہیں آئے گا۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا میں خود بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ کیوں کہ سوائے یہ کہ کورم پورا کروں اور کچھ کر بھی نہیں کرتی تھی۔ عورتوں کے مسائل کبھی زیرِ بحث نہیں آئے۔ مزدوروں سے میرا کوئی راست تعلق نہ تھا۔ کمیٹی میں دو نئے ناموں کے علاوہ بھی نام پرانے تھے۔ ان دو نئے ناموں میں ایک بہت غلط قسم کے آدمی کا نام تھا۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔ دوسروں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب ان کے تعلق سے سب ہی کا خیال یہی

تھا تو یہ نام شامل کیوں کیا گیا۔ اب کسی اور کا نام سوچا جا رہا تھا کہ مخدوؔم نے میرا نام لے لیا۔ اور سب نے اس کی تائید کر دی۔ یہ سب اتنا غیر متوقع اور تیزی سے ہوا کہ میں کچھ کہہ نہ سکی مخدوؔم اُٹھ کر چلے گئے۔ بعد میں، میں نے مہیندر را سے کہا کہ میں یہ ذمہ داری لینا نہیں چاہتی۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مخدوؔم نے کہہ دیا ہے بس۔ میں سوچنے لگی کیا واقعی لوگ مخدوؔم کو اس قدر مانتے ہیں۔ وہ جو کہیں آمنّا و صدّقنا ہو گیا۔

غلّہ اور خاص کر چاولوں کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ خبریں تھیں کہ قیمتیں اور بڑھنے والی ہیں۔ اس پر معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں مخدوؔم بھوک ہڑتال کرنے والے ہیں۔ ایک میٹنگ سکریٹریٹ کے سامنے رکھی گئی تھی۔ میں وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ہڑتال کی ساری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ سکریٹریٹ کے سامنے دوسری طرف ایک کھلی جگہ میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک تخت پر اور نیچے فرش پر کچھ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ۔ دن میں ساتھ رہنے اور دیکھ بھال کرنے کے لیے کامریڈ ظہیر کا نام اور رات میں دو تین کامریڈ کے نام کا اعلان ہوا۔ یہ میٹنگ اعلان کے لیے تھی تصفیہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی رزاق کے ہاتھوں پلنگ بستر اور کچھ ضروری چیزیں روانہ کر دیں۔ ماہ اکتوبر کا آخری دہا چل رہا تھا۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں ساڑھے دس بجے وہاں پہنچی۔ مخدوؔم مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے ظہیر آپ بچوں کے لیے پریشان ہو رہی تھیں اب چلی جایئے۔ انھوں نے یہ بات کسی خاتون سے مخاطب ہو کر کہی تھی وہ چلی گئیں اور میرا وہاں رات تک رہنا ہو گیا۔ دوسرے دن میں جلد ہی پہنچ گئی کہ نہ جانے وہ کب آئیں۔ ہڑتال چودہ دنوں تک جاری رہی اس دوران وہ بالکل نظر نہیں آئیں۔ ہر وقت آنے جانے والے اور ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ خیمہ کے سامنے سڑک پر پچاسوں لوگ جمع، ہمدردی میں بارہ گھنٹوں کی بھوک ہڑتال کرنے والے بھی کئی کامریڈ موجود تھے۔ آدھے آدھے گھنٹے سے لیموں کا شربت دینے کی ہدایت تھی۔ بس اتنی ہی ذمہ

داری تھی میری۔ رات نو دس بجے کے قریب واپسی ہوتی۔ دسویں دن راج بہادر گوڑ کی قیادت میں جلوس نکلا پولیس نے روکا۔ راج گرفتار کر لیے گئے۔ خیال تھا کہ شاید مخدومؔ بھی گرفتار کر لیے جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے دن شام ہی سے غیر موسمی بارش ہونے لگی اتفاق سے پاس ہی میں ایک خالی کمرہ دستیاب ہو گیا۔ اس میں منتقل ہو گئے۔ بارش ہے کہ ہوتی رہی واپسی کے امکانات موہوم برج رانی اور دوسرے کامریڈ فرش پر سو گئے۔ مخدومؔ بھی شاید کمزوری کی وجہ سے سو گئے تھے میں وہاں ایک کرسی پر بیٹھی رہی۔ کوئی چار بجے رات کے قریب بارش تھمی بہت سویرے ابھی سب سو ہی رہے تھے کہ میں باہر سڑک پر نکل آئی۔ جہاں ٹخنوں برابر پانی بہہ رہا تھا۔ کچھ دور فٹ پاتھ پر کھڑی ہو گئی۔ سویرا ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک رکشا آتا نظر آیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پتہ چلا کہ رکشا مخالف سمت جا رہا ہے۔ خیر......گھر پہنچ گئی۔

کافی وقت تھا نہا دھو کر تیار ہو گئی۔ غالباً تیرہویں یا چودہویں روز چیف منسٹر برہما نند ریڈی صاحب سے کچھ سمجھوتہ ہوا۔ اور مغرب کے بعد مشروب پلا کر برت تڑوایا گیا۔ اس وقت وہاں اختر اور یونس سلیم موجود تھے۔ یونس سلیم نے داڑھی رکھ لی تھی پہچان نہ سکی۔ اختر نے بتایا تو پتہ چلا۔ غالباً ہڑتال کے آغاز کے وقت ہی ہسپتال میں رکھنے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ مخدومؔ کے ساتھ ہسپتال میں برج رانی رہیں گی۔۔۔۔ انھیں دس بجے رات کے قریب وہاں لے جایا گیا۔

۔۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب میں ہسپتال کمرے میں برج رانی کے علاوہ سیاست کے ایڈیٹر عابد علی خان صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ باجی آگئی ہیں اب آپ چلی جائیے، عابد صاحب نے رانی سے کہا۔ وہ عابد علی خان صاحب کے ساتھ چلی گئیں۔ مخدوم کو گلوکوز چڑھایا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راج وہاں پہنچ گئے۔ مخدومؔ نے آہستہ سے ان سے کچھ بات کی۔ پھر کچھ دیر ٹھہر کر راج بھی چلے گئے۔ تین بجے کے قریب مخدومؔ کو شدید جاڑا ہونے لگا۔ بہت کچھ اُڑھانے کے باوجود کپکپی نہ گئی۔

رفتہ رفتہ جاڑا کم ہونے لگا تو مخدوم کی آنکھ لگ گئی۔ چار بجے اساوری، ان کے بچے، ان کی والدہ بھی آ گئے۔ گھنٹہ بھر بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے۔ اتنی دیر تک میں گھر نہ پہنچی تو جاوید اور رزاق چلے آئے۔ میں نے ان سے کچھ ضروری چیزیں منگوائیں۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے ہلکی غذا دینے کی ہدایت کر دی۔ برج رانی واپس نہیں آئیں۔ البتہ ساڑھے آٹھ کے قریب نصرت آ گئے۔ اور دوسرے دن سے وہ رات کھانا لے کر آ جایا کرتا۔ رات یہیں گذارتا۔ پراٹھے خوب مرچ کا سالن کھانے میں ہوتا۔ .... دوسرے دن سویرے رزاق آئے میں نے ان سے کچھ کو لانے کے لیے کہا جب رات کو دیکھا تو چھولے مٹوے نکلے۔ مخدوم بے ساختہ ہنس پڑے۔ وہ صرف ایک دن بستر پر رہے دوسرے روز سے اپنا سارا کام خود ہی کر لیا کرتے۔ چائے ناشتہ بنا دینا میرا کام تھا۔ رزاق کی ایک اور کارکردگی سنیے۔ ایک دن مخدوم نے کہا کہ نہ جانے کیوں خوشبودار پان کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اسی دن جاوید آئے بتایا کہ موہان سے چھوٹے چچا آئے ہوئے ہیں۔ وہ جب بھی وہاں سے آتے پان ضرور لے آتے تو میں نے رزاق سے کہا ان سے پان لے کر دو تین بیڑے بنوا کر لانا۔ وہ دوسرے دن خالی ہاتھ ہی آ گئے کہا اس دفعہ وہ پان نہیں لائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پان لائے تھے مگر رزاق کو کچھ اپنی علمیت جتانے کی سوجھی کہ ان سے پوچھا آپ ہمیشہ جو چیز لایا کرتے تھے اب کے نہیں لائے؟ موہان کے بیڑے بہت مشہور تھے ہم سب کو اچھے لگتے تھے۔ رزاق کے جانے کے بعد ایک صاحبہ ملنے آئیں مجھ سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ یہ آپا جان ہیں۔ ان کے بارے میں، میں زیادہ تو کچھ جانتی نہیں تھی مگر اتنا معلوم تھا کہ ریڈیو کے ظفر الحسن صاحب کی بہن ہیں جو عموماً آپا جان کہلاتی تھیں۔ انھوں نے باتیں شروع کیں کہنے لگیں میں تمھیں دیکھنے آنا چاہتی تھی مگر معلوم ہوا کہ بہت مردانہ رہتا ہے۔ اس لیے نہیں آئی۔ رابعہ کے پاس چلی گئی۔ تم دوسری کر لیے بول کے بہت روئی تھی میں نے سمجھایا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اسلام میں تو چار تک جائز ہیں۔ مجھے تعجب

اور کچھ غصہ بھی آیا کہ یہ باتیں ہسپتال میں مریض سے کرنے کی ہیں۔؟؟ مگر مخدوم خاموشی سے مسکراتے ہوئے سنتے رہے۔ شاید موضوع بدلنے کی خاطر ان سے کہا آپا جان کل سے یو پی کا خوشبودار پان کھانے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ جاتے وقت مجھ سے مخاطب ہوئیں۔اصل کام تو آپ کر رہی ہیں۔ ہم تو بس نام کی آپا ہیں۔ معلوم ہوا کہ اقبال متین کی بیوی بھی اسی ہسپتال میں شریک ہیں۔ دوسرے تیسرے دن انہیں دیکھنے چلی جاتی۔ ایک دن انہوں نے یہ کہا کہ فلاں صاحب (نام نہیں بتایا) آپ کے یہاں رہنے پر بہت معترض ہیں۔ اختر صاحب نے جو مضمون لکھا ہے اس میں جس طرح سے آپ کا تذکرہ ہے اس پر بھی ان صاحب کو بہت اعتراض ہے۔ میں نے نام معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اختر کا یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔ سیاست میں چھپا تھا۔ اخبار روز ہی پڑھتی تھی مگر عجیب اتفاق کہ اس روز ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی مخدوم نے اس میں شرکت کرنے کو کہا تو چلی گئی اور جب لوٹی تو اخبار نہیں ملا۔ یوں اندازہ تھا کہ ایسی ویسی باتیں ہوں گی ضرور مگر یہاں ان فضول باتوں کی پرواہ کسے تھی۔ رات میں نصرت آجاتا۔ وقت گذاری کے لئے شطرنج کھیلی جاتی شطرنج' میں نے ابّا سے سیکھی تھی۔ کوئی خاص مشق نہیں تھی۔ بس بیٹھی دیکھتی رہی۔ کبھی نصرت کو کوئی چال بتا دیتی ایک دن مجھ سے کہا کہ آیئے ایک بازی ہو جائے میں جیت گئی نہ جانے کیسے۔ اختر، رضیہ، رابعہ اور دوسرے بھی بھائی بہن دو تین بار آئے تھے۔ یہ سارے دن مخدوم کے ساتھ گذرے مجھے بہت قریب سے ان کی طبیعت کو جاننے کا موقعہ ملا...... ایک رات بازو کے کمرے سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں تو وہ بے چین ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد رہا نہ گیا خود چلے گئے اور دیر تک ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے انھیں تسلی دیتے رہے۔ واپس آکر بتایا کہ کتنا دل دکھانے والا واقعہ تھا۔ نصرت تو کھانے کے بعد ہی سو گیا اور وہ بھی لیٹ گئے۔ مجھے نیند نہ آئی اٹھ کر چپکے سے بالکونی میں جا کھڑی ہوئی وہاں سے باہر چمن کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ ذہن موت وحیات

کے گورکھ دھندوں میں الجھا ہوا تھا۔ بے پناہ خیالات کا ہجوم۔ وقت کا کچھ اندازہ ہی نہ ہوا۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔ مخدوم نے قریب آ کر آہستہ سے کہا رات بہت ہوگئی سو جایئے .... تو کیا وہ بھی نہیں سوئے تھے ....؟؟ آٹھویں یا نویں دن ہم نے ہسپتال کو خیر باد کہہ دیا۔ مجھے میرے گھر چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے۔

ان کے جشن کی تیاریاں بہت زوروں پر تھیں اس جشن کے تعلق سے تفصیلات کے لیے ماہ نامہ صبا کا خاص نمبر دیکھیے۔ عجیب سا جوش اور حُسنِ عقیدت کو بیان نہیں کر سکتی۔

گھر پہنچی تو خبریں ملیں۔ رابعہ بنجارا ہلز کے اپنے نئے گھر میں منتقل ہوگئی ہیں۔ ہماری ٹیچر بدرالنساء جو علیل تھیں صحت یاب ہوگئیں۔ اور یہ کہ کوآپریٹیو کا بہت سارا کام رکا ہوا ہے۔ جاوید کی اکلوتی تایا زاد بہن بہت بیمار ہیں۔ ان کے بھائی نے کسی بھی قسم کی امداد سے انکار کر دیا ہے اور پالی ہوئی ایک لڑکی جو سنا کہ ان کے شوہر کی دوسری بیوی سے ہوئی تھی ماں کے مرنے کے بعد ان کے پاس لا کر رکھا گیا تھا اس کی شادی بھی طے ہوگئی ہے۔ یہ صاحبہ خود فالج کی مریضہ تھیں۔ ایک دیور کبھی کبھی آ کر خبر لیا کرتے تھے۔ میں کسی طرح وقت نکال کر جانے لگی۔ ان کا مکان بہت دور نہ تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ لڑکی کی شادی کسی طرح ان کی زندگی میں ہو جائے۔ اور یہ بھی کہ مکان لڑکی کے نام پر منتقل ہو جائے۔ منوہر راج سکسینہ صاحب وکیل سے مل کر ان کی لڑکی سعیدہ کے نام باقاعدہ رجسٹری کروا دی۔ منوہر راج سکسینہ صاحب نے مجھ سے فیس بھی نہیں لی۔ سارا کام بغیر کسی معاوضے کے کر دیا۔ اصرار کرنے پر بھی کچھ نہ لیا...... اس کے بعد شادی اس شرط پر ہوئی کہ لڑکی ماں کی زندگی تک ان کے ساتھ رہے گی۔ چند ہی ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ بھائی بھاوج وغیرہ بہن کے مرنے پر بھی نہ آئے۔ البتہ لڑکی کے سسرال کے سب لوگ اسی مکان پر منتقل ہو گئے۔ لڑکی بے حد نیک اور شریف تھی۔ اس نے ماں کا بہت خیال رکھا۔ میرے پاس آ کر کچھ سلائی وغیرہ کام بھی سیکھا۔ کافی عرصے بعد جب

دوسرے لوگ مکان سے چلے گئے تو اپنے یہاں ہمارے ٹریننگ سنٹر کی شاخ بھی کھولی۔ ہفتہ میں ایک دن میں خود جاتی، دیکھ بھال اور تربیت کا کام سعیدہ کے ذمے تھا۔ ایک اور ٹیچر کو بھی رکھا تھا۔ فنڈز کی کمی کی وجہ سے تین چار سال بعد اس شاخ کو بند کرنا پڑا۔ ان کاموں کے ساتھ بعض اوقات بہت عجیب مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دن ایک صاحبہ آئیں کہنے لگیں مخدوم صاحب کے پاس گئی تھی اور انھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا جب تفصیل سے ان کی آنے کی غرض وغایت پوچھی تو پتہ چلا کہ کسی ڈاکٹر نے کچھ غلط علاج کر دیا جس کی انھیں شکایت تھی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ان کو مطمئن کر دیا۔ ایک دن ایک صاحبہ پندرہ سولہ سال کی لڑکی کو لے آئیں کہنے لگیں میں غریب ہوں اور یہ میری بہن یتیم لڑکی ہے۔ میرا شوہر اسے میرے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا اس لیے آپ کے ہاں لے آئی تاکہ یہاں چھوڑ دوں۔ اس سے جو چاہے کام لیجیے۔ میں نے بہت عذر کیا کہ ہم یہ ذمہ داری نہیں لے سکیں گے۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی لڑکی کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ سخت پریشانی لاحق ہوگئی کیا کروں۔ کوئی خالی جگہ بھی نہ تھی۔ ریاست خانم کی بڑی بہن لیاقت خانم ان دنوں قریب ہی رہتی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تمھارے گھر میں جگہ ہے اسے تھوڑے دنوں کے لیے رکھ لو۔ کچھ دنوں میں یہ کام سیکھ جائے تو پھر سوچتے ہیں کہ اس کا کیا کیا جائے۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ درگا بائی دیشمکھ نے یونیورسٹی کے پاس کہیں لڑکیوں کے لیے آٹھویں جماعت تک ایک اقامتی اسکول کھولا ہے۔ وہاں کئی چکروں کے بعد اسے ہاسٹل میں جگہ مل گئی۔ آٹھویں کا امتحان پاس کر لینے کے بعد کیا کریں۔ روڈا مستری صاحبہ ہاسپٹلوں میں کینٹین چلا رہی تھیں وہاں شاید نوے یا سو روپے ماہانہ تنخواہ پر نوکری مل سکتی تھی۔ کوشش کی تو اسے وہاں نوکری مل گئی۔ مگر وہ ان کی بدزبانی اور سختی کی بہت شاکی رہتی تھی۔ اس کا نام مہر تھا۔ ہوشیار لڑکی تھی اس نے کسی نوجوان سے ربط پیدا کر کے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی شادی کی تقریب کا انتظام بھی میرے سر ہو گیا تھا کیونکہ نوکری چھوڑ کر میرے پاس آ گئی تھی شادی کے

بعد بھی وہ میرے پاس برابر آتی رہی۔ تین چار بچے ہوگئے اپنا ذاتی گھر بھی بنالیا ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے ملنے آئی تھی تو بتایا کہ شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے۔ لیکن وہ اس بات سے کچھ زیادہ فکر مند نہیں لگتی تھی۔ گھر میں بچوں کو اردو اور قرآن پڑھا کر ضرورت بھر کی کرتی تھی۔ ایک صاحبہ دو بچوں کے ساتھ کسی گاؤں سے آئیں بالکل بے سہارا بتایا۔ اس وقت ہماری صدر ویمنس کالج کی لکچرار شاہ جہاں بیگم تھیں ان کے لڑکے کو انھوں نے کوشش کر کے کسی ہاسٹل میں شریک کروایا تھا۔ رہنے کے لیے بھی کچھ انتظام ہوگیا۔ کام وغیرہ سیکھ کر کچھ رقم حاصل کرنے لگی۔ بچہ پڑھنے میں ہوشیار تھا جلد ہی کچھ کام سیکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اور یہ بچوں کے ساتھ اچھی طرح رہنے لگی طاہرہ بیگم نام تھا۔

اس قسم کے کئی مسائل سے سابقہ رہا۔ میری غلطی یہ ہوتی جس کو اب محسوس کرتی ہوں کہ ہر کام کو اپنی ذمہ داری سمجھتی رہی۔ حالاں کہ یہ سب پارٹی کی طرف سے کر رہی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سارے مسائل کو پارٹی کے سامنے رکھتی اور ان کے مشورے کے بعد آگے بڑھتی۔ لیکن پارٹی نے بھی اس تعلق سے کبھی نہ پوچھا اور نہ میں نے کچھ بتایا۔ البتہ لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی میٹنگ رکھی جاتی اور مخدوم کو مدعو کیا جاتا وہ ضرور آجاتے تھے۔ تقریر کرتے، اپنی بات بتاتے، سمجھاتے اور ان کی باتیں بھی سنتے۔ مشاعرہ بھی رکھا جاتا تو یہ سوچے بنا کہ یہ عورتیں ان کا کلام کیا سمجھ پائیں گی ضرور آتے اور دیر تک کلام سناتے۔ اوپر کے کمروں اور صحن وغیرہ میں دو ڈھائی سو افراد کی گنجائش تو نکل آتی تھی۔ ایسے کئی مشاعرے ہوئے یہاں جس میں ایک ہی شاعر کو سنا جاتا رہا۔

سودیشی صنعت کے فروغ کے سلسلے میں ایک گاندھی وادی صاحب دیا سلائی بنانے کا پرچار کرتے ہوئے حیدرآباد تک پہنچے تھے۔ انھوں نے خواتین کی میٹنگ رکھی تھی میں اس میں شریک رہی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم اب تک دیا سلائی تک نہیں بنا سکتے۔ ہر چیز کے لیے باہر والوں کے محتاج ہیں اب کسی طرح دیا سلائی بنانا ہمارا فرض ہے۔ انھوں نے اس کام پر آمادہ کرنے کے لیے سرمایہ

لگانے اور تیار شدہ مال کو خود فروخت کرنے کی ذمہ داری لینے کا تقین دیا۔ ورکنگ میٹنگ میں یہ ساری
تفصیلات رکھی گئیں تو سب نے متفقہ طور پر اس یونٹ کو قائم کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس کے
لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ تاج محل ٹاکیز کے مالک کوئی نواب صاحب تھے پتہ چلا کہ ان کے مکان کے
پیچھے ایک چھوٹا سا حصہ خالی پڑا ہے۔ چندہ وغیرہ وصول کرنے کے سلسلے میں ایک بار ان سے ملاقات
کر چکی تھی اس جگہ کے لیے بطور خاص ملاقات کی۔ انھوں نے ایک دالان اور ایک کمرا کرایے پر
دے دیا۔ سکھانے کا کام بھی ہمارے ذمے نہ تھا۔ دو تین ہفتے کی تربیت سے سیکھنے والوں کو کام کی کچھ
اُجرت مل سکے گی اس امید پر ضرورت مند خواتین کافی تعداد میں آنے لگیں۔ مہینہ بھر کے اندر ہی دیا
سلائیاں تیار ہونے لگ گئیں مگر کچھ بہتر نہ ہوتی تھیں حسب وعدہ کچھ دنوں تک وہ تیار مال سنٹر والے
لیتے رہے مگر پھر یہ کہا گیا کہ فروخت کی ذمہ داری بھی ہم ہی سنبھال لیں۔ یہ بہت مشکل کام تھا کیوں
کہ باہر کے مقابلے میں یہ کام بہت ناقص لگتا تھا۔ اور دن بھر کی محنت کے بعد معاوضہ بھی کم۔ اس کام
کو سوسائٹی بمشکل ڈیڑھ دو سال جاری رکھ پائی۔ البتہ اس ضمن میں کئی نئے لوگوں سے واسطہ پڑا اور
ملنے جلنے والوں سے تعارف کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ ایک صاحبہ کافی دور سے کام کی تلاش میں آئیں
تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ حسرت چاچا کے خسر شبیر حسن صاحب کی چوتھی دکنی بیوی سے جو دو لڑکیاں
تھیں ان میں سے یہ ایک ہیں۔ ان کا نام نصیرہ تھا۔ یہ کبھی بہت اچھی خوش حال زندگی گذار چکی تھیں۔
بہت دنوں تک بچے نہ ہونے پر ایک فقیرنی کے بچے کو گود لے لیا تھا۔ بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش
کی تھی۔ دو لڑکیاں بعد میں پیدا ہوئی تھیں۔ میاں دفعتاً ختم ہو گئے۔ فقیر کا لڑکا زیور پیسہ سب لے کر
فرار ہو گیا۔ اب اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ماری ماری پھر رہی تھیں بتایا کہ شوہر کا کارخانہ
ڈاکٹر شیام سندر کے گھر کے ایک حصے میں تھا۔ ان کی ماں نے ان کا خیال کرتے ہوئے وہیں تھوڑی
سی جگہ رہنے کو دے رکھی ہے۔ اب یہاں کام کی خبر ملی تو چلی آئیں۔ بہرحال جب تک یہ کام چلتا رہا

لگی رہیں۔ اب پھر بے کار ہو گئیں۔ بعد میں روڈ امسٹری کی کینٹین میں کام مل گیا۔ بڑی لڑکی پولیو کی شکار اُس کی شادی بھی کسی سے کردی۔ وہ صاحب چند دن انھیں کے ساتھ رہے دو بچوں کو پیدا کیا پھر چھوڑ کر جانے کہاں رفو چکر ہو گئے۔ چھوٹی لڑکی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ کسی نہ کسی طرح میٹرک کرلیا۔ اس کی بھی شادی جلد ہی کردی۔ یہ تقریب ڈاکٹر شیام سندر کے گھر ہی میں ہوئی اور ان کی ماں نے انتظام ایسا کیا جیسے ان ہی کے گھر کے کسی فرد کی شادی ہو رہی ہو۔ چائے، پانی اور پھول بھی کچھ۔ ماں بہت خوش کہ لڑکی کو اچھا گھر مل گیا۔ شادی میں میں بھی شریک رہی۔ اس لڑکی کے دو بچے ہوئے بڑی لڑکی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا ہم لوگوں نے اس کی کچھ مدد بھی کی۔ بعد میں اس کے بھائی نے بھی خود کام کر کے اسے سہارا دیا۔ اس طرح اس نے ایم اے کرلیا۔ اس دوران نصیرہ تو گذر گئیں لیکن اس لڑکی کی شادی اچھے کھاتے پیتے شریف گھرانے میں ہوگئی۔

مہدی نواز جنگ کے ذریعہ سے جو امداد ملی تھی اس کے اخراجات کی آڈیٹنگ ان ہی کے مقرر کردہ آڈیٹر کے ذریعہ ہوتی۔ اور اس کام کے انچارج جانکی پرشاد صاحب تھے۔ جن کا مکان ہمارے مکان کے بالکل قریب تھا۔ یہ صاحب حیدرآباد کی ملی جلی تہذیب کے نمائندہ تھے۔ تہواروں کے ساتھ ساتھ ہماری عید برات میں بھی شریک رہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے مخلص انسان۔ آڈیٹر صاحب کے ساتھ یہ بھی آئے تھے۔ باتوں باتوں میں ان لوگوں نے ہمارے کھانوں کی تعریف کرڈالی۔ میں نے انھیں ایک دن رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ غالباً چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ رزاق کہیں گئے ہوئے تھے اور بدر بھی اپنے بھائی کے پاس گئی۔ بدر جب کچھ کمانے لگ گئی تھیں تو ان کے بھائی بھاوج ملنے جلنے لگے۔ اختر بھی شہر میں نہیں تھے۔ اب دو آدمیوں کی دعوت تھی۔ مخدوم تو آتے ہی رہتے تھے۔ پھر بھی ان سے آنے کو کہا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تین دن کے لیے کہیں باہر جا رہے ہیں۔ اسی شام کو واپس آجائیں گے۔ اور ضرور شرکت کریں گے۔ اس دن برسات کا موسم تھا کیا تھا یاد نہیں

صبح ہی سے بارش ہونے لگ گئی۔ شام ہوتے ہی پانی کی جھڑی لگ گئی۔ اصلی موٹر نشین مہمان وقت پر پہنچ گئے تھوڑی دیر تک انھیں باتوں میں لگائے رکھا مخدوم کا انتظار جو تھا۔ وعدہ کر کے نہ آنا انکا شیوہ نہ تھا مگر بارش کے تیور دیکھ کر خیال ہوا کہ نہیں آئیں گے۔ ان لوگوں کو جلدی تھی لہٰذا.................کاش دس پندرہ منٹ اور انتظار کیا ہوتا۔ کھانا شروع کر کے کوئی دس ہی منٹ ہوئے ہوں گے مخدوم آ گئے۔ اچھی محفل رہی انھوں نے ایک نظم بھی سنائی۔

ایک دن اردو ہال میں امن کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی وہیں مخدوم نے مجھے ایک صاحبہ سے ملایا۔ میٹنگ کے بعد دوسرے ہال میں کچھ چائے وغیرہ کا انتظام تھا۔ ریتا جی بھی میرے ساتھ ہی ہال سے نکلیں اور دوسرے ہال تک پہنچتے پہنچتے کچھ اتنی بے تکلف ہو گئیں کہ جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ میرا ابھی کسی سے زیادہ ربط وضبط نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ بڑی سادہ اور پرکشش شخصیت تھیں۔ معلوم ہوا کہ پارٹی کے جنرل سکریٹری اجے گھوش کی بیوی کی بھتیجی ہیں۔ ان کے شوہر اور وہ دونوں پارٹی کے ہمدردوں میں سے تھے۔ سیٹھ صاحب کا یہاں انڈسٹری ڈائرکٹر کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا تھا۔ ریتا جی دلّی میں بھی امن کمیٹی میں کچھ کام کرتی رہی تھیں اور اب یہاں پر۔...... جلد ہی وہ ہماری انجمن اور کوآپریٹیو کی سرگرم کارکن بن گئیں۔ نئے انتخابات میں اُن ہی کو صدر چنا گیا۔ ان کے زمانہ صدارت میں خاصہ کام ہوا۔ خواتین کے حقوق وغیرہ کے سلسلے میں کتنی ہی میٹنگیں ہوئیں اور جلوس نکالے گئے۔ جن میں ہمارے کارکنوں کی بڑی تعداد شامل رہی۔ بچوں کے سال میں بھی میٹنگیں، جلسے اور جلوس ہوئے۔ عام لوگوں پر بچوں کے سال کی اہمیت واضح کی گئی۔ بچوں کے بارے میں انگریزی کے ایک کتابچے کا رضیہ سے اردو میں ترجمہ کروا کے شائع کیا گیا۔ اور اردو داں لوگوں میں مفت تقسیم کیا گیا۔ انھوں نے فنڈ جمع کرنے کی بھی ممکنہ کوشش کی۔

ڈاگر برادرس کی کلاسیکل موسیقی کا پروگرام رکھا گیا تھا جو ہمارے ساتھیوں کی کوشش سے ممکن ہوا۔ جن میں فاطمہ عالم علی اور رضیہ اکبر وغیرہ شریک تھیں جن کی کوششوں سے بہت کامیاب رہا ایک ساونیر بھی شائع کیا گیا۔ اخراجات وضع کرنے کے بعد تین چار ہزار کا فائدہ ہوا۔ فسادات کے مارے ہوئے لوگوں کی تسلی و دلاسے وغیرہ کے کاموں میں بھی وہ ہمیشہ ساتھ رہیں۔ یاقوت پورہ کے فسادات میں ہم صرف لوگوں کی ہمدردی کرنے اور تسلی دینے کے سوا اور کچھ نہ کر پائے۔ کچھ دن بعد ہمارے گھر کے قریب ہی ایک پہاڑی پر پھیلی ہوئی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جھونپڑیاں جلادی گئیں۔ مار پیٹ ہوئی بڑی مشکل سے اونچے اونچے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے وہاں تک پہنچے۔ بہت تکلیف دہ منظر تھا۔ کہیں کسی غریب کی شادی کے کپڑے جلے پڑے ہیں اور کہیں ٹوٹے برتن بکھرے ہوئے ہیں تو کہیں ٹھیلے والوں کا سامان، سبزی ترکاری، پھل زمین پر بکھرے ہوئے، بچے بوڑھے عورتیں سب بے گھر، کھلے آسمان کی چھت کے نیچے، یہ زیادہ تر تلاش معاش میں نواحی علاقوں سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ محنت کر کے جی رہے تھے۔ جھونپڑیاں جو جلنے سے محفوظ رہ گئی تھیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انسان اس میں کیسے رہ لیتے ہیں۔ چھوٹی جگہ میں کئی کئی لوگوں کا کھانا پکانا سونا سبھی کچھ اتنی سی جگہ میں ہر طرف گندگی اور میلے کچیلے بچوں کی ریل پیل، تھوڑی دور پر ایک بڑے گھر میں دو چار معزز سے داڑھی والے حضرات نظر آئے۔ ہم نے ملاقات اور بات چیت کی۔ معلوم ہوا کہ وہاں نہ کوئی مدرسہ ہے نہ دواخانہ۔ ہم نے وہاں کچھ بچوں کی ابتدائی تعلیم اور عورتوں کو کام سکھانے کی بات کی تو ان میں سے ایک داڑھی والے صاحب نے کہا کہ میرے ہاں ایک کمرا ہے اگر مناسب سمجھیں تو آپ یہ کام شروع کر سکتی ہیں۔ آس پاس کی لڑکیوں اور عورتوں کو اکٹھا کر کے جب بات کی تو وہ سبھی پڑھنے اور کام سیکھنے پر آمادہ ہو گئیں۔ اتفاق سے ہماری ایک پرانی کارکن جو ہمارے ہی اسکول کے سرٹیفکیٹ کی بنا پر بلاک ڈیولپمنٹ اسکیم کے تحت کاغذ نگر میں ملازم رہ چکی تھیں

وہیں قریب رہتی تھیں انھوں نے بہت کم تنخواہ پر کام کی ذمہ داری قبول کرلی اور کام شروع ہوگیا۔ میں اور ریتا جی کئی بار دیکھنے گئے وہاں کافی عورتیں جمع ہوتی تھیں اس دوران اتحاد المسلمین والوں کو پتہ چلا۔ ان کے دلوں میں قوم کا جو درد تھا چپ کیسے بیٹھے رہتے چناں چہ کہا جانے لگا کہ یہ کمیونسٹ ہیں بے دین اور بے پردہ ہیں۔ ان کی صحبت میں ہماری شریف بہنیں بے دین ہوجائیں گی۔...... وغیرہ وغیرہ۔ جن صاحب نے جگہ دے رکھی تھی وہ معذرت خواہ ہوئے کہ میں اپنی جگہ اس کام کے لیے نہیں دے سکتا۔ لیکن سیکھنے آنے والیوں پر اس پروپیگنڈے کا کوئی خاص اثر محسوس نہ ہوا۔ ان ہی میں سے ایک بیوہ عورت اپنا جھونپڑا دینے کے لیے تیار ہوگئی۔ اور یوں کوئی دو سال تک یہ کام چلتا رہا۔ چند لڑکیاں لکھنا پڑھنا اور کچھ کام بھی سیکھ گئیں ایک دفعہ ایک معمر گاندھی وادی خاتون نے اس سنٹر کو جاکر دیکھا اور کہا یہ تو گاندھی کے فلسفے کے عین مطابق کام ہو رہا ہے۔ اور پانچ روپے چندہ بھی دیا کہ بوریا منگوالیا جائے لیکن دو ڈھائی سال بعد فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا۔ سوشیل ویلفیر بورڈ والے ہمارے کام کی تعریف تو بہت کرتے امداد میں شروع سے آخر تک ایک پیسے کا اضافہ نہ کیا۔

ریتا جی کو فیڈریشن کی طرف سے ورلڈ ویمنس ڈیموکریٹک فیڈریشن کے آفس میں برلن بھیجا گیا۔ فیڈریشن نے الحاق لے لیا تھا۔ وہاں کا قاعدہ تھا کہ متعلقہ تنظیم کا ایک نمائندہ کم از کم دو سال تک رہے۔ اس سے قبل پرمیلا تائی کو وہاں بھیجا گیا تھا اور اب کی بار ریتا جی کی باری آئی وہ اتنی دور چلی گئیں لیکن ان سے رابطہ خط و کتابت کے وسیلے سے برقرار رہا۔ اس بیچ سیٹھ صاحب کا تبادلہ دلّی ہوگیا۔ ریتا جی برلن سے واپس ہوئیں تو وہیں دلّی میں شوہر کے ساتھ رہنے لگیں اور فیڈریشن کے کاموں سے برابر جٹی ہوئیں۔ چند دنوں بعد وہاں کے اخبار کی ایڈیٹر بھی بن گئیں۔ اس دوران دو مرتبہ حیدرآباد آئیں صرف چند دنوں کے لیے ایک دفعہ میرے پاس بھی رہیں۔ رضیہ نے بھی دو ایک بار جب دلّی گئیں تو ان ہی کے ہاں قیام کیا۔ ریتا جی کے ایک لڑکا اور ایک

لڑکی تھے۔ لڑکا تو پہلے ہی امریکہ چلا گیا وہیں شادی بھی کرلی۔ لڑکی نیلم نے دلی میں مراقش سفارت خانے کے ایک عرب نوجوان سے شادی کرلی۔ اس کی پاداش میں اس کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ مجبوراً وہ بیوی کو لے کر امریکہ چلے گئے۔ وہاں ان کی دو لڑکیاں ہیں۔ ریتاجی بچوں سے ملنے دوسرے تیسرے سال امریکہ جایا کرتی تھیں۔ بارہ چودہ سال بعد ان کے لڑکے کے ہاں ایک لڑکی ہوئی۔ پچھلے سال ریتاجی کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہیں۔ وقتاً فوقتاً اپنی کیفیت اور علاج کے بارے میں لکھتی رہتیں۔ چند ماہ قبل لکھا کہ میں اچھی ہوں اور بچوں سے ملنے کے دو ڈھائی ماہ کے لیے باہر جارہی ہوں۔ ستمبر میں واپس آنے والی تھیں۔ خط لکھا مگر جواب نہ ملا۔ پتہ نہیں کیسی ہیں اور کہاں ہیں۔

صفیہ کی شادی کی دعوت

دعوت نامہ ملا۔ شادی پرانے شہر کہیں رکھی گئی تھی۔ اس لڑکی نے بی ایڈ کیا تھا نوکر بھی ہوگئی۔ میں اس شادی میں شرکت کے لیے چلی تو گئی مگر واپسی کیسے ہو۔ یہاں کی شادیاں عموماً وقت کی بربادی بے قاعدگی کا نمونہ رسومات کا طویل سلسلہ۔ خیال تھا کہ پانچ بجے کا وقت بتایا گیا تھا شرکت کرکے دو گھنٹوں میں لوٹ جاؤں گی لیکن رات کے نو بج گئے مگر ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔ رخصتی میں خاص دیر تھی اسی رات انوار العلوم کالج میں ایک مشاعرہ تھا زیادہ رات ہونے کا عذر کرکے میں نے اجازت لی۔ مخدوم جو مشاعرے کے لیے جارہے تھے ان کے ساتھ ہوگئی۔ میرا گھر مشاعرہ گاہ سے بہت قریب تھا۔ مخدومؔ ابھی ایم ایل اے کوارٹرز میں مقیم تھے۔ آساوری کی شادی طے پا گئی۔ ان کی ماں کے کسی رشتہ دار کے ساتھ۔ شادی کے بعد آساوری کے شوہر صاحب بھی اسی چھوٹے سے کوارٹر میں رہنے لگے۔ کوارٹر میں دو ہی کمرے تھے باہر کا چھوٹا سا کمرا مخدوم کے تصرف میں تھا

اس میں ایک پلنگ کرسی اور چھوٹا سا میز اس کے مقابل ایک چھوٹا سا تخت بچھا ہوا تھا۔ آساوری کے شوہر کی غالباً رام چندراپورم میں ملازمت تھی۔ جہاں کارخانے کے ملازمین کے لیے مکان بنوائے گئے تھے۔ ان میں سے انھیں بھی ایک مکان مل گیا۔ اور وہ وہاں چلے گئے۔ بعد میں کسی بچے کی نام رکھائی جیسی کوئی تقریب تھی مجھے بڑے اصرار سے بلایا میں نے اتنی دور تنہا نہ آنے کا عذر کیا۔ کیوں کہ آساوری کی والدہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھیں تو جواب ملا کہ چچا باوا (مخدوم) کے ساتھ آجائیے۔ ہم بس کے ذریعہ گئے گھر خاصہ اچھا تھا تین کمرے کچن باتھ روم اور سامنے بڑا سا صحن رات وہیں گذری۔ دوسرے دن صبح بس ہی سے واپسی ہوئی۔ میں نے آساوری کو اچھا گھر ملنے کی مبارکباد دی تھی۔ مگر پتہ نہیں کیا ہوا وہ دو تین مہینوں بعد' اس گھر کو چھوڑ کر پھر ماں کے پاس کوارٹر میں واپس آگئیں۔ اور چھ سات سال کے اندر چار بچوں کی ماں بھی بن گئیں۔ جب وہ چھٹے بچے کی تیاری کررہی تھیں ایک دن مخدوم آئے مجھ سے کہنے لگے آپ اسے سمجھائیں .... لیکن غنیمت ہے میں اس ذمہ داری سے بچ گئی پتہ نہیں کسی خیر خواہ نے مشورہ دیا کہ انھوں نے خود چھٹے بچے کے بعد اس سلسلے کو ختم کردیا۔ آساوری کبھی کبھی مجھے فون کرلیا کرتی تھی۔ نہ جانے کس سلسلے میں مخدوم کو گرفتار کرلیا گیا وہ جیل میں تھے کہ ایک دن آساوری کا فون آیا۔ خبر دی کہ نصرت کی شادی ہوگئی۔ مجھے لگا کسی نے مذاق کیا ہے۔ دوسرے دن ان کے گھر گئی پتہ چلا آساوری کی اطلاع مذاق نہیں واقعہ تھی۔ ماں کو مبارکباد دی تو خفا ہوگئیں کہنے لگیں کیا یہ کوئی خوشی کی بات ہے۔ میں تو یہاں تین دن سے روئے جارہی ہوں...... اب ان سے کیا کہتی دل میں سوچا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری بہو گھر آگئی۔ لڑکے کو پسند ہے تو آپ کو اتنا دکھ کیوں ہونے لگا؟

میں فیڈریشن کی کانفرنسوں میں باقاعدہ شرکت کرتی رہی رپورٹوں سے پتہ چلتا کہ کام بہت بڑھنے لگا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی لگتا کہ سب کچھ بڑھا چڑھا کر بتایا جارہا ہے۔ اور کوئی اگر اصلی

بات بتادے تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ اور افسوس کی بات تو یہ کہ پارٹی بھی اس کمزوری سے مبرّا نہ تھی۔ تلنگانہ تحریک کی آخری رپورٹوں سے لگتا ہے کہ کچھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ کیرالا کی کانفرنس بڑی یادگار رہی۔ ہمیشہ یہ ہوتا کہ جیسے ہی کانفرنس ختم ہوئی مندوبین کو کسی قابل دید مقام کو دکھانے لے جاتے۔ مگر اسی دن کانفرنس میں شریک ہونے والے پارٹی ممبرس کی میٹنگ بھی رکھی جاتی۔ چناں چہ کسی قسم کی تفریح میں شرکت نہ ہو پائی۔ کیرالا کانفرنس میں میری بہنیں رضیہ، رابعہ، ذکیہ اور ریاست بھی شریک رہیں۔ کیوں کہ اس وقت یہ سرکاری ملازم نہیں رہی تھیں اور اس دفعہ ہم نے کانفرنس کے بعد ایک ہفتہ مزید اپنے طور پر وقت گذارنے کا تہیہ کر لیا۔ کئی مقامات کی سیر کی۔ کنیا کماری میں بھی تین چار دن گذارے۔ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ وہاں اُن دنوں پارٹی کی حکومت تھی۔

غالباً (1967) کی بات ہے ایک دن بیٹھے بٹھائے سینے میں کچھ غیر معمولی تکلیف ہونے لگی۔ ڈاکٹر حیدر خان نے تشخیص کے بعد آرام کا مشورہ دیا۔ بدر النساء اور رزاق نے بڑی لگن سے تیمارداری کی۔ اس کے بعد بھی چند سیڑھیاں اترنے کی ممانعت رہی۔ اس لیے اوپر صحن میں ہی ٹہل لیا کرتی۔ جب بالکل ٹھیک ہوئی تو لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ گھر کا سارا کام رضیہ پر پڑ گیا تھا چھ سات ماہ کے اس عرصے میں مخدومؔ ہی کئی بار آئے۔ اس بیماری کی وجہ سے لکھنو کانفرنس میں شرکت نہ ہو سکی۔ ایک دفعہ مخدومؔ نے راہی معصوم رضا کو چائے پر بلایا تھا مجھے بھی بلا لیا۔ وہاں پہنچی تو دیکھا عجیب نقشہ تھا پلنگ پر شاہد صدیقی دراز تھے پلنگ کے ایک سرے پر مخدومؔ بیٹھے ہوئے سامنے پتلا سا تخت دروازے کے قریب پلنگ کے مقابل خالی کرسی تھی راہیؔ معصوم رضا بھی مخدومؔ کے برابر اسی طرح بیٹھے ہوئے نظر آئے مجھے اس خالی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ آساوری کے شوہر اندر سے چائے وغیرہ لے کر آرہے تھے۔ چاہا کہ یہ کام میں کروں لیکن بیچ میں اندر جانے کا راستہ ہی نہ تھا۔ تو بس چائے وغیرہ بنانے کی حد تک کچھ کر سکی۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو کوئی بڑا کوارٹر نہیں مل سکتا۔؟ بتایا

کہ ایک مل سکتا تھا مگر خاتون خانہ نے سامان باندھنے اور اسے منتقل کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

پارٹی آفس کوارٹر کے قریب حمایت نگر میں تھا۔ میرے گھر سے کافی دور۔ میٹنگ عموماً شام کو ہوتی اور نو دس بجے ختم ہو جاتی ایک دفعہ میٹنگ رات ایک' دو بجے تک چلتی رہی۔ تو واپسی میں مخدومؔ نے گھر تک چھوڑا۔ دو چار ماہ بعد ایسا اتفاق پھر ہو گیا۔ میٹنگ سے نکل کر مجھے محسوس ہوا رات کافی بیت چکی ہے۔ بلا کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا کہ رات بہت ہو چکی ہے یہیں رہ جاؤں گی۔ چناں چہ گھر پہنچے۔

مخدومؔ کا گھر.......... مخدوم کے کمرے کے علاوہ ایک اس کے پیچھے لامبا کمرا، دونوں کمروں کے دروازے ایک ڈھائی گز کے چوکور حصے میں کھلتے۔ نیچے صحن میں جانے کا راستہ دونوں کمروں کے دروازے اس میں کھلتے۔ اس چوکور جگہ میں آساوری کی والدہ کا بستر میں نے اُن ہی کے قریب کسی طرح رات گزاری۔

ایک اور یادگار واقعہ

ایک شام اکیلی اپنے کمرے میں کوئی کتاب پڑھتی بیٹھی تھی۔ غالباً چھٹی کا دن تھا۔ اتنے میں مظہر نے اطلاع دی کہ مخدومؔ بھائی آئے ہیں۔ رابعہ آپا کے ہاں نظم سنا رہے ہیں۔ عموماً کبھی رضیہ کے کمرے کبھی ہال میں اور اب زیادہ اوپر میرے کمرے میں ان کے بیٹھنے اور کلام سنانے کی جگہ ہوا کرتی اور مخدوم جہاں بھی ہوتے سب وہیں اکٹھا ہو جاتے۔ پر اس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا مخدوم کے آنے کی اطلاع پا کر بھی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد مظہر نے آکر رات کے کھانے کے لیے بلایا۔ کہہ دیا بھوک نہیں ہے۔ کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر یوں لگا کہ بلا سمجھے پڑھے جا رہی ہوں۔ کوئی تھوڑی دیر بعد دیکھا مخدومؔ چلے آرہے ہیں آتے ہی پوچھنے لگے کھانے پر کیوں نہیں آئیں۔ وہی بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر دیا۔ چلیے کوئی پکچر دیکھتے ہیں۔ ان کے کہنے کا انداز

کچھ ایسا ہوتا کہ سوائے اچھا کہنے کے کچھ اور کہا نہیں جاسکتا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پوچھا کونسی فلم دیکھنا چاہیں گی۔ مجھے اس تعلق سے کچھ پتہ نہ تھا کون سی فلمیں چل رہی ہیں کون سی اچھی سمجھی جا رہی ہیں۔ برسوں پہلے یہ شوق ہوا تھا۔ نیو تھیٹر اور بمبئی ٹاکیز کی فلمیں دیکھا کرتے لیکن دو چار دفعہ یہ ہوا کہ انڈر گراونڈ زمانے میں راج، مخدوم وغیرہ آئے اور ہم پکچر دیکھنے گئے ہوئے تھے لگتا ان لوگوں کی صحبت پکچر سے کہیں اچھی ہوتی ہے۔ اس لیے پکچر دیکھنا کم کر دیا۔ جب یہ آمد و رفت ختم ہو گئی تب یہ خیال کہ یہ لوگ بغیر کسی تفریح کے کیسی تکلیف دہ زندگی گذار رہے ہیں۔ جو بھی پیسہ بچا سکیں بچانا چاہیے تو اس طرح ان حالات کے تحت رفتہ رفتہ پکچر دیکھنا لگ بھگ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے کہا آپ کو جو پسند ہو۔ لبرٹی سینما پہنچ کر کسی انگریزی فلم کے ٹکٹ لیے اس وقت میرا ذہن فلم دیکھنے اور سمجھنے کے موقف میں نہیں تھا۔ مخدوم کے کہنے پر ہی پتہ چلا کہ فلم بہت فضول ہے۔ غنیمت ہوا کہ زیادہ طویل نہ تھی۔

ریتا جی کے باہر جانے کے بعد فاطمہ عالم علی صاحبہ اور رضیہ اکبر سکریٹری منتخب ہوئیں۔ قاضی صاحب کا ادبی ذوق کچھ حد تک ان میں موجود ہے۔ ان کا انداز تحریر تو بہت ہی لاجواب تھا۔ کچھ ہلکے پھلکے مضامین انھوں نے بھی اچھے لکھے ہیں..........!!!

مراد نگر میں جو صاحبہ ہمارا سنٹر چلا رہی تھیں وہ اب بے کار تھیں اور خواہش کی کہ درگا بائی کے ادارے میں کھلونے بنانے کے سنٹر میں شریک ہونا چاہتی ہیں۔ کوشش کی گئی درگا بائی دیشمکھ کے ادارے میں غالباً پانچ سنٹر الگ الگ چیزوں کو سکھانے کے لیے تھے۔ اس میں ایک سنٹر رنگوائی وغیرہ کا بھی تھا۔ انھیں ٹوائے میکنگ (کھلونا سازی) میں تو داخلہ نہ مل سکا لیکن رنگ سازی کے سنٹر میں مل گیا۔ لڑکی ہوشیار تھی اس نے اس کام کے ساتھ ساتھ کسی طرح سے تھوڑا بہت کھلونا سازی کا کام بھی سیکھ لیا۔ اُن ہی دنوں گورنمنٹ کی طرف سے پانچ مختلف صنعتوں کے سنٹر کھولے جانے کی تجویز ہوئی

ہر سنٹر کو دو لاکھ روپے کی رقم دی جانے والی تھی۔ ان میں ایک کٹنگ سلائی، دوسرا ٹوائے میکنگ کا بھی تھا۔ ان صاحبہ نے کھلونے سازی کے سنٹر چلانے کے لیے درخواست دی۔ ہمارا نام بھی وہاں رجسٹرڈ تھا۔ دیکھنے کے لیے آئے بات چیت ہوئی کہا اس کام کو ان پرانے کاموں سے نہ ملایا جائے۔ بالکل الگ رکھا جائے۔ یقین دلایا گیا جگہ بتائی گئی۔ بالکل الگ حساب کتاب رکھنے کا وعدہ۔ ٹوائے میکنگ سنٹر کی منظوری تو مل گئی مگر ہمیں نظر انداز کر دیا گیا۔ دو لاکھ بڑی رقم تھی مل جاتی تو آج سوسائٹی کی اپنی ایک عمارت ہوتی مستقلاً چلتی رہتی۔ کیوں کہ اس رقم کے خرچ پر جہاں تک میرا اندازہ ہے کوئی خاص نگرانی نہیں رہی سوائے یہ کہ سنٹر چند روز چل کر ختم ہو گیا۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ خیر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ایسا عموماً ہوتا آ رہا تھا۔ تین چیف منسٹر ہمارے ہاں سوسائٹی دیکھنے آئے۔ تعریف کی، بڑے بڑے وعدے کیے مگر نتیجہ صفر۔ چیف منسٹر جگ جیون ریڈی نے بھی بہت کچھ وعدہ کیا تیقن دیا مگر ہوا کچھ نہیں۔ ان لوگوں کے وعدہ وفا نہ ہونے میں کچھ ہماری اپنی کوتاہیاں بھی تھیں۔ یعنی ان کے دفتر کے چکر کاٹتے رہو۔ خوشامدیں کرتے رہو یاد دہانیاں کرتے، سفارش پہنچاؤ، تحائف پیش کرو ان سارے اعمال میں سے ہم سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اُن ہی دنوں مخدومؔ کا ایک اور سفر آذربائیجان کا ہوا۔ وہ پورے چھ سات ماہ کے لیے چلے گئے۔ تاشقند سے ایک خط لکھا جس میں انھوں نے واپسی کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا کہ وہ دلّی سے ہوتے ہوئے حیدرآباد فلاں تاریخ کو آ رہے ہیں۔ ان دنوں میرا بھائی انور بیمار تھا۔ جالنہ کیمپ کے قیام کے دوران اس کی صحت بہت بگڑ چکی تھی۔ سانس کی تکلیف ہو گئی تھی۔ اب یہ تکلیف کافی بڑھ گئی۔ ذکیہ کے پاس بمبئی جا کر علاج کروایا۔ اور یہاں بھی کروایا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اب تو اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ ہو گئی تھی۔ دواخانے سے لے آئے۔ اُن دنوں میں بھی نزلہ اور بخار میں مبتلا رہی۔ کسی طرح نیچے انور کو دیکھنے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد رزاق نے آ کر بتایا کہ مخدومؔ آ کر

بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اوپر گئی۔ وہ دیر تک اپنے سفر کے واقعات حالات اور مناظر کی باتیں کرتے رہے اور پھر چلے گئے ان کے جانے کے بعد رزاق نے آکر بتایا کہ مخدوم نے ان سے کیل منگوائی اور اپنے ہاتھ سے یہ پینٹنگ یہاں لگائی ہے وہ میرے کمرے میں اسی جگہ لگی رہی پھر نیچے منتقل ہونے کے بعد ایسی جگہ لگوادی کہ ہر وقت اس پر نظر پڑتی رہے۔..........انور کی حالت تیزی سے بگڑتی گئی اور مہینے سوا مہینے کے بعد وہ 2 افروری 1968ء کو ہم سب اور اپنی پانچ سالہ بچی صبوحی کے ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے۔

مخدوم اس بیچ ہمیشہ کی طرح آتے رہے۔ انور کے انتقال کے بعد میں بہت دل گرفتہ ہوگئی۔ ایک طرح اپنے ہی کو مجرم سمجھتی رہی۔ قمر اور ابّا کے بعد تیسری جدائی تھی۔ دماغ بالکل ماؤف کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ زیادہ تر اکیلی اپنے کمرے میں۔ اس اثناء میں مخدوم کئی دفعہ آئے اور دیر تک بیٹھے ادھر اُدھر کی باتیں کیا کرتے۔ تنہائی میں میرا سب سے بڑا ساتھی اور مشغلہ مطالعہ ہی ہوتا کتاب مل جاتی تو ہر چیز کو بھول جاتی۔ میرا کمرا بہت چھوٹا تھا۔ چوکی کے سرے پر دروازے کے بازو تھوڑی سے خالی جگہ تھی وہاں کتابیں رکھنے کے لیے خالی جگہ کے برابر ایک شیلف تیار کروا رہی تھی۔......

کچھ عرصے بعد ایک بات یاد آگئی۔ مخدوم نے یوں ہی باتوں باتوں میں کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے اپنا ایک الگ کمرا ہوتا جہاں کتابیں وغیرہ ڈھنگ سے رکھ کر اطمینان سے کچھ کرسکتا۔ ایک دن فون آیا۔ انھوں نے بڑی خوشی سے یہ خبر سنائی کہ انھیں پیس کمیٹی کے بازو والا کمرا مل گیا ہے ایک بڑھئی میرے پاس کام کررہا تھا۔ اس دوران آئے دیکھا اور کہنے لگے میرے ہاں نئے کمرے میں ایک خالی جگہ ہے اس میں ایسی ہی ایک شلف بن جائے تو کتابیں اچھی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں۔ میں نے کہا آپ ناپ دے دیجیے شلف بن جائے گی دوسرے دن فون پر جگہ کا سائز بتا دیا۔ میں نے شلف تیار کروا دیا۔ بہت خوش ہوئے ایک دن پیس کمیٹی کی میٹنگ میں جانا ہوا ان کا کمرا دیکھا الماری میں

ابھی بہت تھوڑی سی کتابیں تھیں۔

انور کے انتقال کے بعد بہت ڈپریشن رہا۔ اس کی جوان بیوی اور چھوٹی بچی کو دیکھ کر دل دکھتا۔ نہ جانے کیوں ایک دن یہ کیفیت زیادہ ہی ہوگئی۔ مخدوم شام پانچ بجے کے قریب آئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے میں نے یوں ہی کہہ دیا ڈھائی تین سال مختلف جگہوں کی سیر کی اب تو کوہ قاف کے قریب تک جا گزرے۔ کیا کچھ کہا نہیں خاموش رہے اور چند منٹوں کے بعد کہا سن لیجیے۔ دو شعر ہوئے ہیں۔ پہلا تو یاد نہ رہا۔ دوسرا

کوئی محفل ہو کہ مقتل ہو کہ مئے خانہ ہو
دل وہ دیوانہ کہ ہر جا تری صورت مانگے

میں نے کہا آپ نے پائے طاؤس والی مشکل بحر میں یہ شعر کہے ہیں۔ بس دو ایک کہہ کر چھوڑ دیں گے خاموش رہے۔ کچھ نہ کہا۔ وہ یوں چپ رہنے والے تو کبھی نہ تھے مجھے خیال ہوا شاید بے کار سی بات کہہ دی اچھے شاعر کے لیے بحر کی اہمیت جو میں کہنا چاہتی تھی شاید ٹھیک سے کہہ نہ پائی۔ مخدوم کچھ دیر بعد جانے کو اٹھے نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ چائے کے لیے بھی نہ کہا۔ ورنہ ہمیشہ جانے کا ارادہ کرتے تب میں چائے کے لیے پوچھتی۔ اس طرح کچھ دیر اور ٹھہر جاتے۔ یہ آخری ملاقات تھی۔ 14/ اگست کو دلی گئے تھے۔ 24/ کی صبح سات بجے آنکھ کھلی گھڑی دیکھی تو آٹھ بجے نظر آئے خیال ہوا دیر ہوگئی ہے فوراً نیچے گئی جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا۔ سب لوگ ناشتے پر جمع ہوئے میں نے پہلا نوالہ اٹھایا ہی تھا کہ عجیب سی کیفیت کا احساس چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا کچھ نظر نہ آیا۔ نوالہ ہاتھ میں رہ گیا۔ رضیہ پریشان ہوگئیں پوچھا کیا بات ہے باجی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ رضیہ کی آواز پر یہ کیفیت ختم ہوئی میں نے اسے اطمینان دلایا کہ ٹھیک ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ بمشکل ناشتہ ختم کیا۔ اور اوپر اپنے کمرے میں جا کر اخبار پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر عجیب بے چینی سی۔ جی نہیں لگتا تھا۔ دس بجے کے

قریب رزاق آئے اور بتایا کہ ابھی ریڈیو پر خبر سنی کہ مخدوم بیمار ہیں قلب پر حملہ ہوا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ نصرت اور ان کی والدہ کو فوراً بلایا گیا ہے خیریت معلوم کرنے گھر فون کیا کسی لڑکے نے بات کی پتہ نہیں دن کیسے گذرا۔ رات آٹھ بجے اسی لڑکے کی فون پر آواز آئی کہ "حیدرآباد کا آفتاب غروب ہو گیا ہے" ۔دل یہ ماننے کو کسی صورت تیار نہ ہوا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

تمام شب دل وحشی تلاش کرتا ہے

ہر اک صدا یہ ترے حرف لطف کا آہنگ

مگر وہ "حروفِ لطف" تو اب خاموش ہو گیا۔ کتنی یادیں کتنی باتیں۔ پارٹی میٹنگ میں زیادہ رات ہو جاتی تو گھر تک چھوڑنے آجاتے۔ کتنی دیر اسی حالت میں بیٹھی رہی رات کیسے گزری کچھ یاد نہیں۔

جیل سے چھوٹ کے آنے پر مخدوم کے استقبال میں جو مجمع دیکھا تھا آج یہ رخصتی کا نظارہ بھی دیکھنا پڑا۔ ایرپورٹ پر سوگواروں کا ہجوم، کوارٹرز میں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، چکڑپلی سے دیوان دیوڑھی جاتے ہوئے لاری میں کھڑے مجمع کو سلام کرتے ہوئے مخدوم آج لاری میں لیٹے ہوئے ہیں۔ ماتمی جلوس شام کے قریب نمائش گراونڈ کلب تک پہنچا۔ وہاں آخری دیدار کے لیے رکھا گیا۔ لوگ ایک طرف سے آتے نظر ڈالتے اور دوسری طرف نکل جاتے۔ بمشکل ایک دو منٹ لگتے ہوں گے یہ سلسلہ تین گھنٹوں تک جاری رہا میں شروع ہی میں اندر جا کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھی منتظمین میں سے کسی نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ اب یہاں سے پھر روانگی ہوئی۔ مجھے درگاہوں کے نام تو یاد نہیں ہاں ناپلی کے قریب یوسف صاحب شریف صاحب کا نام سنا تھا بعد میں اس سے ملی ہوئی ایک درگاہ حضرت شاہ خاموش کی ہے مخدوم کی تدفین وہیں ہوئی۔۔ جنازے کو وہیں لے جایا جا رہا تھا۔ مجمع اب لاکھوں میں گنا جا سکتا تھا۔ کسی طرف سے مخدوم امر ہیں تو کسی طرف سے حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو اور کسی سمت سے انا للہ و انا الیہ راجعون کی آوازیں اور کبھی سسکیاں رونے

کی آوازیں مجھے زیادہ تو یاد نہیں لیکن خیال ہے کہ مسجد تک تو رمیلا تائی، ظہیر اور دو تین خواتین کامریڈ ساتھ تھیں لیکن اس کے بعد...... ان کی موجودگی یاد نہیں۔ درگاہ میں پہنچنے کے بعد جسد خاکی کو ان کے عزیزوں کے حوالے کیا گیا۔ کامریڈ راج بہادر، مہیندرا اور دوسرے کئی کامریڈ وہیں کچھ دور میں شاید قبروں کے پتھروں پر بیٹھ گئے میں اُن ہی کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اب یہ بالکل یاد نہیں کہ کس طرح اور کب گھر پہنچی.......... رندیوے پالیسی کے تحت کتنے ہی پرانے ممبر الگ تھلگ ہو گئے تھے راج بھی اب ہمارے ہاں بہت کم آتے۔ مگر مخدومؔ نے اپنی روش نہ بدلی۔ کبھی بھولے سے بھی گمان نہ ہوا کہ کچھ فرق ہوا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ قربت کا احساس نیا کلام سناتے، کبھی کبھی رات زیادہ ہو جاتی تو رہ بھی جاتے کوئی تقریب ہوئی تو شریک ہوتے ایک بار اوپر کے صحن میں شب ماہ منائی گئی وہ سب کے ساتھ جاگتے رہے۔ مجھے کوآپریٹیو کام کے تعلق سے محکمہ کے بعض افراد کو کھانے پر بلانا پڑتا، مخدومؔ کو بھی مدعو کر لیا جاتا۔ وہ کبھی انکار نہ کرتے۔ کرنول، گنٹور، وجے واڑہ اور بہیتری جگہوں پر الکشن وغیرہ ہوتا اکثر ساتھ ہو جاتا نئے لوگوں سے متعارف کرواتے۔ ہمیشہ سب سے خوشی سے مسکراتے ہوئے بات کرتے خواب میں بھی نہ سوچھا تھا کہ یوں سب سے خفا ہو جائیں گے۔

اے رہ نورد عالم بالا چہ گوئمٔ
ما بے تو در ہم ہیم تو بے جا چہ گوئمٔ
در سایۂ غم تو سیہ پوش شوہما
اے خفتہ در نشیمن عنقا چہ گوئمٔ

ہمارے گھر کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں مخدومؔ شرکت نہ کرتے ہوں۔ مدعو کرنے پر وعدہ کرتے اور ضرور آجاتے اب کسی کام میں جی نہ لگتا تھا لیکن جس کام کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اسے تو بہر حال کرنا ہی تھا۔ بلکہ اور زیادہ مصروف رہ کر...........

ادھورے خواب سونپ کر

کہاں چلا گیا ہے تو؟

بجھی بجھی ہے روشنی

دھواں دھواں ہیں بام ودر

پکارتی ہے رہ گزر

کہاں چلا گیا ہے تو؟

خالی ترے وجود سے ہر گوشۂ وجود

نے مژدۂ نگاہ، نہ تسکین جان ودل

تنہائیاں سناتی ہیں آواز پا تری

خاموشیوں میں اب بھی ہے ترے نغموں کا بانکپن

سوسائٹی کی صدر اب دیا دیوی تھیں ریٹائرڈ سشن جج، بہت ہی قابل پُر خلوص اور ہمدرد خاتون کتنی ہی تنظیموں کی سربراہ ان تھک کام کرنے والی خوش مزاج۔ فیڈریشن کی دو تین کانفرنس میں شریک رہیں نیروبی میں (اب نام یاد نہیں) کسی قسم کی کانفرنس تھی اس میں ہماری طرف سے نمائندہ بن کر گئیں چند سال ہوئے وہ ختم ہوگئیں۔ ان کی ہر دل عزیز ہونے کا ٹھیک پتہ مجھے اس وقت لگا کہ کتنے ہی لوگ ان کے لیے رو رہے تھے جن میں زیادہ تر مسلم ہی تھے۔......!

ہمارے سنٹر کی ٹیچر بدرالنساء کا لڑکا بی کام کر چکا تھا۔ بدر نے اس کی شادی میں پیسہ کا خیال نہ کیا۔ بلکہ پڑھی لکھی کی تلاش کی۔ اس وقت تک اُن کا لڑکا نوکر ہو چکا تھا۔ مہر نامی ایک لڑکی بی ایس سی کے آخری سال میں تھی۔ بدر کے لڑکے ظہیر کے ساتھ دلھن بن کر ہمارے گھر آئی تھی۔ اس کے چار بچے پیدا ہوئے چوتھے پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ظہیر کے کام کو اس کے آفسر اتنا پسند کرتے تھے کہ اگر کہیں

تبادلہ ہو جاتا تو منسوخ کروا دیتے لیکن کب تک دس گیارہ سال بعد وہ ترقی کرتے ہوئے جیلر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے اس کا تبادلہ آصف آباد ہو گیا۔ اس وقت میرے گھٹنوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اوپری حصے پر چڑھنا اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ نیچے کے مکان کا ایک کمرا خالی ہو گیا۔ میں نیچے آ کر رہنے لگی۔

نیچے یاسمین انور کی بیوی رہا کرتی تھیں اب وہ اپنے بھائی کے ایک خالی مکان میں......"

ظفر کی بیوی نوشابہ شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ماں کے گھر جا کر رہنے لگیں تھیں۔ ان برسوں میں فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے مشاعرے وغیرہ کے علاوہ بشیر باغ لیڈری حیدری کلب میں جس کی فاطمہ ممبر تھیں دو دفعہ مینا بازار کے نام سے تیار کردہ سامان عطیوں اور کھانے پینے کی چیزوں کی فروخت کا انتظام کیا تھا اس پر دو ڈھائی ہزار کا منافع ہوا تھا...... ذکیہ کے شوہر وشوامتر عادل کے توسط سے جو ان دنوں اپٹا کے سکریٹری تھے یہاں اپٹا والے پروگرام دینے تیار ہو گئے۔ دو دن کے لیے رویندرا بھارتی بک کر لیا گیا۔ اپٹا کے کوئی بیس اکیس ممبر آئے۔ ان میں شوکت کیفی کے علاوہ دو نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ شوکت تو اختر کے یہاں رہیں دوسری لڑکیوں کو نیچے کے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ اوپر کلاس کو تین چار دن کی چھٹی دے کر خالی کروا دیا اور نیچے فرش کروایا۔ یہ سارے لوگ جس میں اے کے ہنگل صاحب اور ہری ہرزی والا جو آگے چل کر فلموں میں سنجیو کمار کے نام سے مشہور ہوئے اسی فرش پر سوئے تھے۔ آزادی کے تعلق سے دو سوا دو گھنٹوں کا ڈرامہ پیش کیا گیا۔ اس میں شوکت نے بہت اچھا رول کیا تھا۔ دوسرے دن تین چھوٹے چھوٹے ڈرامے پیش کیے گئے غرض پروگرام بہت اچھا رہا۔ دیکھنے والوں نے بہت سراہا۔ مہمانوں کے خورد نوش کا انتظام بدر اور رزاق کے ذمے تھا۔ یہ سبھی لوگ اپٹا کے کام کرنے والے ہمارے پارٹی ممبر اور ہمدرد تھے۔ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے رہے۔ پھر وہی روز و شب........"

گنٹور میں فیڈریشن کی کانفرنس ہوئی میں نے شرکت کی۔ وہاں ایک نئی کامریڈ سرلا دیوی سے ملاقات ہوئی۔ کانفرنس کا سارا اہتمام انھوں نے ہی کر رکھا تھا۔ اس کانفرنس میں رابعہ وغیرہ کے علاوہ فاطمہ عالم علی بھی شریک رہیں۔ یہاں پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کا پھر کوئی انتخاب ہی نہ ہوا ہاں سکریٹری بدلتے گئے۔ کبھی راج، کبھی مہیندرا۔ میں حسب معمول میٹنگوں میں جاتی رہی۔ پارٹی کا نظم ونسق ٹوٹ چکا تھا۔ بھی عرصے بعد کامریڈ مہیندرا کی سکریٹری شپ کے دور میں ایک میٹنگ خاص طور پر عورتوں میں کام کے تعلق سے سوچ بچار کے لیے بلائی گئی ابتدائی تقریر میں انھوں نے کہا کہ عورتوں میں ہمارا کام بالکل نہیں ہے۔ باجی کچھ کر رہی ہیں وہ سوشیل ورک ہے ملی ٹینٹ خواتین تیار کرنے کے تعلق سے سوچنا چاہیے۔ میٹنگ میں برج رانی، سرلا دیوی اور میں تینوں بولنے والے تھے۔ سرلا دیوی کچھ دنوں سے شہر ہی میں رہنے لگی تھیں اس موضوع پر انھیں کہنے کو کہا گیا۔ انھوں نے کافی لمبی تقریر کی لیکن ساری فیڈریشن کے قیام وغیرہ کی تفصیلات تھیں میں اور برج رانی دونوں ہی فیڈریشن کی کانفرنس میں شریک ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے ممبر بھی۔ پھر ان باتوں کو دُہرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بعد برج رانی کی باری آئی۔ انھوں نے بہت مختصر سی مگر غیر متعلق باتیں کیں۔ مہیندرا نے سرلا دیوی کی تقریر کی تعریف کی کہ بہت اچھا بولتی ہیں لیکن کیا بولیں اس پر تبصرہ نہیں۔ میری باری آئی میں نے سوچا تھا کہ پوچھوں کہ مجاہد عورتیں کیسے بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی ۔ کچھ بتایا نہیں گیا۔ سہ پہر ہو رہی تھی۔ سننے والے بھوکے پیاسے سننے کے موڈ میں نظر نہ آئے۔ اور یوں لگا کہ کہنے سننے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ لہٰذا وقت زیادہ ہو جانے کا عذر کر کے نجات حاصل کر لی۔

کئی بار یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ برج رانی اور سرلا دیوی میں بنتی نہیں۔ بعض اوقات آپس میں تکرار بھی ہو جاتی۔ اب ان حالات میں مجھے تماشائی بن کر جانا پسند نہ آیا۔ میٹنگوں میں جانا ترک کر دیا۔ ان دنوں رات نیند نہیں آتی۔ ایسا لگتا کہ جاگ رہی ہوں۔ ایسی ہی ایک شب یوں لگا جیسے کچھ شعر کہے

ہیں ۔خواب سہی مگر جب بار بار ایسا محسوس ہوا تو اٹھ بیٹھی ۔ اور ایک کاغذ پر منتقل کر دیا۔ دیکھا تو۔ خاصی نظم ۔اختر کی وفات تک جو آپ بیتی لکھی تھی اس کے ساتھ یہ تحریر بھی الماری میں ڈال دی۔ گھر خالی کرتے وقت اس نثری تحریر کے ساتھ یہ نظم ۔جس کا عنوان بے خواب رات کا خواب ذکیہ کے ہاتھ لگی ۔وہ کسی کام سے مغنی تبسم صاحب سے ملی تو اس کا مسودہ بھی انہی کو دے آئی ۔اور انہوں نے اسے شعر وحکمت میں چھاپ بھی دیا۔ بعد میں سونچا کچھ اور لکھوں مگر نہ لکھ سکی۔

برسوں سے جس ذمہ داری کو بھلا رکھا تھا اس طرف متوجہ ہوئی۔ جاوید کی حالت نا گفتہ بہ ہو رہی تھی نوبت یہاں تک آ گئی کہ دو چار بار لوگ سڑک پر سے اٹھا لائے۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں ۔ذہین بچوں کی بروقت ٹھیک سے راہ نمائی نہ ہو تو شاید اس کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت ذہین تھا اور اس کے کتنے ہی شوق تھے۔ اس نے پولو کھیلنا شروع کیا۔ اس میں ایک انعام بھی لایا۔ دوسرا تصویریں کھینچنے کا شوق کیمرے کی فرمائش کی تھی تو لا دیا تھا۔ بڑے اچھے زاویوں سے فوٹو نکالنے کا ہنر جانتا تھا۔ خود ہی دھوتا اور صاف کرتا۔ ان میں بہت اچھے رنگ بھی بھرتا۔ پھر اسے ستار سیکھنے کا شوق ہوا تو ایک مٹھ میں جا کر وہاں کسی سے سیکھتا رہا۔ شکار کا شوق تو گھوڑوں کے ساتھ بچپن ہی سے تھا اور وہ بھی چھٹیوں میں پورا کر لیتا۔ جانے ایک دفعہ میری کسی بات پر کہا کہ بہت تعریف کرتی ہیں آپ دوسروں کی ۔اچھا اب میں بھی بتاؤں گا اور واقعی قائل کر دیا۔ نوکری سے ایک دن بھی چھٹی نہ لی ۔بغیر کسی کی مدد کے اپنی ذہانت اور محنت سے انٹر پھر بی اے درجہ اول میں کامیاب کیا۔ بی اے میں اردو اور فارسی میں دو گولڈ میڈل بھی لیے۔ پھر فارسی سے ایم اے فرسٹ کلاس کیا۔ اور بعد میں بی ایڈ بھی مگر کبھی چھٹی نہ لی۔ حساب کا بے حد کھرا ایک دفعہ کچھ قرض ہو گیا تھا تو ایک گولڈ میڈل بیچ ڈالا۔ ہر ایک کا بہت خیال رکھتا تھا رضیہ کی بہت عزت کرتا۔ ان کے کام بھی کر دیتا۔ ایران سے اُس کے نام رضیہ نے ایک خط میں لکھا بھی تھا کہ تم میرے کتنے کام آئے ہو۔ یہ سب کچھ۔ لیکن پینے کے بعد جو فضول

باتیں ہوتیں وہ ناقابل برداشت اور پریشان کن۔ اس دوران کامریڈ پرانچے نے اپنا کلینک کھول لیا تھا۔ ایک دن جاوید کے تعلق سے بتا کر پوچھا کہ آخر کیا کروں۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر کا نام بتایا کہ ان سے مل کر مشورہ لوں اور یہ کہ وہ انھیں فون بھی کردیں گے۔ یہ کوئی نفسیات کے ماہر ڈاکٹر مجید خان صاحب تھے۔ ہمارے مکان سے کافی دور حمایت نگر میں دواخانہ ان سے ملی تو بتایا تین چار مہینے دواخانے میں رہنا ہوگا۔ ایک فرد ساتھ رہ سکتا ہے۔ اخراجات بہت ہوں گے سوچا نصف مکان کیونکہ وہ ایک خریدنا چاہتی تھیں۔ اگر وہ چاہیں تو رضیہ کے ہاتھ بیچ دوں وہ اس تجویز پر راضی ہوگئیں قیمت کے اندازے وغیرہ کے لیے جاوید ہی ایک انجینئر کو لائے اور مکان کے صرف نیچے کا آدھا حصہ بک گیا۔ بہت کم قیمت پر۔ میں رضیہ سے کچھ قرض لے سکتی تھی۔ مگر قرض کی عادت نہ تھی۔ یہ بھی سوچا کہ ادائیگی کی صورت کیا ہوگی جاوید سے بھی کبھی آمدنی، تنخواہ کے تعلق سے کچھ پوچھا میرا وظیفہ بہت کم بڑی مشکل سے کام چلا لیا کرتی۔ اب خرچ کی سہولت تھی مگر جاوید کو جانے اور رہنے پر تیار کرنا بہت مشکل تھا کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھنے کے بعد فرمایا کہ علاج ہوسکتا ہے مگر کوئی غیر معمولی بات ہوجاتی ہے تو وہ ذمہ دار نہ ہوں گے۔ جو بھی ہو میں تیار ہوگئی۔ اور جاوید کو وہاں رہنے کے لیے آمادہ کرلیا۔ یہ کہہ کر میں خود تمھارے ساتھ رہوں گی۔ تین ماہ سے کچھ زیادہ ایک چھوٹے سے دو بستر والے کمرے میں ان کے ساتھ گذارے۔ ان کے باہر جانے پر پابندی تھی۔ دروازے پر ہر وقت چوکیدار ہوتا۔ جاوید بس ہر وقت واپسی پر مصر لیکن کسی نہ کسی طرح روکے رکھتی۔ یہ بھی تھا کہ زیادہ وقت غفلت میں گذر جاتا۔ صبح ہی انجکشن وغیرہ دیے جاتے جس کے بعد کئی گھنٹے بے ہوشی کا عالم رہتا۔ رزاق اور مظہر کے تعاون نے کھانے کی مشکل بھی آسان کردی۔ ان میں سے کوئی ایک روز دو وقت کا کھانا بھی لے آتا۔ ناشتہ وہیں کا کوئی ملازم لادیتا۔ ڈسچارج ہوتے وقت دوا دی اور کہا کہ برابر کھلاتی رہیں۔ اور اگر کبھی تھوڑی سی بھی پی لیں گے تو بری حالت

ہو جائے گی۔ وہاں سے آنے کے بعد پھر کہیں پی لی تو حالت یہ ہوگئی کہ بچنے کی امید نہ رہی رابعہ کی چھوٹی لڑکی ارزینہ ان دنوں آئی ہوئی تھیں وہ فوراً کار میں ڈال کر دواخانے لے گئی اور دو تین دن پھر مجھے وہاں ان کے ساتھ رہنا پڑا۔ موت وزیست کی کشمکش میں وقت کیسے گذر گیا پتہ نہ چلا اس کے بعد ان کے دل میں کافی ڈر بیٹھ گیا اور پھر کبھی نہ پی۔ اب تو بعض وقت خود ہی کہتے ہیں کہ آپ کی ہمت تھی کہ مجھے اس لعنت سے نجات دلائی۔ پھر اس کے بعد میں نے بہت چاہا کہ اپنا گھر بسا لیں۔ مگر کسی طرح وہ آمادہ نہ ہوئے۔ کچھ دنوں فلمیں دیکھنے میں وقت گذارا اور پھر مطالعہ میں۔ کسی سے ملنا جلنا بہت کم۔ بس مظہر ہی ان کے کمرے میں آجاتے اور ان کے ساتھ وقت گذار لیتے مجھے پریشانی سے نجات ملی تو پھر سے اپنے کاموں میں جٹ گئی۔ کوئی برس ڈیڑھ برس کے بعد ایک دن مجھ سے آکر کہا کہ ایک بیوہ خاتون ہیں۔ تین بچیاں بہت پیاری پیاری مگر بھوکوں مر رہی ہیں میں نے کہا تم ممکنہ مدد کردو۔ ان کے ساتھ ٹیچروں میں کوئی قاضی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ ایسے پیسے دینے میں بدنامی ہوتی ہے تم عقد کرلو۔ چناں چہ ان کی نصیحت پر عمل کیا اور مجھے نکاح نامہ لاکر دکھایا۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہ صاحبہ بالکل ان پڑھ تھیں ان تین سے پہلے دو لڑکیاں فوت ہو چکی تھیں۔ پانچ بچوں کی ماں عقد کے بعد بھی وہ اپنی حسب مرضی آجاتیں مستقلاً یہاں نہ رہیں۔ اب ایک لڑکا بھی ہوگیا۔ ایک بہت معمر پرانی عورت شریفہ بی جو ہمارے ہی لوگوں میں پلی بڑھی تھی۔ اب مستقلاً میرے پاس آکر کر رہنے لگی چند مہینوں بعد اس نے اپنے بھتیجے افسر کی شادی کی۔ اور وہ دونوں میاں بیوی یہیں رہنے لگے تھے ان کے بھی دو تین بچے۔ جاوید سارے ہی بچوں سے۔ بہت محبت کرتا اور برتاؤ بھی یکساں لیکن بچوں میں کچھ نہ کچھ جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جاہل مائیں ہوں تو یہ جھگڑا بڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ کچھ دن بعد افسر اور اس کی بیوی نے یہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور یوں وہ لوگ چلے گئے۔ اس دوران

شریفہ بھی قلب کے حملے سے ختم ہوگئی تھی۔ یہ افسر صاحب رکشا چلاتے اور ان کی بیوی پکانے وغیرہ کا کام کرتی۔ جاوید بھی اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ دو مرتبہ ان کی رکشہ ٹکر وغیرہ سے ٹوٹ گئی بقول ان کے جاوید نے نئی رکشا دلائی۔ لیکن جاتے وقت وہ کچن کا سارا سامان سمیٹ کر چلے گئے۔ تب پتہ چلا کہ کتنے ایمان دار تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ افسر بہت پینے لگا تھا۔ حالاں کہ جاوید کی بچیوں کے ساتھ میں نے اس کی لڑکی کو بھی اسکول میں شریک کروا دیا تھا۔ اب اس کے بعد جاوید کی بیوی جن کا نام ملکہ تھا صبح آ کر کھانا وغیرہ پکانے لگیں۔ میں نے انتظام جاوید کے حوالے کر دیا۔ رضیہ نے اب کھانے پکانے کا انتظام بھی اپنی طرف ہی کر لیا تھا۔ میں بھی اسی کے ساتھ شریک ہوگئی کیوں کہ جاوید وغیرہ جس طرح کھاتے پیتے تھے وہ مجھے پسند نہ تھا لیکن وہ پابندی سے میرے لیے کچھ نہ کچھ پکوا کر بھجوا دیتا۔ میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا اور ساتھ ہی رضیہ کا بھی۔ لیکن بچوں کو اچھی تعلیم دلوانے اور انگلش اسکول میں داخل کروا کر پڑھانے سے انکار تھا کہا کہ میرے پاس اتنی گنجائش نہیں۔ وہ ذمہ داری میں نے لے لی۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ افسر کے جانے پر تینوں بچوں کو لانے لے جانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

ظفر کی بیوی نوشابہ کے ہاں ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ انھوں نے قریب کسی خانگی دواخانے میں انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں شریک کروایا اور مجھے بلا لے گئے۔ نوشابہ کی والدہ بہت جلد پریشان ہونے والی خاتون تھیں۔ معمولی سی بات پر گھبرا جاتیں۔ بہر حال صورتِ حال ایسی رہی کہ شام تک بھی ڈیلیوری نہ ہوئی۔ میں نے ظفر سے کہہ کر انھیں نیلوفر ہاسپٹل منتقل کروایا۔ اور پہلا لڑکا صبح پانچ بجے نومبر کے مہینے میں تولد ہوا۔ نام اعجاز حسن رکھا گیا۔ دو تین سال بعد ایک لڑکی ہوئی جس کا نام اختر نے تجویز کیا زر افشاں۔ اور چار پانچ سال بعد ایک لڑکا منصور پیدا ہوا۔ نوشابہ گرایجویٹ تھیں عالیہ اسکول میں انھیں ٹیچری مل گئی تھی۔ ظفر کو سنٹر آفس ہونے کی وجہ سے چار سال میں ایک بار کچھ تفریح

الاونس اور چھٹیاں ملتی تھیں۔ اس نے ذکیہ کے پاس جانے اور واپسی پر اورنگ آباد میں ٹھہرتے ایلورہ وغیرہ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ میرے پھوپھی زاد بہن اور ان کے بچے وغیرہ سب اورنگ آباد میں رہتے تھے نوشابہ کے بڑے بھائی اور تین بچے ساتھ تھے۔ بمبئی گھمانے میں ذکیہ ساتھ ہی رہی۔ ایک دن واپسی میں ان لوگوں نے سوچا کہ لوکل ٹرین کا تجربہ کیا جائے۔ سنتا کروز سے ٹرین میں سوار ہوئے۔ ظفر نے پلٹ کر دیکھا کہ نوشابہ پلیٹ فارم پر کھڑی رہ گئیں نہ جانے ان کے خفا ہونے کا ڈر یا پھر کوئی اور بات۔ وہ فوراً نیچے کود گیا۔ ٹرین حرکت میں آچکی تھی۔ سر میں شدید چوٹیں آئیں اور پھر دو دن کی بے ہوشی کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

اسیر بلا پھر یہ ہوتا ہے کیوں

جو بندے کے ہر دم خدا ساتھ ہے

امّی کا دوسرا لڑکا بھی ان کی زندگی میں جدا ہو گیا۔ امّی کے دل پر جو گذری اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے میری سوسائٹی کے اکاونٹ وغیرہ کا کام اسی کے ذمے تھا۔ حساب میں بہت اچھا تھا۔ کوآپریٹیو کے سنٹر سے اکاونٹنٹ کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ جس کے جانے پر زندہ نہ رہ سکوں گی خیال تھا۔ مگر زندہ رہی تو اندازہ ہو گیا کہ بڑی سخت جان ہوں۔ کسی کے جانے سے کیا دنیا کے کام رک جاتے ہیں۔ سب کچھ بدستور چلتا رہتا ہے۔ واپسی پر اعجاز کے میٹرک پاس ہونے کا علم ہوا۔ انٹر میں شریک ہو گیا۔ اس دوران اختر کا بڑا لڑکا۔ عرشی نوکر ہو کر باہر جدہ چلا گیا تھا۔ نوشابہ کی صحت زیادہ اچھی نہیں رہنے لگی تھی۔ اعجاز نے انٹر کر لیا تھا اور عرشی نے اس کی عمر کچھ زیادہ لکھوا کر اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے جانے کے نو دس مہینے بعد ہی نوشابہ رخصت ہو گئیں۔ ان کی لڑکی افشاں نے ماں کی بڑی دیکھ بھال کی۔ اور میرا بھائی مظہر تو یوں لگتا جیسے بیماروں کی تیمارداری ہی کے لیے پیدا ہوا ہو۔ عیدالفطر کے دن ہی ہم سب نوشابہ کو دیکھنے گئے تھے۔ مظہر وہیں رہا اور دوسرے دن

رات اس نے یہ خبر سنائی۔ دونوں بچے افشاں اور منصور ہمارے ہی ساتھ رہنے لگے۔ افشاں بہت پیاری شکل کی، ہنس مکھ اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ انٹر کرلیا۔ چھوٹا بھائی البتہ پڑھنے لکھنے سے گریزاں تھا۔ اور بس پتنگ اڑایا کرتا۔ صبوحی اور افشاں میں بہت میل ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ میری آنکھ کا آپریشن ہوا تھا۔ پرانے انداز سے چھ سات دن تک نہ آنکھ کھول سکتی اور نہ کچھ کرسکتی تھی۔ یہ دونوں باری باری مجھے کتاب پڑھ کر سنایا کرتیں۔ صبوحی کے رشتے کی بات کیلئے رضیہ ان دنوں سیما سے ملنے پاکستان گئی ہوئی تھیں۔ یاسمین نے اسم نویسی کا غذ مجھے لا کر بتایا۔ میں نے پڑھ کر کہا یہ نوابوں اور سجادوں کا ہمارے پاس کیا کام۔ پھینکو اسے۔ متوقع دُلہا صاحب نواب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ ان کے باپ کے نام کے ساتھ بھی نواب لگا ہوا تھا۔ اور ہونے والی ساس صاحبہ گلبرگہ کے بڑے روضہ کے سجادے صاحب کی بھانجی اس وقت تو وہ چلی گئیں ہاں ٹھیک کہتے ہوئے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بات طے ہوگئی۔ صبوحی بہت ہی اچھی اور ذہین لڑکی تھی آواز بہت ہی پیاری بالکل لتا منگیشکر کی۔ اسے مصوری کا بھی شوق تھا۔ سعید بن محمد نقش صاحب یہاں کے مشہور مصور تھے۔ قریب ہی وجے نگر کالونی میں رہتے تھے۔ اور ہم سب کے واقف کار تھے۔ وہ سکھانے پر تیار ہوگئے کیوں کہ وہ اسے اس کام کے لیے باصلاحیت سمجھتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے کافی کچھ سیکھ لیا۔ اور گانے کے تعلق سے بھی یاسمین کو استاد سے سکھانے کی فکر۔ دیا دیوی کے ذریعہ اس کا بھی انتظام ہوگیا لیکن انھوں نے مستقلاً کچھ نہ کیا۔ ظاہر ہے ان دنوں ٹیچر کی تنخواہ کچھ زیادہ نہ ہوتی تھی۔ صبوحی نے بی ایس سی فرسٹ کلاس پاس کیا۔ پھر بی ایڈ بھی کرلیا تھا۔ کانوینٹ والوں نے خاص طور پر بلا کر نوکری دی لیکن یاسمین کا خیال تھا کہ نوکری کرنے والی لڑکیوں کے لیے پیام نہیں آتے، یاسمین نے بتایا کہ ان لوگوں نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ ہم لوگ لین دین کی بات ہی نہیں کرتے ہیں۔ ہمیں تو بس لڑکی چاہیے۔ شاید اس بات سے وہ یہ سمجھیں کہ وہ لوگ ان کی لڑکی کو

بہت چاہتے ہیں۔ یہ نہ سوچا کہ جب لینا دینا تھا ہی نہ تو برسوں کے لیے مقروض کیوں ہو گئیں۔ رضیہ نے انور کے انتقال کے بعد دس ہزار کے لگ بھگ رقم پچاس ماہ وار کے حساب سے اس کے نام جمع کرنا شروع کر دی تھی۔ جو غالباً اس کو سولہ سترہ برس کے بعد مل سکتی تھی۔ میں بھی ان دنوں ذرا پیسے والی ہو گئی تھی۔ جاوید کے علاج معالجہ میں خرچ ہونے کے بعد جو رقم بچی تھی۔ وہ جاوید نے بینک میں جمع کرادی تھی۔ اس کا منافع ملتا تھا کچھ میں نے، کچھ ان کے بھائی نے غرض سب کے ملا کر کوئی چوبیس پچیس ہزار ہو جاتے تھے۔ تھوڑا بہت اور قرض لے لیتے تو بھی تو ٹھیک تھا لیکن انھوں نے سود پر نہ جانے کتنا قرض لے لیا تھا جو اب تک ادا کرتی جا رہی ہیں۔ اتفاق ہی تھا کہ رضیہ شادی میں شریک ہو لیکن ان لوگوں کو اتنی جلدی تھی کہ دو چار ہفتے بڑھانے پر بھی تیار نہ ہوئے عقد سے ایک دن قبل ہی رضیہ، ذکیہ کے ساتھ یہاں پہنچ گئیں۔

یہ لوگ بہت ہی کنجر اور بے حد دقیانوسی تھے کتنی ہی صلاحیتوں کی مالک یہ پیاری لڑکی وہاں نوکر بن کر رہ گئی۔ شکر ہے کہ دو بچوں کے بعد سلسلہ ختم کر دیا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ اس کی شادی کے آٹھ دس ماہ بعد ہی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں افشاں بھی اپنے گھر کی ہو گئی۔ شکر ہے کہ وہ اچھی جگہ گئی۔ اور خوش ہے۔ بڑی لڑکی ہما اور اس سے نو سال چھوٹا ایک لڑکا زین۔ شادی کے فوراً بعد ہی باہر ریاض چلی گئی۔ دو چار سال میں ایک مرتبہ ڈیڑھ دو ماہ کے لیے آجاتی ہے۔

اختر جس مکان میں کرائے سے تھے وہ تیس برس سے ہمارے ہی نام چل رہا تھا۔ پرانے مالک ختم ہو گئے۔ دوسروں نے خالی کرنے کا تقاضہ شروع کر دیا۔ کرایہ برابر بڑھاتا جا رہا تھا۔ کہا کہ اور بڑھا دیں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ اختر کی آمدنی محدود ہو چکی تھی "بلٹز" کی نوکری چھوڑ کر آ گئے تھے اردو اکیڈمی قائم ہو کر زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اکیڈمی کی سالانہ گرانٹ پچاس ہزار، بھارت چند کھنہ صدر ہوئے اور یہ سکریٹری اس مختصر گرانٹ میں بھی حقیقت میں اختر ہی نے ہندوستان کے

بہترین کسی ادیب کو مخدوم ایوارڈ دینا تجویز کیا۔ دس ہزار سالانہ کیسۂ زر، انعام دیئے جانے کا طریقہ کار یہ تھا کہ منتخب ادیبوں کو شاعروں کے نام جوابی کارڈ بھیجے جاتے کہ کس کو بہترین سمجھتے ہیں لکھیں۔ جس ادیب کے حق میں آراء کی اکثریت ہوتی اسے یہ انعام دیا جاتا۔ شاعری ادب ہی کا ایک جز ہے۔ لہٰذا شاعر ہونے کی تخصیص نہ تھی۔ اس طرح جعفری، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔ قرۃ العین حیدر سے ہماری ملاقات اسی موقعہ پر ہوئی تھی۔ ہمارے گھر پر بھی آئیں اور بہت دیر تک ان سے گفتگو رہی۔ مجھے ان کی تصانیف بہت پسند تھیں۔

شاعروں کی نئی نسل میں فیض و مخدوم سرفہرست۔ میرے خیال میں شاعر زمینی تقسیم کی قیود سے آزاد ہوتا ہے ایسا نہ بھی سمجھیں تو مخدوم ہندوستان کی اس نسل کے بڑے شاعر سمجھے جاتے رہیں گے۔ لیکن ہمارے کرم فرماؤں نے انھیں آندھرا پردیش اور اس سے بھی تنگ علاقے کا شاعر بنا دیا ہے۔ اب مخدوم ایوارڈ ایک تو صرف شاعروں وہ بھی حیدر آباد کے شاعروں کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ حالانکہ مجھے یوں لگتا ہے کہ حقیقت میں شاعر کوئی ہے ہی نہیں۔ البتہ شاعروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ (بقول کسے ہنڈیا میں گڑ پھوڑ لیا جاتا ہے) اور ریوڑیاں بانٹ لی جاتی ہیں۔

مخدوم کے تعلق سے بی بی سی وغیرہ سے بھی تقاریر وغیرہ نشر ہوئی تھیں۔ یوں شعراء کے اس دور کے گروپ میں کئی بہت زیادہ اور اچھا لکھنے والے تھے۔ مگر فیض و مخدوم۔ سب سے سینئر اور کئی لحاظ سے سب سے بہتر۔ مقبولیت میں بھی (ہنگامی حالت کو چھوڑ کر)۔ غالباً کچھ افراد کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اور انہوں نے۔ اس فہرست کو محدود کرنے کی یہ مجرب ترکیب نکالی کہ۔ انہیں حیدر آباد کا شاعر بنا دیا جائے۔ (ممکن ہے کچھ افراد سردار جعفری وغیرہ کا نام لیں) یہ ہے کہ سردار نے بہت لکھا ہے۔ مگر ۔طویل نظمیں۔ بیچ کے دو چار اچھے شعر۔ مختصر مفید کے مقابل نہیں ہو سکتے۔ آزادی ملنے پر۔ تقریباً سب ہی نے۔ اس کی حقیقت پر روشنی ڈالی۔ فیض کی۔ داغ داغ اجالا۔ بہت اچھی۔ پر۔ عمل کے لیے

آخری شعر۔ چلے چلو۔ کچھ زیادہ ترغیب عمل دینے سے محروم۔ چاند تاروں کا بن سے مقابلہ کیجئے۔ مختصر سی نظم۔ میں پوری جدوجہد آزادی کی تاریخ اور پھر آزادی کو دریائے خون میں ڈبو دینے والوں کی نشان دہی اور آخر میں = حصول مقصد کے لئے اتحاد کے ساتھ سوئے منزل بڑھنے کا راستہ۔

جس میں دار سے گزر کر ہی پیار وکوئے دلدار تک پہونچنے کی بشارت۔ لہذا۔ خالی خاموش اپنی اپنی صلیبیں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلنا ہوگا۔ راستہ اتنا صاف سیدھا نہیں۔ ان کی شنگرف نگاہی کو اس کا اندازہ تھا۔ ایسی کتنی ہی اور چیزیں ہیں۔ جو اوروں کے ہاں بمشکل مل سکیں گی۔ انہیں سمجھنا سمجھانا عام کرنا۔ یہ سب تو نہیں۔ محدود کر کے مقامی کر دینا۔ کتنے قابل احترام ہیں ہمارے وطن عزیز کے یہ بلند پایہ افراد ادیب وشاعر۔

اختر کرائے کے مکان میں رہتے تھے انھیں مکان چھوڑنے پر اصرار کیا جاتا رہا۔ قریب میں کوئی مکان نہ ملا۔ مہدی پٹنم میں دوسری منزل پر دو کمروں کا فلیٹ مل گیا۔ یہاں تو روز صبح کی چائے ساتھ ہی ہو جاتی تھی۔ مگر اب پھر بھی تیسرے چوتھے دن آ ہی جاتے۔ ایک دن بجائے اس کے کہ وہ خود چل کر آتے کچھ لوگ انھیں اپنے ساتھ لے آئے۔ معلوم ہوا کہ یہیں پاس میں کسی جلسے میں تقریر کر رہے تھے کہ اچانک گر پڑے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ریاست کو خبر کر دی۔ پتہ چلا کہ فالج کا حملہ ہوا ہے۔ شام کے قریب انھیں ہسپتال لے گئے اور ممکنہ علاج وغیرہ کیا گیا۔ حملہ شدید نہ تھا بڑی حد تک افاقہ ہو گیا۔ لیکن چلنا پھرنا پھر بھی دشوار تھا بڑی تلاش کے بعد سالار جنگ کالونی میں ایک مکان ملا۔ جس کا کرایہ زیادہ تھا۔ بیماری کی وجہ سے اخراجات بھی کافی ہو گئے۔ اس وقت تک ریاست کو بھی پنشن ہو گئی ریاست کے بھائی رضیہ وغیرہ ہم سب نے ممکنہ مدد کی اور وہ بھی اکیڈیمی کی نوکری کرتے رہے۔ تین چار سال بعد دوبارہ شدید حملہ ہوا۔ اس بار کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس دفعہ بھی پہلے ہمارے پاس ہی چند مہینے رہے۔ مظہر نے بے حد خدمت کی۔ اس بیچ ذرا ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ

ایمن مع اپنی بیوی اور تینوں بچوں کے ان کے ساتھ رہنے لگے۔

اختر کی بیماری کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح امّی سے ملنے آجاتے۔ مظہر کی شادی تو ہوئی نہیں تھی اس نے جس سے کرنی چاہی ہو نہ سکی کیوں کہ اس کی آمدنی کم تھی۔ مظہر کی ان صاحبہ کی ایک دولت مند شخص سے شادی ہوگئی۔ یہ صاحبہ اس وقت تک ٹیچر ہوگئی تھیں سسرال میں ان کو اپنی تنخواہ پر بھی کوئی اختیار نہ دیا جاتا۔ چند دنوں بعد طلاق ہوگئی۔ دوسری شادی ایک تین چار بچوں والے شخص سے جس کی بیوی ختم ہو چکی تھی ہوگئی اور چند دنوں بعد وہ کینسر میں مبتلا ہو کر رخصت ہوگئیں۔ مظہر کسی اور جگہ شادی پر تیار نہ ہوا ہم سب نے بہت کوشش کی۔ میرا لڑکا جاوید اسے بہت چاہتا تھا۔ ادھر اس کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی۔ ایمن نے ٹسٹ کروایا پتہ چلا کینسر ہے۔ رضیہ نے کافی پیسہ خرچ کیا بہت علاج کروایا۔ مجھ سے جتنا کچھ ہوسکا وہ میں نے کیا۔ اور جاوید نے بھی بہت مدد کی۔ مگر بے فیض سال بھر کے اندر ہی وہ ہم سب کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کتنا نیک خوش شکل اور ہر ایک کا کام کرنے والا۔ جو کچھ بھی پاس ہوتا کسی کی ضرورت پر دے دیتا۔ جاوید شکار کے شوق میں مقطعہ جاتا تو اسے ضرور لے جاتا۔ مگر قدرت تو شاید اس گھر کو مٹانے پر آمادہ تھی۔ وہ ساری تکالیف چپ چاپ سہتا رہا۔ شاید قوتِ برداشت اُسے ابّا سے ملی تھی۔ پارٹی سے اس کی آخر تک وابستگی برقرار رہی۔ راج اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے حلقے میں ہمارے محلے کے قریب کے کچھ حصے بھی تھے وہ بلا کسی سے کچھ کہے مجھے ساتھ لے کر جاتا رہا تھا۔ خود پر کچھ خرچ نہ کرتا۔ دوستوں کو ضرورت ہوئی تو جو بھی پاس ہوتا دے دیتا۔ رضیہ اور ہم سب اُسے بہت چاہتے تھے۔ شاید یہ ہماری چاہت کی سزا تھی۔ اختر چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن کسی نہ کسی طرح اسے رخصت کرنے آئے۔

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ ایک

اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

رابعہ نے بنجارہ ہلز پر کافی بڑا مکان بنوایا تھا۔ لیکن ان کے سب بچے کینیڈا چلے گئے۔ صرف

برنی اور رابعہ یہاں رہ گئے۔ برنی کے دو چار رشتہ دار مثلاً الیاس برنی اور ادریس برنی چچازاد بھائی

دونوں ختم ہو چکے تھے۔ ایک بڑے بھائی شریف الحسن صاحب جو گلبرگہ یونیورسٹی میں پرنسپل تھے

پاکستان چلے گئے۔ رابعہ کی دوسری لڑکی سیما کی شادی ان کے بڑے لڑکے ظہیر سے ہوئی بڑی لڑکی

شہلا شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی۔

میرے کمرے میں بعض وقت اختر کی خالی جگہ کو جب وہ بمبئی چلے گئے تھے مخدوم آتے تو پُر

کر دیتے، رابعہ بچوں سے ملنے کو بے چین یہ دونوں کینیڈا گئے۔ برنی یہاں آنے کے لیے بے چین

وہاں ڈاکٹروں کو دکھایا تو انھیں آپریشن کا مشورہ دیا۔ اس عمل کے دوران ہی وہ کہیں اور چلے گئے۔ اور

پھر کافی عرصے بعد رابعہ تنہا واپس آئیں۔ اس گھر میں آنے کے بعد سے اب تک آٹھ نو افراد رخصت

ہو چکے تھے۔..........

اختر کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گذری۔ اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ٹھیک موقعہ

ہی نہ ملا۔ صرف ایک چھوٹا سا دیوان ایک باز و تاریخی کتابیں چند مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ۔ جو

کر سکتے تھے حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں کا پاسنگ بھی نہ کر سکے۔ اس میں کچھ

حصہ پارٹی کا غیر ہمدردانہ رویّہ کا بھی تھا۔ جس کا احساس پارٹی سے بے تعلق لوگوں کو بھی تھا۔ یہ اندازہ

میں نے یوں لگایا کہ انوری صاحب (پورا نام یاد نہیں) نے ایکدفعہ مجھ سے کہا تھا کہ اختر صاحب نے

جو کام کیا پارٹی نے اس کا ٹھیک بدلا نہیں دیا۔ انھیں تو یہ جواب دے دیا تھا کہ ہم لوگ خود اپنی مرضی

سے شریک ہوئے تھے کسی بدلے کے لیے نہیں۔ اور اختر تو پارٹی کے ہمدردوں میں تھے وہ پارٹی کے

ممبر بھی نہیں تھے۔ ہاں ظفر اور مظہر پارٹی ممبر تھے۔ ظفر تو ڈیڑھ برس جیل میں رہے۔ اور برسوں انڈر

گراونڈ۔ یہاں تک کہ دنیا سے گذر بھی گئے تاہم کسی نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ خیری

ع۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اُوست

ہاں امّی کے انتقال پر ضرور اس وقت کے پارٹی کے ضلعی کمیٹی کے سکریٹری صاحب نے میرے نام ایک تعزیتی کارڈ بھیجا تھا۔ اور مظہر کے انتقال پر شانتی رنجن بھٹا چاریہ جی نے کلکتے سے میرے نام تعزیتی خط بھیجا۔ پارٹی میں سے تو کسی نے دو حرفِ تعزیت نہ کہے۔ کامریڈ اونکار پرشاد نے اردو ہال میں میٹنگ رکھی تقریر کی۔ لیکن اس جلسے میں ہمارے اور کوئی لیڈر نظر نہ آئے۔ کامریڈ اونکار پرشاد سے یوں لگتا ہے پارٹی ناراض رہی۔ کچھ دنوں بعد ان کا تقریباً بائیکاٹ ہوا۔ مگر مجھے جہاں تک علم ہے بائیکاٹ کی کوئی وجہ بتائی نہیں گئی۔ آج تک نہ معلوم ہوا کہ جائیداد، گھر، کار، سب کو پارٹی کی نذر کر کے پھٹے حالوں پیدل پھرنے والے کامریڈ نے کیا جرم کیا تھا۔ ہم بعد میں بہت دنوں ملتے رہے۔ ان کی بیوی کا جلد انتقال ہو گیا۔ بڑے لڑکے کی شادی میں ہم سب شریک تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ملنا جلنا ختم بالکل بے تعلق ان کی بھانجی شاردا کے والد نے بتایا کہ کسی سے بھی نہیں ملتے ہیں۔ میرا بہت ہی ملنے کو جی چاہتا مگر گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ اور اب تو اکیلے کہیں جانے آنے کے قابل ہی نہیں رہی۔

اختر کی بیماری کو سات سال ہو رہے تھے یوں بھی بھائی میرا بہت خیال رکھتے تھے مگر اختر......

یہ تو جب تک بات کرنے کے موقف میں رہا روز آنہ فون کرتا تا کہ میری آواز ہی سن لے۔ یاد آ رہا ہے جیل میں ایک دفعہ میرا خط ایک دو مرتبہ دیر سے ملا تھا تو کتنا پریشان ہو کر لکھا کہ آپ نے خط کیوں نہیں لکھا کیا مجھ سے کچھ خفا ہو گئیں۔ یہ افواہ تو نہیں سن لی کہ میں سرکار سے معافی مانگنے والا ہوں۔ ایسا خواب میں بھی نہ سوچئے گا یہ حرکت میں کر ہی نہیں سکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اب کچھ دنوں سے اختر کے فون بھی بند ہو گئے تھے کیوں کہ قوت گویائی کہ.........!!! میں رضیہ دوسرے تیسرے دن جاتے ہی رہتے تھے۔ ایک مرتبہ جب گئی تھی تو ان پر غفلت سی طاری تھی بات بھی نہ ہو سکی۔ دوسرے دن شام

شاید اپنی امی ابا اور بچھڑے بھائیوں سے ملنے چلے گئے......۔

اختر ۔ میری خواہش کا پاسدار۔ میری خفگی کے خیال سے بھی پریشان ہو جانے والا۔ وہ میرا اختر مجھ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا۔ 17/ ستمبر 1995ء اتوار کے دن غروب آفتاب کے ساتھ وہ بھی غروب ہو گیا۔ بڑوں پر چھوٹے سبقت لے جائیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کیا دستور زندگی ہے یہ ۔ یہ کیسی خدائی ہے۔ کتنے غم اٹھائے دل میں چھپائے جیے جا رہی ہوں جسے جی جان سے چاہا جو اپنے تھے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ جانے کہاں جا بسے مجھے بھول گئے۔ مگر میں تو انھیں بھلا نہیں پائی۔ وہ آج بھی ہر لمحہ میری تنہائیوں میں میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ راتوں کی بے خوابی میں اکثر میرے پاس آتے ہیں مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ ع۔ دور ہو کر قریب ہو کتنے............

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا

جب بھی دُنیا بستی تھی اب بھی دُنیا بستی ہے

ہاں اختر تمھارے جانے کے بعد کا ایک واقعہ۔ دعوت نامہ ملا کہ پارٹی کے یوم تاسیس کی سترہویں سال گرہ میں شرکت کروں۔ اس سے کچھ دنوں قبل گورنر کے ہاں بھی جدوجہد آزادی میں شرکت کرنے والوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میں ٹال گئی تھی اب بھی کچھ بہانہ کیا لیکن نہ جانے کیوں شرکت پر اصرار کیا اور گاڑی لا کر لے گئے۔ 1995ء 26/ ڈسمبر، خاصہ بڑا مجمع اور بہت سے پرانے کامریڈ بھی جمع۔ ستر سال پورے ہونے کی خوشی میں شالیں تقسیم ہوئیں۔ اور ایک اپنے حصے میں بھی آئی۔ تمھاری جگہ کوئی ضرور آئے یہ کہا گیا تھا تو رضیہ کو لے گئی۔ شال دی جاتے وقت اس کامریڈ کی خدمات کا بھی ذکر ہوتا۔ چناں چہ تمھارے بارے میں کافی اچھی رائے ظاہر کی گئی۔... ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

تمھاری شال اور سرٹیفکیٹ رضیہ کے حوالے کیے۔ یہ ذکر تو یوں ہی آ گیا لیکن اصل بات یہ

ہے کہ جو صاحب میرے بازو بیٹھے تھے انھوں نے سلام کیا اور اپنا نام بتایا پھر تمھاری خیریت پوچھی میں نے ذرا تلخی سے کہا۔ اچھے ہیں گذشتہ تین ماہ سے زیرزمین آرام کر رہے ہیں وہ معذرت کے لہجے میں کہنے لگے میں امریکہ میں تھا کل ہی واپس آیا ہوں۔ یہ کیسے ہو گیا ان کی صحت تو اچھی تھی۔ میرے ساتھ کے اور میری ہی عمر کے تو تھے اب ان سے کیا کہتی کہ آپ تو اُن سے کئی سال چھوٹے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تمھارے ساتھ ہی پہلے الکشن میں مریال گوڑہ سے منتخب ہونے والے ایم ایل اے گرواریڈی صاحب تھے۔ پیارے بھائی تم نے کبھی نہ سوچا کہ اور کہیں نہ سہی امریکہ ہی چلے جاتے۔ آج اچھے خاصے ہوتے۔ تم بے کار بیٹھنے والے تھے ہی نہیں وہاں بھی ادبی محفلیں سجاتے مشاعرے کرتے۔ ان کی روئیدادیں، منتخب اشعار وغیرہ سیاست میں شائع ہوتے۔ اور جو کبھی کچھ دنوں کے بعد تم یہاں آجاتے تو تمھارے انٹرویو چھپ رہے ہوتے۔ اردو کے بے لوث خدمت گذار کی تصویروں کے ساتھ۔ یوں تمھارے بچے بھی خوش ہوتے فخر محسوس کرتے۔ مگر نہیں...... وہاں جا کر بھی کچھ نہ ہوتا۔ تم چند افراد کے اجتماع کو سینکڑوں سے تعبیر کبھی نہ کرتے۔ جو رطب و یابس انتخاب کے طور پر شائع ہوتا اسے شاعری کہنے کا جرم کبھی نہ کرتے۔ اردو کی بے حد ترقی ہو رہی ہے۔ ایسے بے سروپا دعویٰ بھی نہ کرتے اور یہ سب نہ کرتے تو بھلا کوئی کیوں انٹرویو لیتا اور فوٹو چھاپتا۔ خیر یہ سب ہم نے چاہا بھی کب......

ذرا آرام سے اچھی طرح صحت مند رہتے یہی بہت ہوتا۔ نیویارک واشنگٹن، شکاگو بہت دور سہی پر جتنی دور اب گئے ہو...... اس خدائی سامراج سے تو کبھی کوئی رہا ہی نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے ایسے قیدی کو جدا کرنے دوست دشمن سبھی جمع ہو جاتے ہیں۔ عادل و جاوید نے بتایا کہ بہت لوگ تھے پرانے شہر کے کئی کامریڈ رخصت کرنے آئے تھے۔ پیارے بھائی کیسے ہو کیا کر رہے ہو۔ مذہب بتاتا ہے کہ وہاں پہنچ کر بچھڑے مل جاتے ہیں یہاں ابیؔ تمھارے بازو لیٹے ہیں پھر چھوٹے چچا نسیم وغیرہ کتنے ہی۔ ذرا ہی دور پر قمر، مظہر، انور، امّی اور مخدومؔ وغیرہ سب ہی۔ برنی سے بھی ملنا ہوا ہوگا۔

یہاں رہ ہی کون گیا ہے۔ وہاں ان کے ساتھ تمھارا دل لگ گیا ہوگا۔ ہماری یاد تو بس کبھی کبھار آتی ہوگی۔ تم نے بمبئ میں ایک رات کیفی کے ہاں فیض کے ساتھ گذاری تھی یاد ہوگا وہ واقعہ تم نے سنایا تھا کہ تصویر آنکھوں میں کھینچ گئی تھی۔ بڑی امید تھی کہ کبھی یہاں بھی کوئی ایسا موقعہ آجائے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اب وہاں تمھارا ان سے ملنا جلنا ہوگا انھیں میرا اسلام کہنا۔ بھلا وہ کیا پہچاننے لگے تم ہی کہہ دینا۔ تو شاید یاد آجائے۔ عصمت کے ساتھ تم تلنگانہ میں ہفتہ عشرہ گھومتے رہے اور وہ رشین خاتون لدمیلا تمھیں بہت پسند کرتی تھیں نا۔؟ جوشؔ کی میزبانی اور وہ رات جو جذبیؔ کے ساتھ اوپر کے ہال میں گذاری فراقؔ کی سحور کن باتیں۔ بنّے بھائی کی مسکراہٹ، قاضی صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین، ساغرؔ روش، اختر شیرانی مجازؔ، ساحرؔ، جوشؔ، کرشن چندر، جعفریؔ، پریم دھون، رشید احمد صدیقی، اریبؔ، عالم، شاذؔ اور پھر مخدومؔ کہاں تک لکھوں وہاں تو مخلص، حق گو، خوش نوا شاعروں، ادیبوں کا اچھا خاصہ شہر بس گیا ہوگا۔ ہم جیسے بے کاروں کی یاد کہاں آتی ہوگی۔ تم تو مشاعرے کروانے کے بہت شوقین تھے نا۔؟ کتنے ہی شاعر تو جمع ہیں۔ خوب مشاعرے کرواتے ہوگے۔ جانتے ہو مجھے مشاعروں کا کتنا شوق تھا۔ پر...... ادھر پچیس چھبیس سال سے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی شاعر تو کوئی رہا نہیں۔ مجھے گانے سننے کا کچھ ایسا شوق تو ہے نہیں۔ میرے اچھے بھائی کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کہ تم ان سب شاعروں کو اکیلے ہی سنتے رہو۔ تم تو میرا بہت خیال رکھتے تھے جانا ہی تھا تو مجھے ساتھ لے جاتے بس یہی ایک شکایت ہے۔........... مذہب بے کار، سائنس ناکارہ، خدا کا کام صرف پیدا کرنا اور مارنا ہے دیکھو ابیؔ اور مخدومؔ کو جا کر کتنا عرصہ ہوگیا۔ مگر برابر آتے رہتے ہیں تم نے بس بُھلا ہی دیا۔ اتنے دنوں میں صرف دو مرتبہ نظر آئے۔ مگر بات ہی نہیں کی۔ دوسرے تو کبھی کبھی بات بھی کر لیتے ہیں۔ بچانوے ختم ہوگیا چھیانوے کو بھی کئی ماہ گذر گئے۔ اب تو تمھاری شاہینہ بھی تمھارے پاس پہنچ گئی امید ہے جلد ہی تم سب سے ملاقات ہوجائے گی۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے
جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے۔
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے
کھلتی ہے نہ برستی ہے

اب جو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

اختر کے بعد ریاستؔ بہت پریشان رہنے لگی تھیں کبھی دوپہر کی دھوپ میں ہمارے پاس چلی آرہی ہیں تو کبھی کسی وقت ایک بار دو تین دن رہی ہوں گی میرے کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ جاتیں بھولنے بھی بہت لگی تھیں۔ایک دن آئیں تو ایک صاحبہ میرا کچھ انٹرویو لے رہی تھیں۔انھوں نے کرائے کے لیے مجھ سے پانچ روپے مانگے پھر ان سے کچھ باتیں کیں اور میری طرف اشارہ کر کے کہا میری ماں تو اب یہیں ہیں۔تھوڑی دیر لیٹی رہیں اور یہ کہہ کر کہ جی گھبرا رہا ہے واپس جانے کو تیار ہو گئیں۔سال ڈیڑھ سال یوں ہی گذارا دل کی تکلیف رہنے لگی تھی دونوں بھائی بھاوجیں گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان سے آئے۔انھیں آئے ہفتہ ہوا میں اور رضیہ، ریاستؔ کے یہاں اُن سے ملنے گئے اور کافی رات تک رہے دوسرے دن رات کو فون سے خبر ملی کہ وہ بھی رُخصت ہو گئیں۔رات کا کھانا کھا کر اُٹھیں پانی کا گلاس ہاتھ میں لیا اچانک ارے کی آواز نکلی اور گر کر وہیں ڈھیر ہو گئیں۔بس شاید بھائیوں سے ملنے کا انتظار تھا۔اس طرح گھر کا ایک اور فرد کم ہو گیا اور میری واحد دوست ریتا سیٹھ کے خط سے پتہ چلا کہ اُن کا مرض پھر سے عود کر آیا ہے اور اب بالکل فریش ہو گئی ہیں۔بعد میں کسی اور کے ذریعہ میرے خط کا جواب لکھوایا۔یہاں کوآپریٹیو کے بہت سے کام کرنے والا رزاق فالج میں مبتلا ہو گیا۔ہسپتال میں شریک کروایا۔میں دو تین دن ساتھ رہی کسی کے مشورے پر ایک اور ڈاکٹر کو دکھایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔سال ڈیڑھ سال فریش رہ کر وہ بھی چلا گیا وہ بھی میرے

گھر سے۔ بدر کا لڑکا ظہیر بی کام کر کے کئی سال سے نوکری کر رہا تھا۔ بدر نے ایک پڑھی لکھی لڑکی سے اس کی شادی کر دی تھی۔ میرے ہی گھر میں آ کر رہنے لگی اور چار بچوں کی ماں بن گئی۔ ظہیر کا تبادلہ جیلر کی حیثیت سے آصف آباد ہو گیا۔ میں نیچے آ کر رہنے لگی تھی۔ سوسائٹی کا سارا کام بدر ہی نے سنبھال رکھا تھا۔ یہاں کی مسلم آبادی خلیجی ممالک جانے لگی تھی۔ ادھر اتحاد المسلمین اور جماعت اسلامی کا زور بڑھنے لگا تھا۔ چار پیسے ملنے لگے تو پھر مذہب یاد آ گیا۔ اب ہماری یہ قابل فخر بہنیں ان تقاریب میں جانا ضروری سمجھنے لگی۔ سوسائٹی کا خرچ اتنا ہی رہا مگر آمدنی میں کمی رہنے لگی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں کئی بار یہ مسئلہ رکھا گیا کہ کیا کیا جائے؟ بند کرنے کی تجویز سے کوئی اتفاق نہ کرتا۔ عموماً یہ کہا جاتا کہ چالیس سال قریب پرانی سوسائٹی کو ختم کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ لیکن کوئی ذمہ داری لینے آگے بڑھنے کو تیار بھی نہیں۔ اس وقت ہماری صدر سعودی عرب کے سفیر (جس کا نام یاد نہیں) کی بیوی تھیں۔

غرض اسی کشمکش و پیچ میں چند مہینے گذر گئے۔ بدر کی صحت بھی کچھ اچھی نہیں رہنے لگی تھی اور لڑکے کے تبادلے کے بعد اسی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی آخر کار ایک میٹنگ میں مجھے قطعی طور پر اپنا استعفیٰ پیش کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ اب یہ ذمہ داری میں پوری نہ کر پاؤں گی۔ کیوں کہ پارٹی نے میرے کام کو صرف سوشیل ورک کا نام دیا تھا اور ملی ٹینٹ خواتین کو تربیت دینے کی کوئی ترکیب نہیں بتائی تھی۔ سوشیل ورکر کی کتنی ہی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔ چناں چہ سامان وغیرہ کا اندازہ بتاتے ہوئے سوسائٹی کی مالی حالت کا تخمینہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ سب فروخت کروایا جائے تو قرض کی پابجائی ہو سکے گی۔ اس کے بعد بھی شاید کچھ قرض باقی رہ جائے۔ کمیٹی کے ممبر کے سامنے جب یہ صورت حال رکھی گئی تو سب خاموش ہو گئے۔ اور متفقہ طور پر سوسائٹی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ لے لیا گیا۔ یوں ہماری یہ سوسائٹی ختم ہو گئی۔ چند دن بعد ویلفیر بورڈ سے ایک صاحب تشریف لائے اور کہا کہ کیا بات ہے آپ کے پاس سے اب کی بار گرانٹ کا کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ صرف دو دن رہ گئے

ہیں۔ یہ بھی کہنے لگے کہ آپ کی سوسائٹی کی رپورٹ اچھی ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے میں یاددہانی کے لیے آیا ہوں۔ میں نے انھیں سوسائٹی کی تحلیل کا سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ انھوں نے بہت افسوس کیا میں نے محکمہ امداد باہمی کو اطلاع پہنچادی تھی مگر آپ کے پاس اطلاع بھیجنے کا خیال نہ رہا۔ تعریف کی تو کہا اس سے کام چل جاتا۔ کتنی ہی بار اپنی مشکلات بتانے کے باوجود برسوں ایک پیسہ بھی گرانٹ نہیں بڑھائی گئی۔ بدر کے لڑکے کو جا کر سال ڈیڑھ سال ہوا ہوگا۔ ایک شام وہاں باہر کسی نے آواز دی۔ دیکھنے کے لیے باہر نکلا تو کسی نے اسے گولی ماردی۔ وہاں نکسلائٹ تحریک کا زور تھا۔ یہ لڑکا بڑا ایمان دار، رشوت وغیرہ بالکل نہ لیتا تھا پتہ نہیں کون کیسے اس کا دشمن ہوگیا۔ ظہیر کی بیوی اس حادثے کے بعد کئی ماہ بیمار رہی۔ بہر حال پڑھی لکھی تھی حیدرآباد سرکار نے اسے نوکری دیدی۔ اپنی ساس کو اس نے ساتھ رکھ لیا تھا۔ مجھ سے برابر آ کر ملتی رہتی۔ بدر کو بالکل چپ سی لگ گئی تھی۔ اکلوتے لڑکے کا صدمہ کچھ عرصے بعد وہ بھی اپنے لڑکے کے پاس چلی گئی۔ مرحومہ نے میری بیماری کے دوران میری بڑی خدمت کی تھی یاد کرتی ہوں تو جی بے چین ہو جاتا ہے۔ سال دو سال کے اندر یہ دو تین عزیز تھے وہ بھی جاتے رہے۔ ظہیر کی بیوی نے اپنے بچوں کو ٹھیک تعلیم دلوائی۔ اور مجھ سے برابر ملتی رہیں۔ ان ہی دنوں کینڈا سے شہلا اور ارزینہ بھی دو چار ماہ کے لیے آگئے۔ اس طرح رابعہ کے ہاں چہل پہل سی نظر آئی۔ رضیہ اکثر وہاں جاتی رہتی ایک دن وہاں سے لوٹی تو بتایا کہ پیٹھ کی ہڈی میں کچھ درد سا محسوس ہو رہا ہے۔ اتفاق سے نوید بھی یہاں آیا ہوا تھا اس نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا بتایا کہ پیٹھ کی ہڈی کو جھٹکا لگا ہے۔ درد اسی سبب سے ہے۔ اور کچھ پٹی وغیرہ لگائی مگر درد بڑھتا گیا نوید نے کسی اور ڈاکٹر کو دکھایا۔ ایکس رے وغیرہ کروایا۔ غرض آخر میں پتہ چلا کہ کینسر ہے۔ رابعہ وغیرہ سب کا خیال کہ انھیں یہ بات نہ بتائی جائے۔ اور مجھے یوں لگا کہ ان کے ذہن میں کبھی اس مرض کا خیال نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ حالت بگڑتی ہی گئی شہلا کو نوکری پر جانا ضروری تھا چلی گئی سیما اور ارزینہ بھی جا چکی تھیں۔ کچھ

دنوں بعد شہلا نے کوشش کر کے چھٹی لی اور دوائیں لئے پھر یہاں آئی۔ اس وقت تک ان کی بیماری کو تقریباً سات آٹھ ماہ ہو رہے تھے۔ اس وقت تک تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ نہ بول سکتی تھیں نہ کھا سکتی تھیں اور نہ اُٹھ بیٹھ سکتی تھیں۔

میں ذکر کرنا بھول گئی تھی کہ عادل اور ذکیہ بھی آٹھ دس سال پہلے یہاں آ کر بنجارہ ہلز پر رابعہ کے مکان سے قریب کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے ان ہی دنوں رابعہ کے گھر سے اپنے گھر آتے ہوئے ذکیہ سڑک پر گر پڑیں پیر میں اتنی چوٹ آئی چلنا پھرنا دشوار ہوگیا میں خود آرتھرائٹس کی مریضہ تھی بہت کوشش کے بعد بھی کوئی نرس تیمارداری کے لیے دستیاب نہ ہوئی۔ اس لئے اسی کے کمرے میں رات دن رہنے لگی جس نے کبھی کسی سے کوئی کام نہ لیا تھا اس کی حالت دیکھ کر عبرت ہوتی۔ صبح کسی طرح اُٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ دوسری کرسی پر بیٹھ کر میں بچوں کی طرح دو چار نوالے دیتی تو کھالیتی۔ اس طرح بمشکل تھوڑی چائے بھی۔ عادل، ذکیہ، رابعہ بھی آتے رہتے۔ اعجاز بھی اس دوران یہیں تھے۔ رات کو سب چلے جاتے تو وہ بھی دو تین بجے تک میرے ساتھ جاگتا رہتا لیکن رفتہ رفتہ یہ تھوڑا بہت کھانا اور اُٹھ کر بیٹھنا بھی ختم اور اب تو بات بھی بند۔ بس امّی، باجی نکل جاتا۔ اس دفعہ جب شُہلا آئیں تو انھیں پہچان بھی نہ پائیں اور نہ بات کر سکیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا کہ بس جب تک سانس چل رہی ہے ٹھیک ہے۔ آخری ہفتہ عشرہ سے تو آکسیجن پر تھیں مگر شُہلا کا اصرار کہ ہاسپٹل لے جایا جائے انھوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ آخری تین دن گھر سے پہلے بنجارہ ہلز لے گئیں اور پھر وہاں سے سیدھے ہسپتال۔ رابعہ، ذکیہ نہ جا سکیں۔ میں کسی طرح چلی گئی۔ وہاں دیکھا کہ انھیں ہوش تو تھا نہیں بس پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ تیسرے دن صبح تین چار بجے کے قریب انھوں نے بھی ہم سب کو چھوڑ دیا۔

رضیہ کا میرا ساتھ تقریباً بہتّر، ترسٹھ سال کا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اس

سے جدائی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر سب سے زیادہ انھیں کی صحت اچھی تھی۔ گھر کا کام کاج باہر جانا، گھومنا پھرنا، تصنیف و تالیف کے مشاغل اسی دوران دو مرتبہ چند ماہ کے لیے کینڈا بھی ہو آئیں۔ اس سے پہلے ڈاکٹریٹ کے لیے ایران میں سال ڈیڑھ سال قیام کیا۔ اتنے برسوں کے دوران بس اُن ہی چند دنوں میں۔ ہاں تین۔۔۔۔۔ ساڑھے تین مہینے جیل کا وقفہ مجھ سے الگ رہیں۔

یوں تو صحت ہمیشہ اچھی رہی لیکن جیل سے آنے کے بعد کئی ماہ بہت بیمار رہیں۔ جیل میں زمین پر سونا، بارش کا موسم، ٹھنڈے پانی سے نہانا، مجرم قیدیوں کے ساتھ رہنا (سیاسی قیدیوں کے کوئی علاحدہ انتظام نہیں تھا) ان باتوں کا ان کی صحت پر بہت بُرا اثر ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ سے خاموشی سے سب کچھ برداشت کرنے کی عادی۔ یہاں سکسینہ نامی ایک اچھے ڈاکٹر تھے۔ ان کے علاج سے کئی ماہ بعد صحت یاب ہوئیں۔ اور پھر ملازمت کے علاوہ لکھنے لکھانے کا مشغلہ۔ تین چار کتابیں چھپ چکی تھیں لیکن تاثراتِ سفرِ ایران، طباعت کے کچھ دنوں کے اندر ساری کی ساری فروخت ہوگئی۔ یہاں تک کہ میرے پاس کی ایک جلد بھی کسی خواہش مند کو دینی پڑی۔ ایرانی کونسلیٹ کی خواہش پر قلی قطب شاہ کے بارے میں فارسی میں کتاب لکھی۔ پی ایچ۔ ڈی۔ کے لیے کتاب بھی فارسی ہی میں لکھی۔ اس کے علاوہ صدرالدین عنی، نوائی وغیرہ کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ آخری فارسی ادب کے پچاس سال نامی کتاب بھی جلد ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ اور بس۔ اس کے علاوہ صدرالدین عنیکا ایک ناول "ابدیت" ایران اور دو چار دوسرے مضامین کا ترجمہ غیر مطبوعہ حالت میں محفوظ ہے۔ باغبانی کے تعلق سے داراشکوہ کی فارسی میں ہاتھ سے لکھی، ایک کتاب۔ سنا تو یہ کہ یہ کتاب خود داراشکوہ کی زراعت کے موضوع پر لکھی ایک کتاب کا حصہ ہے۔ بمبئی کے کسی ادارے سے متعلق ایک صاحب اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کروانا چاہتے تھے۔

انھوں نے اس کا ترجمہ کرنے کی خواہش رضیہ سے کی۔ کام مشکل تھا۔ تحریر صاف نہیں کہیں

کوئی لفظ غائب رضیہ نے اس پر بڑی محنت کی۔ پہلے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا پھر انگریزی میں۔

یہ ترجمہ بہت پسند کیا گیا اور کتاب چھپنے پر اس کی پانچ جلدیں انھوں نے رضیہ کو ارسال کیں۔ قیمت فی کتاب پانچ سو رکھی گئی۔ یوں تو کتاب کا موضوع باغبانی ہے اچھی ہے لیکن اس میں جو ایک اہم بات تھی اس کا ذکر ضروری لگتا ہے۔ کبھی کبھی اردو اخباروں میں یہ خبر بڑی بڑی سرخیوں میں چھپتی ہے کہ ترکاریوں مثلاً آلو، ٹماٹر، انجیر میں اللہ کا نام یا ایسا ہی کوئی لفظ لکھا ہوا نکلا ہے جسے معجزہ باور کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بہت سی باتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی بتائی ہے کہ کن کن خاص پھلوں کے درختوں کی ایک خاص جڑ پر کسی لفظ کا نقش بنا دیا جائے تو اس کے کسی نہ کسی پھل میں ہو بہو وہی نقش نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا اردو مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔ لیکن اردو پڑھنے والے کتنے رہ گئے ہیں اور ان میں سے کس کو باغبانی سے کیا دل چسپی ہوگی کہ اس کتاب کو شائع کروائیں۔ اور اجازت بھی تو درکار ہوتی ہے۔ ہاں دوسری کتابیں چھپ سکتی ہیں اگر کوئی چھپوانا چاہے۔ رضیہ نے افسانے اور انشائیے بھی لکھے تھے۔ نگار آندھرا پردیش وغیرہ رسائل میں کچھ شائع بھی ہوئے وہ سوچ رہی تھیں کہ سب کو تلاش کر کے اکٹھا کرلوں اور تمام تحریروں پر نظر ثانی کر کے شائع کیا جائے مگر اس کی مہلت نہ ملی۔ شہلا نے بہت دعویٰ کیا ہے کہ سب چھپوائے گی پتہ نہیں کب۔ میری اس بہن کو نام و نمود کی خواہش کبھی نہ رہی۔ بڑی خاموشی سے اپنی زندگی اور اپنے بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی رہیں اور چل بسیں۔ یادِم نمی کنی وزیادم نمی روی

اے گل چو آمدی ندزیر زمیں گرچہ گوشہ اند

آں صورتہا کہ درتہہ زیر زمین شُد اند

رضیہ کو گئے سال بھر بھی نہ ہوا تھا کہ 6/مارچ 2002ء کو عادل بھی اُسی موذی مرض کے شکار ہو گئے۔ عادل تھے تو پنجابی۔ ان کا لاہور میں آبائی مکان تھا۔ عادل سب سے بڑے تھے ان کے

علاوہ ایک بھائی اور چار بہنیں۔ بھائی بھی لاولد رہے اور بہت جلد چلے گئے۔ عادل کی بہنوں اور سسرال والوں نے ذکیہ کو کھلے دل سے قبول کیا۔ اس کے سسر تو جب بھی بمبئی آتے اس کے پاس قیام کرتے۔ عادل کے انتقال پر دو بہنیں آئیں بھی۔ ایک بیوہ بہن کیلاش کے لڑکے یہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں وہ بہو بیٹے سے ملنے جب بھی آتی ہیں ذکیہ کے پاس ضرور قیام کرتی ہیں۔ بمبئی میں عادل ''اپٹا'' کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ Indian Peoples Theater Association اس تنظیم نے فلموں کو کئی اچھے اداکار جیسے سنجیو کمار، اے کے ہنگل صاحب، سلمہا، شوکت، کیفی وغیرہ دیے۔ سوسائٹی کی مدد کے لیے عادل نے یہاں ڈرامے کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ کوئی بیس بائیس افراد اس کام کے لیے آئے تھے۔ جن میں تین خواتین بھی تھیں ان سب کو ہم نے اپنے ہاں اوپر ہال میں ٹھہرایا تھا۔ شوکت تو اختر کے ہاں رہیں۔ بہر حال یہ ساری باتیں رخصت ہو جانے کے بعد اور بھی شدت کے ساتھ یاد آنے لگتی ہیں۔

ان ڈراموں کے ذکر پر یاد آیا۔ برس ہا برس پہلے ہم تین بہنوں نے ایک ڈرامہ گھر کے اندر کیا تھا۔ اس کو دیکھنے والوں میں، امی اور ایک خالہ زاد بہن تھیں اور ان کی ایک لڑکی، تین اداکار اور تین تماشائی۔ یہ بات تو یوں ہی یاد آ گئی البتہ اب میرے بھائیوں نے کچھ دل چسپی لینی شروع کی لیکن صرف گھر کی چار دیواری کے اندر۔ ان دنوں عظیم بیگ چغتائی کا ایک ڈرامہ ''ماسٹر کی مصیبت'' کیا تھا۔ یہ ڈرامہ بھی لوگوں کو اس قدر بھا گیا تھا کہ دو تین دفعہ دُہرایا گیا۔ ایک دفعہ اختر نے اپنے کچھ دوستوں کو دیکھنے کے لیے بلایا بھی تھا۔ میرے گھر کا دالان اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ صحن بڑا تھا لوگوں کی نشست کی اس میں اچھی گنجائش تھی۔ سوسائٹی کے شروع ہونے کے بعد مجھے جہاں تک یاد ہے۔ پریم چند کا ڈرامہ کفن ملے پلی ہاؤزنگ بورڈ کے کلب میں جو گھر کے بہت قریب تھا صرف عورتوں کے لیے کیا گیا تھا بلا ٹکٹ کے۔ ...... محلے کی عورتوں کو اس کی اطلاع دی گئی خیال تھا کہ پچاس ساٹھ عورتیں

اکٹھا ہو جائیں گی مگر یہاں تو غیر متوقع طور پر خواتین کی اتنی تعداد ہو گئی کہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔ صفیہ نے جو ابھی صفیہ اریب نہیں بنی تھیں بڑی مدد کی اور خواتین کو یہ کہہ کر سنبھال لیا کہ اتنی جگہ میں جتنی خواتین سما گئیں ہیں انھیں دکھانے کے بعد دوسرا شو آپ کے لیے ہوگا۔ چھوٹا سا ڈرامہ ہے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ یوں یہ ڈرامہ ایک رات میں دو مرتبہ کھیلا گیا۔ یہ ایک خاص بات ہوئی تھی اس کا ذکر آ گیا ورنہ سالانہ جلسوں، میٹنگوں اور ویمنس ڈے میں چھوٹے موٹے ڈرامہ ڈانس اور ٹابلوز وغیرہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ ویمنس کوآپیریٹیو ڈے، نظام کالج کے بازو ایک ہال میں منایا جاتا اس دن کو کامیاب بنانے کے لیے وہاں کے منتظمین نے کہا تو ہم نے جواب دیا کہ اگر آپ سواری کا انتظام کریں تو آپ کا ہال بھر سکتا ہے چناں چہ وہ لوگ لاری کا انتظام کر کے بھیجا کرتے اور ہمارے ہاں سے خواتین اور طالبات سو دو سو کے لگ بھگ جاتیں اور اس طرح ہال بھر جاتا۔ سوسائٹی کی طالبات اور رابعہ کی تینوں لڑکیاں دل چسپ کلچرل پروگرام پیش کرتیں جو بہت پسند بھی کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ارزینہ نے ڈانس کیا تو انوری صاحب نے پسند کیا اور دوبارہ دیکھنا چاہا۔ یہاں انوری صاحب اور دو چار بڑے عہدہ داروں کے علاوہ مردانہ بالکل نہ ہوتا تھا۔ صدارت عموماً کسی معزز خاتون کی ہوا کرتی۔ سوسائٹی کے چلتے رہنے تک ہر سال یہ تقریب ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اپنے جلسے اور مشاعرہ وغیرہ بھی ہوتے ہی رہے۔ کبھی انوار العلوم کالج کا ہال لیتے کبھی کسی اور جگہ پر۔......... ہاں البتہ 8/ مارچ کو ہمیں ''بین الاقوامی یوم خواتین' محتاط ہو کر کسی اور جگہ پر منانا پڑتا۔ کیوں کہ اس وقت اس دن کو منانا بائیں بازو کا ساتھ دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اب تو کانگریس کی جانب سے یہ دن کافی زور و شور کے ساتھ منایا جانے لگا ہے۔

جاوید کی سرپرستی کرنے والے محمود علی صاحب کے لڑکے قادر علی بیگ کو ڈراموں سے بڑا لگاؤ تھا جاوید سے وہ دو ایک سال چھوٹا ہی تھا۔ اس نے بھی ایک ڈرامہ ''بابا کالے شاہ'' کے نام سے

ہمارے ہاں کیا تھا۔ اتفاق سے اس ڈرامے کی دو ایک تصویریں میرے پاس رہ گئی ہیں۔ وہ اچھا نیک لڑکا تھا مگر بہت جلد ختم ہو گیا۔ یہ ساری باتیں بہت پہلے کی لیکن اب بس یاد باقی رہ گئی ہے۔ بہت سی دوسری یادوں کے ساتھ۔ اب گھر میں رہ ہی کون گیا تھا۔ میں اور جاوید۔ جاوید کی بیماری

جاوید کی پنشن ہوئی تو "گریجویٹی" اور پنشن کا کچھ حصہ بیچ کر کوئی دو لاکھ کے قریب نقد ملا۔ میرے بھی مکان بکنے کے بعد کی کچھ رقم، یہ سب اسنے چار مینار بینک، میں جمع کرادی۔ منافع جو زیادہ مل رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد 'بینک' کے منیجر نے خودکشی کرلی۔ اور بینک دیوالیہ!

اس پر مستزاد یہ کہ کرایہ دار صاحب اور جاوید کی بیگم کا طرزِ عمل۔ اس کی صحت پر برا اثر پڑا۔ مجھ سے تو اُس نے خود کچھ کہا نہیں۔ خود ہی کسی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لاتے رہے۔

ملکہ کی بڑی لڑکی پروین سے معلوم ہوا کہ بخار آرہا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا تو تیز بخار اور غفلت۔ میں اور پروین ساری رات پاس بیٹھے جاگتے رہے۔

ذکیہ ، بمبئی گئی ہوئی تھی۔ دوسرے دن ڈاکٹر رام پرشاد کو فون کیا۔ اتفاق سے اسی دن ذکیہ واپس آگئی۔ اسے اطلاع دی۔ وہ آکر ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ہفتہ بھر بعد حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ جاوید کو فکر یہ کہ خرچ کیسے چلے گا۔ میں نے کہا کہ "فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنے تم دے سکو، باقی کا انتظام میں کرلوں گی"۔ اس نے تین ہزار تک دینے کو کہا۔ اور پھر اس کی آنکھ کا آپریشن بھی ہونا تھا۔ ایک آنکھ کا تو ریٹینا (Retina) خراب تھا۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ڈاکٹر سے کروایا۔ بالکل ٹھیک ہوا۔ اطمینان ہوگیا۔

میرے گھر کا دوسرا حصہ جو رضیہ نے خریدا تھا اسے بیچنا تھا، مگر صرف نیچے کا وہ حصہ خریدنے کے خریدار بہت کم رقم دے رہے تھے، پھر جاوید نے اس کے اوپر کے جتنا حصہ تھا اسے بیچنے پر آمادگی ظاہر کی۔ تو پھر ایمن نے کوشش کر کے اوپر اور نیچے کا رضیہ والا حصہ اچھی قیمت پر فروخت کردیا اس

سب میں تقریباً آٹھ دس مہینے لگ گئے۔

کچھ پیسہ دوا علاج میں لگا۔ اور سب سے بڑا اطمینان یہ ہوا کہ قرضے ادا ہو گئے۔

جاوید سوائے پروین کے اپنے کسی بچے اور بیوی سے بات نہیں کرتے تھے اور اپنا کمرہ چھوڑ کر میرے کمرے میں آ گئے۔

ایمن کے کہنے پر ایک نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر چلنے پر تیار نہ ہوئے۔ تو میں پروین کو لیکر کیفیت کہہ کر دوا لائی۔

ملکہ بیگم کی بڑی لڑکی کو چھوڑ کر شبانہ، فرحانہ دونوں لڑکیوں کو بھی اسکول میں شریک کرا دیا۔ شبانہ پڑھنے میں بہت اچھی تھی، چھٹویں کلاس میں پڑھ رہی تھی کہ اس کی اماں نے اس کی شادی کر دی۔ میں نے اور جاوید نے کافی منع کیا۔ مگر بے فائدہ اب اتنی کم عمری میں وہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے۔

شبانہ سے چھوٹی فرحانہ وہ تیسری کلاس میں فیل ہوگئی۔ میں نے اردو پڑھائی اور پھر ایک اردو میڈیم اسکول میں شریک کروا دیا۔ شوق سے پڑھنے لگی۔ میٹرک پاس کر لیا اور اب آگے پڑھ رہی ہے۔ ماں اس کی بھی شادی کر دینا چاہتی تھیں مگر اس نے انکار کر دیا۔

جاوید دو لڑکوں کے بعد ایک لڑکی کے بھی باپ بن گئے۔ لیکن بیماری کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر کی دوا کھلانا بھی ایک بڑا کام تھا، کسی نہ کسی طرح وہ بھی کھلاتی رہی۔ کچھ فائدہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب ڈاکٹر نے بغیر مریض کو دیکھے دوا دینے سے انکار کر دیا۔ کسی طرح اس پر بھی تیار کیا۔ کافی فائدہ ہو رہا تھا مگر جاوید کا خیال تھا کہ دوا سے نہیں بلکہ ان کی اپنی ول پاور، Will Power سے فائدہ ہے۔ اور دوا لینا چھوڑ دی۔ لیکن چار مہینے کے بعد پھر وہی کیفیت۔ ڈاکٹر نے زیادہ "پاور" کی دوا دی۔

"بنجارا" رابعہ کے گھر جانا ہوا تو 'ارزینہ' نے ایک نوجوان حکیم صاحب کی بہت تعریف

کی۔ (تھے تو وہ یونانی حکیم، لیکن سبھی انہیں ڈاکٹر صاحب کہتے تھے) وہ بیوی اور بچی کے ساتھ رابعہ کے گھر کے دوسرے حصے میں کرایہ دار تھے۔ ارزینہ کی تعریف پر انہیں بھی دکھایا۔ انہوں نے سگریٹ چھوڑنے پر اصرار کیا۔ مگر کچھ تو جاوید کو حکیموں پر اعتقاد نہیں اور پھر سگریٹ پر پابندی۔ ان کا تو علاج حکیم صاحب (ڈاکٹر سرور خاں) سے نہ ہو سکا۔ مگر میں جو ہمیشہ نزلے زکام کی تکلیف میں مبتلا رہتی تھی۔ ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک سبھی علاج کر کے دیکھ لئے۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مجھے فائدہ ہوا تو ان ہی ڈاکٹر سرور خاں کی دوا سے۔ اور میں اس ہمیشہ کی بیماری سے نجات پا گئی۔

خیال تھا کہ جاوید کی دوسری آنکھ کا آپریشن ہو جائے تو شائد ان کی بینائی بہتر ہو جائے۔ آنکھ کے جن دوسرے ڈاکٹر سے آپریشن کا وقت ملا وہ رات کے نو بجے۔ ہمارے کرایہ دار، جاوید کے ساتھ گئے۔ آدھی رات کے بعد سنا آپریشن ہوا۔ صبح چھ بجے واپس آئے۔ جاوید کا تو کہنا تھا کہ آپریشن ان کے کسی ماتحت نے کیا۔ نتیجہ یہ کہ جس آنکھ سے بہتر دکھائی دیتا تھا، اب اس سے بھی ٹھیک نہیں دکھائی دیتا۔ بہر حال فائدے کی بجائے نقصان ہی ہوا۔

جاوید میں ایک اچھی تبدیلی یہ آئی کہ غذا ٹھیک ہونے لگی۔ شام کو باہر جا کر گھوم پھر بھی آتے۔ گرمی بہت ہو گئی تھی تو ایمن کے ساتھ جا کر کولر خرید لائے۔ بیوی بچوں سے بھی بات چیت کرنے لگے۔ نئے کپڑے بھی ایمن کے ساتھ جا کر خرید کر لائے۔

ان کی بیوی ملکہ اب تک گھر سے قریب ہی ایک کرائے کے مکان میں رہ رہی تھیں۔ اب وہ چاہ رہی تھی۔ ہمارے ہاں آ جائیں۔ میں تو پہلے بھی کئی بار کہہ چکی تھی۔ آنے کے لئے۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ضرور آ جائیں۔

''بنجارہ'' پر ذکیہ جس گھر میں تھی اسی میں اوپر کا حصہ خالی تھا۔ ایمن اور اس کے تینوں بچے کرایہ دار کے طور پر اس میں آ گئے۔ ایمن کی بیوی زرینہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کے ذکیہ کے

جاوید اقبال کے لڑکے اسلم اقبال، فیروز اقبال اور لڑکی کرن اقبال
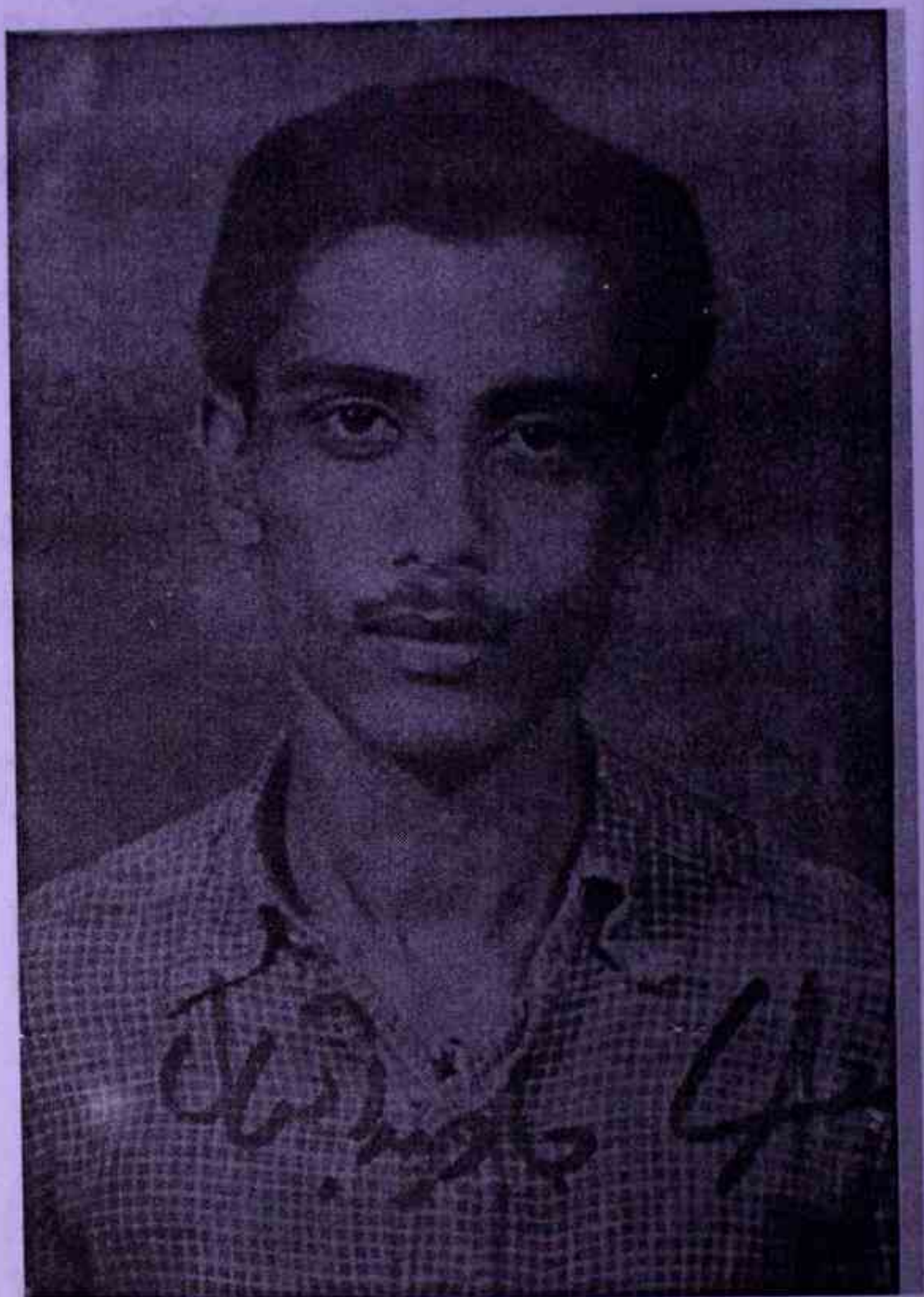
جمال النساء کے فرزند جاوید اقبال

پاس رہنے سے بڑا اطمینان ہوا۔

رابعہ اور ارزینہ کناڈا جا رہی تھیں ان سے ملاقات میں اور جاوید، ذکیہ کے گھر پر ہی تھے۔

12/اپریل2004 کی رات رابعہ وغیرہ۔ کناڈا کے لئے روانہ ہو گئیں۔ دوسرے دن میں اور جاوید بنجارہ سے واپس آئے۔ چار پانچ دن بعد جاوید نے سر درد کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر کو دکھالو۔ مگر یہ کہہ کر ٹال گئے کہ گرمی بہت ہے، اس کی وجہ سے یہ کیفیت ہے۔

25/اپریل کو رات کھانا بھی نہیں کھایا کہ بھوک نہیں ہے۔ صبح بہت سویرے آنکھ کھلی تو باہر برآمدے میں کرایہ دار صاحب سے باتوں کی آواز آئی۔ وہ صاحب نماز کو چلے گئے۔ جاوید آکر لیٹ گئے۔ چند منٹ بعد ہی خرخراہٹ کی آواز۔ اٹھ کر پکارا کوئی جواب نہیں۔ دیکھا، بائیں کروٹ سکڑا سا لیٹا ہے۔ نزدیک جا کر پوچھا "جاوید" کیا بات ہے؟ بہ مشکل اتنا سن سکی کہ "سر میں درد"۔ میں نے کہا" سیدھے ہو کر لیٹو، میں دبا دیتی ہوں"! سیدھا کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو تکیہ پسینے سے تر بتر۔ یکدم عجیب سی حالت ہو گئی۔ اٹھ کر پنکھا بند کیا۔ ورانڈے میں جا کر بیوی بچوں کو آواز دی۔ سب آ گئے۔ ذکیہ کو فون کیا کہ فوراً آؤ۔ وہ اور ایمن بھی فوراً ڈاکٹر سرور خاں کے ساتھ آ گئے۔ مگر سب بے سود۔ اس نے کسی کی بھی پروا نہیں کی اور کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر، اندھیرے کی نذر ہو گیا۔ میری دنیا ہمیشہ کے لئے اندھیری ہو چکی تھی۔ شائد میری محبت بہت منحوس ہے۔ جس کسی کو چاہا سب نے راہ عدم کی راہ لی۔

'امی' تین لڑکوں کو گنوا کر، کم از کم ان کے بچوں سے دل بہلاتی رہیں میں تو یہ بھی نہیں کر سکتی۔

مکان میں بھی جی نہیں لگتا۔ ہر سمت ماضی کی یادیں، چپہ چپہ پر کسی کے نقش قدم:

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

یہ بھی تو یقین نہیں کہ بعد مرگ ملنا ہوتا ہے۔ ورنہ شائد۔ قرب مرگ کا خیال ہی کچھ تسلی دیتا۔

حاصلِ ہر دو جہاں کچھ بھی نہیں

آخر اس زندگی کا مصرف؟ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل و دماغ ماؤف۔ نظر بے کار۔ یہ سب کیوں لکھے جا رہی ہوں؟

کچھ عرصہ قبل ایک نظم نظر سے گزری تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے لکھنے والے نے میرے ہی احساسات کو قلمبند کیا ہے۔ آپ بھی سن لیں۔

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
سمندر کی لہریں تجھے ڈھونڈتی ہیں
ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ، ماضی کا زندہ ہے
موجود میں جاگتا ہے
مگر، مرا پیکر
تہہ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
تجھے ڈھونڈتا ہے
افق تا افق، ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
فقط اک شب بے صدا جاگتی ہے
شب بے صدا پوچھتی ہے
ترا دل کہ ماتم گر رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈتا ہے؟

☆☆☆

پچھلی صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی ہر اعتبار سے اہم رہی ہے۔اس دور کو انقلابی جدوجہد، سیاسی شعور، تحریک آزادی، نسوانی بیداری سے موسوم کیا جاتا رہا ہے، سماجی ومعاشرتی طور پر بھی یہ دور خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس عہد کو نیا رنگ دینے میں کئی اذہان سرگرم رہے جن میں (باجی) جمال النساء کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے بلکہ ان کا خاندان ادب وتاریخ میں نمایاں مقام رکھتا ہے ان میں حسرت موہانی، جناب اختر حسن اور ڈاکٹر رضیہ اکبر درخشاں ہیں۔

جمال النساء نے بائیں بازو کی سیاست وتحریکوں میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔قاضی عبدالغفار اور مخدوم محی الدین سے ان کے مراسم رہے، ان کا گھر سیاست وادب کا مرکز بھی رہا۔جمال النساء نے خواتین کی بہبود کے لئے بھی ایک غیر سرکاری ادارہ قائم کیا جہاں خواتین کے سماجی وسیاسی شعور کو بیدار کرنے کے علاوہ انہیں خودمختار زندگی کا ہنر بھی ملا۔

بکھری یادیں اس دور کی مکمل عکاسی کرتی ہیں، شخصی یادوں کا کینوس پھیل کر اس دور کی سماجی وسیاسی زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

ادب میں Oral History کو جو اہمیت دی جارہی ہے اس کا اندازہ اس کتاب سے ہوسکتا ہے۔

مظہر مہدی